بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ

اکرمُ التّفاسیر

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ

الشیخ مولانا امیر محمد اکرم اعوان مدظلہ العالی

17

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ

اکرم التفاسیر

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ

الشیخ مولانا امیر محمد اکرم اعوان مدظلہ العالی

17

از دلِ خیزد بر دلِ ریزد

اکثر احباب سوچتے ہوں گے اسرارالتنزیل کے ہوتے ہوئے اکرم التفاسیر کے لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس بارے میں عرض کردوں کہ نہ تو خود ثنائی کی پہلے کوئی تمنا تھی نہ اب ہے اور نہ ان شاء اللہ آئندہ ہوگی۔ نہ ہی یہ خیال دل میں آیا کہ مجھے کوئی بڑا عالم یا مفتی یا مفسرِ قرآن کہے نہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر کبھی اپنا وقت قربان کیا۔ ہاں! یہ خواہش ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم اور استاد المکرم حضرت مولانا اللہ یار خان رحمۃ اللہ علیہ صاحب کی خصوصی توجہ سے جو علوم و معارف عطا فرمائے انہیں اللہ تعالیٰ کی مخلوق تک پہنچاؤں اور اپنا فریضہ ادا کروں۔

ایک اور بات جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو اپنے وقتِ نزول سے تا حال اور آئندہ تا قیامت بلکہ اس سے بھی آگے حساب وکتاب' جنت ودوزخ کی بات کرتا ہے اور تمام انسانیت کو راہنمائی اور ہدایت فراہم کرتا آیا ہے اور ان شاء اللہ کرتا رہے گا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں' قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے اب اس کے بعد نہ کوئی نبی آئے گا اور نہ رسول اور نہ ہی کوئی کتاب یا صحیفہ اس لیے کہ تمام مخلوق کے مسائل کا حل اس میں موجود ہے۔ ہر زمانے کے لوگ اپنے اپنے حالات کے مطابق استفادہ کرتے آئے ہیں' آئندہ بھی کرتے رہیں گے اور یہ خصوصیت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے کلام ہی کی ہو سکتی ہے۔ پہلے وقتوں میں آج کی طرح نقل وحمل و رسل و رسائل کے مواقع اتنے نہیں تھے اس لیے ایک سے دوسری جگہ علوم وایجادات پہنچنے میں سالہا سال لگ جاتے تھے۔

زمانہ حال کی جدید ایجادات اور خصوصاً الیکٹرانک ایجادات نے تو پوری دنیا کو ایک گھر کی صورت میں یکجا کر دیا یعنی Global Village اور سالوں کی مسافت سمٹ کر سیکنڈ کے ہزارویں حصہ تک آگئی ہے اس لیے زمانے اور وقت کی رفتار بھی اتنی ہی تیزی سے تبدیل ہو

رہی ہے۔ آنے والے وقتوں میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوں گی، ان کو دیکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی پر ایمان لانے والوں میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ خصوصاً جدید علوم کے ماہرین اور سائنسدانوں کی کثیر تعداد اسلام کی حقانیت کا اعتراف کرتے ہوئے دائرہ اسلام میں داخل ہو رہی ہے اور یورپ میں تو بہت ہی اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔

بات کہاں سے کہاں تک چلی گئی! بات تو ہو رہی تھی اسرار التنزیل کے ہوتے ہوئے اکرم التفاسیر کے منظر عام پر آنے کی لہٰذا اسرار التنزیل کی اپنی ایک افادیت ہے۔ یہ 1971ء کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا اللہ یار خان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی معیت میں اپنے گھر کی حاضری کا شرف بخشا جس میں ساتھیوں کی کثیر تعداد بھی مقامِ ملتزم پر حاضر تھی۔ جس دربار سے کوئی خالی ہاتھ نہیں لوٹا' عطا و کرم کی اس بارش میں اہلِ بصیرت نے دیکھا کہ فہمِ قرآن کا پیغام قلب پر وجدان کی صورت میں نازل ہوا۔ اسی پیغام کو اہل دل کی امانت سمجھتے ہوئے سپردِ قلم کر دیا کہ شاید اپنے اہل تک پہنچ جائے۔

اسرار التنزیل کا انداز عام فہم اور اجمالی ہے جبکہ اکرم التفاسیر میں حالاتِ حاضرہ کے مطابق ذرا بحث کو وسیع کیا گیا ہے۔ یہ بات اہلِ علم پر عیاں ہے اور پڑھنے والوں کے لیے رشد و ہدایت کا موجب بنے گی۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے' نجاتِ اخروی کا سبب بنائے اور رضائے الٰہی نصیب فرمائے (آمین)

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

مولانا محمد اکرم اعوان
شیخ سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ
دارالعرفان منارہ ضلع چکوال

امیر المکرم بحیثیت مفکرِ قرآن

یہ اعجازِ قرآن ہے کہ بدلتے ہوئے حالات و واقعات اور علوم میں ارتقاء کے باعث مفسرینِ کرام قرآنی علوم کی وہ جہتیں بھی آشکار کر رہے ہیں جو پہلے مفسرین کی نگاہوں سے اوجھل رہیں۔ اگر یہ قرآن و حدیث کی معین کردہ حدود کے اندر اور اللہ کے دین اور شریعت کے مزاج سے ہم آہنگ ہیں تو یہ بھی آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم کا ہی پرتو ہے جو بطور علم لدُنّی ان علمائے ربانی کو عطا ہوئے۔ امیر المکرم کے خطابات سے ماخوذ اکرم التفاسیر بھی فی زمانہ حالات و واقعات اور علوم جدیدہ کا احاطہ کرتے ہوئے علم لدُنّی کی ایسی روشن مثال ہے جس میں نہ صرف علوم مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کی ضیاء نظر آتی ہے بلکہ برکاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم قلوب کو تحریک بخشتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

قرآن کے مضامین میں اس قدر وسعت اور تنوع ہے کہ ان کی کسی فہرست کو حتمی قرار دینا ممکن ہی نہیں لیکن قرآن حکیم کا ہر مضمون ایک نظریہ اور فکر کی بات کرتا ہے۔ امیر المکرم سے یہ سوال کیا گیا کہ کیا وجہ ہے کہ قران میں کثرت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا تذکرہ نظر آتا ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ موسیٰ اور فرعون ہر زمانہ ٔ ہر دور اور ہر معاشرے کے دو مرکزی کردار بھی ہیں جن کے مابین حق و باطل کا معرکہ مسلسل بپا ہے اور قرآن میں جا بجا حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے حوالے سے حق و باطل کے اسی معرکے کا تذکرہ ہے۔ حق و باطل کا یہی معرکہ قرآن کا مرکزی مضمون ہے۔ گرانقدر علمی مباحث قرآن کی معروف تفاسیر کی زینت تو نظر آتے ہیں لیکن قرآن کے اس مرکزی مضمون یا بالفاظ دیگر ''فکرِ قرآنی'' پر بہت کم بات کی گئی۔

دشمنانِ اسلام آج کھل کر قرآن کی مخالفت پر تل گئے اور اس کے پیغام کو دبانے کے

لیے اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے ہیں لیکن کیا وہ قرآن کے عائلی قوانین سے خائف ہیں، قانون وراثت سے پریشان ہیں، جنت ودوزخ یا ثواب وعذاب سے گھبرا رہے ہیں؟ نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کفار کا تو ان پر ایمان ہی نہیں۔ آج ساری کی ساری طاغوتی قوتیں اس قرآنی فکر سے لرزہ براندام ہیں جو دائمی غلبہ حق کی نوید دیتی ہے اور امیر المکرم اسی قرآنی فکر کے نقیب ہیں۔ اکرم التفاسیر میں آپ نے اسی فکرِ قرآنی کو اجاگر کیا ہے' جو اس تفسیر کا طرہ امتیاز ہے۔

امیر المکرم کفار کے لیے اللہ تعالیٰ کے اٹل قانون قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ کی روشنی میں طاغوتی قوتوں کو آگاہ کرتے ہیں کہ تمہارے لیے دائمی شکست کا فیصلہ فرما دیا گیا ہے اور ذلت ورسوائی تمہارا مقدر ہے۔ غلبۂ حق کو روکنا اب تمہارے بس کی بات نہیں۔ اپنے خطابات میں آپ بکھری ہوئی ملت کو دعوت دیتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ آؤ پھر کسی یکتائی سے عہد غلامی کرلو۔ تمہاری ذمہ داری کوئی ایک معاشرہ، قوم یا ملک نہیں بلکہ پوری انسانیت ہے۔ قرآن نے انقلاب دشمن سازشوں سے آگاہ کرتے ہوئے یہود کی طویل فردِ جرم بیان کی ہے جس میں انبیاء علیہم السلام سمیت اہلِ حق کے قتل کے جرائم بھی ہیں۔ امیر المکرم نے قرآنی فرمودات کی روشنی میں عالمی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے عصرِ حاضر میں یہود کے سازشی کردار کو اس طرح بے نقاب کیا ہے کہ صیہونیت صرف عالمِ اسلام ہی کی نہیں بلکہ پوری انسانیت کی دشمن نظر آتی ہے۔

یہ دور اسی فکرِ قرآنی کی پہچان کا دور ہے اور امیر المکرم نے بھرپور انداز میں اسے اجاگر کیا ہے۔ کفر اپنے لیے اس خطرے کو اس حد تک پہچان چکا ہے کہ عملی اقدام پر اتر آیا ہے لیکن حضرت امیر المکرم قرآن کی روشنی میں حالات و واقعات کا تجزیہ کرتے ہوئے غزوۃ الہند کی نوید دے رہے ہیں۔ آپ سورۃ آل عمران کی آیت نمبر 12 کے ضمن میں فرماتے ہیں:

''کفار کے لیے یہ آیۂ کریمہ قیامت تک کے لیے نوید شکست ہے اور میں بڑی بے باکی سے کہتا ہوں، پورے یقین، پورے ایمان سے منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بیٹھ کر کہہ رہا ہوں کہ دنیا کی کافر سپر طاقتیں پھر شکست سے دوچار ہوں گی اور ان شاء اللہ پھر غلبۂ اسلام ہوگا۔''

چونکہ تفسیر کا انداز بیانیہ ہے، تو امیر المکرم کے زوردار اندازِ بیان میں فکرِ قرآنی جب قاری تک پہنچتی ہے تو اس کے دل میں ایک تحریک بپا کر دیتی ہے، یہاں تک کہ اسے آنے والے انقلاب کی چاپ سنائی دینے لگتی ہے۔

امیر المکرم نے فکرِ قرآنی کی بات کرتے ہوئے امت میں ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت پھیلائی گئی اس غلط فہمی کو بھی دور کرنے کی کوشش کی ہے کہ حالات کو بدلنے کے لیے کسی امام مہدی کا انتظار کیا جائے۔ یہ موہوم امید افیون سے کم نہیں جس نے امت کو سلا دیا کہ اب کفر سے نبٹنا ہمارے بس کی بات نہیں اور یہ کام امام مہدی ہی کریں گے۔ حضرت کے خطبات بے عملی کی اس کیفیت سے بیداری کا پیغام ہیں کہ اُمت پہ ابھی بے بسی کا دور نہیں آیا۔ ہر فرد ملت کے مقدر کا ستارہ ہے اور ہر فرد کو امام مہدی کا کردار ادا کرنا ہوگا۔ امیر المکرم امام مہدی کی آمد کی بجائے غلبۂ حق کو بہت قریب دیکھ رہے ہیں۔ یہی قرآنی فکر ہے جو ہر عہد میں حق و باطل کے معرکے کو مہمیز کرتی ہے، جو ہر دور میں خونِ مسلم کو گرم اور اُمتِ مسلمہ کو متحرک رکھتی ہے۔

امیر المکرم نے اکرم التفاسیر میں یہ فکر اس قدر نمایاں طور پر پیش کی ہے کہ وہ مفسرِ قرآن سے آگے مفکرِ قران نظر آتے ہیں اور یاد رہے! ہر انقلاب کے پیچھے کوئی مفکر ہوتا ہے۔

چھ جلدوں پر محیط تفسیر ''اسرار التنزیل'' کے حوالے سے امیر المکرم کی پہچان بطور مفسرِ قرآن تو مسلمہ ہے لیکن اب ''اکرم التفاسیر'' کی صورت آپ نے جس طرح قرآنی فکر کو اجاگر کیا ہے، آپ کا تعارف بطور ''مفکرِ قرآن'' حاوی نظر آتا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مفکرِ قرآن امیر المکرم کو صحت اور عمر دراز عطا فرمائے کہ یہ بیانیہ تفسیر نہ صرف مکمل ہو بلکہ آپ انقلاب بپا ہوتا ہوا بھی دیکھیں۔

ابوالاحمدین

ابوالاحمدین

فہرست مندرجات

نمبر شمار	مندرجات	صفحہ نمبر
1	سورۃ الانبیآء رکوع 1 آیات 1 تا10	15
2	تفسیر ومعارف	16
3	انسانوں کا حال:	17
4	اللہ کریم نے انسانیت کو ہدایت سے ہر دور میں نوازا:	18
5	دنیا کے امور کب کھیل تماشا بنتے ہیں؟	18
6	انسان دنیا میں کیوں کھو جاتا ہے؟	20
7	جدید سائنسی تحقیق:	21
8	قلب کی غفلت کا نتیجہ:	21
9	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو روکنے کے لیے اہل مکہ کی تدبیریں:	21
10	مسلمانی وہ جسے کافر بھی مانے:	22
11	اللہ کریم سننے اور جاننے والے ہیں:	23
12	جدید سائنسی تحقیق:	24
13	عظمتِ رسالت علیہ الصلوٰۃ والسلام اور کفار کا رویہ:	24
14	مسلمانوں کا رویہ:	25
15	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس خود معجزہ ہے:	25
16	منہ مانگا معجزہ ظاہر نہ کرنا بھی رحمتِ الٰہی ہے:	26
17	نبوت صرف مردوں کو عطا ہوئی:	27
18	عورت امام نہیں ہو سکتی:	27
19	جاہل پر عالم کی تقلید واجب ہے:	28
20	مقلد اور غیر مقلد:	28
21	انبیاؑ اور بشریت کے تقاضے:	29
22	نبیؑ کی پیروی میں ہی نجات ہے:	29
23	اسراف میں ہلاکت ہے:	29
24	قرآن حکیم ہر انسان کے لیے اللہ کا پیغام ہے:	30
25	عقلمندی کا تقاضا:	30
26	سورۃ الانبیآء رکوع 2 آیات 11 تا29	32
27	تفسیر ومعارف	34
28	ظلم تباہی کا سبب ہے:	34
29	عذاب سے بچنے کا واحد راستہ اطاعتِ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام ہے:	35
30	کائنات کی تخلیق بلا مقصد نہیں:	36
31	اللہ کی شان بہت بلند ہے:	37
32	مِٹنا باطل کا مقدر ہے:	38
33	قربِ الٰہی پانے والوں کا حال:	38
34	اللہ ہی معبودِ برحق ہے:	39
35	نظام کائنات اللہ کی توحید پر گواہ ہے:	39
36	اللہ پر کوئی سوال نہیں کر سکتا:	40
37	مخلوق اپنی جوابدہی کی فکر کرے:	41
38	شرک کرنے والوں سے ایک سوال:	41
39	گمراہی کا سبب:	42
40	فروعات میں اختلاف اور فرقہ بندی:	42
41	جائے عبرت ہے!	43
42	تکمیل نبوت پر ایک دلیل:	44
43	ایک ضمنی بات:	45
44	اللہ کی ذات بہت پاک ہے:	45
45	امرِ محال:	47
46	فقہاء کی وضاحت:	47
47	سورۃ الانبیآء رکوع 3 آیات 30 تا41	48
48	تفسیر ومعارف	50
49	نظام کائنات کی ابتدا:	50
50	حیات کا دارومدار پانی پر رکھا:	50
51	اللہ کی عظمت پر دلیل ہے:	50
52	پہاڑ اور راستے:	51

نمبر شمار	مندرجات	صفحہ نمبر
53	آسمان ایک مضبوط چھت:	52
54	قدرتِ باری کا ترتیب کردہ نظام:	52
55	فلکی نظام:	53
56	عہدِ حاضر کے نجومی اور اُن کے دعوے:	54
57	مسائل کا اصل حل:	55
58	موت کا مزہ ہر متنفس کو چکھنا ہے:	55
59	شہدا کا حال:	56
60	موت فنا کا نام نہیں:	57
61	عقیدہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم:	59
62	مکان کی عظمت مکین سے ہوتی ہے:	59
63	کافرانہ سوچ:	59
64	آزمائش دنیا:	60
65	عظمتِ صحابہؓ کی دلیل ایک تاریخی واقعہ:	60
66	عظمتِ رسالت سے نا آشنائی کا نتیجہ:	62
67	انسانی فطرت میں جلد بازی ہے:	63
68	علمِ نجوم، دست شناسی، چہرہ شناسی:	64
69	مہلت کو غنیمت جانو:	65
70	جہالت کے کرشمے:	65
71	کاش کافر آج سمجھ لیں:!	66
72	دنیا آخرت کا پرتو ہے:	66
73	قیامت اچانک آئے گی:	67
74	قیامت آئے گی تو کوئی روک نہیں سکے گا:	67
75	کفر کا وطیرہ:	68
76	سورۃ الانبیآء رکوع 4 آیات 42 تا 50	69
77	تفسیر ومعارف	70
78	اللہ کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں:	70
79	اللہ کی کرم نوازی:	72
80	اسلام پھیلتا ہے رکتا نہیں:	72
81	فنا فی اللہ:	73
82	مسلمانوں کا حقیقی سرمایہ:	73
83	عہدِ حاضر کا عالمِ اسلام:	74
84	وحی کو سنی سنائی بات نہ سمجھو:	75
85	عذابِ الٰہی کفار کو پچھتاوے اور حسرت میں مبتلا کردے گا:	76
86	قیامت کا دن، انصاف کا دن ہے:	76
87	کلام الٰہی کی عظمت:	78
88	کتاب اللہ سے نصیحت اہلِ تقویٰ کو نصیب ہوتی ہے:	78
89	قرآنِ کریم کی عظمت:	80
90	سورۃ الانبیآء رکوع 5 آیات 51 تا 75	83
91	تفسیر ومعارف	86
92	دینے والی ذات اللہ کریم کی ہے لینے کے لیے خلوص شرط ہے:	86
93	خلوص انسان کا فیصلہ ہے:	86
94	خلوص کی نشانی:	87
95	تذکرۂ ابراہیم علیہ السلام:	87
96	کفر ہمیشہ تضادات کا مجموعہ ہوتا ہے:	88
97	حق ہمیشہ واضح ہوتا ہے:	88
98	گمراہ لوگوں کا جواب ایک ہی ہوتا ہے:	88
99	قرآن ہر فرد سے مخاطب ہے:	88
100	حق کے ثبوت کے لیے نبیؑ کی گواہی کافی ہے:	91
101	ایک مثال:	91
102	ابراہیم علیہ السلام کی تدبیر:	92
103	ابراہیم علیہ السلام کا جواب ایک دلیل تھا:	93
104	ظاہری وباطنی نعمتیں:	97
105	نیکوں کی صحبت نجات کا سبب:	97
106	اللہ کے مقربین کی ناقدری، بہت بڑی بدنصیبی:	98
107	انعاماتِ الٰہی:	98
108	ایک لطیف نکتہ:	99
109	لوط علیہ السلام کا ذکرِ خیر:	101
110	بحوالہ تفسیر روح المعانی:	101
111	پریشانیاں دور کرنے کا قیمتی نسخہ:	102

نمبر شمار	مندرجات	صفحہ نمبر
112	سورۃ الانبیآء رکوع 6 آیات 76 تا 93	103
113	تفسیر و معارف	106
114	گروہِ انبیا علیہم السلام کا ذکرِ خیر:	106
115	نوح علیہ السلام کی بددعا آنے والی انسانیت کی بقاء کے لیے تھی:	106
116	آل اور اہلِ بیت میں فرق:	107
117	حکمتِ الٰہی:	109
118	داؤد علیہ السلام کی تخصیص:	110
119	جدید ٹیکنالوجی حاصل کرنا سنتِ انبیا ہے:	111
120	شکر کا طریقہ:	112
121	تذکرہ سلیمان علیہ السلام:	112
122	ایوب علیہ السلام کا ذکرِ خیر:	114
123	عبادت کرنے والوں کے لیے نصیحت:	115
124	اہمیت شیخ:	117
125	انبیا علیہم السلام مثالی ہستیاں:	117
126	یونس علیہ السلام کا ذکرِ خیر:	117
127	یونس علیہ السلام کا اجتہاد:	118
128	تمام انبیا علیہم السلام معصوم عن الخطا ہوتے ہیں:	118
129	انبیاؑ کے وجود ہمیشہ سلامت رہتے ہیں:	119
130	زکریا علیہ السلام کی دعا:	119
131	ایمان، اُمید اور خوف کے درمیان ہے:	120
132	خشوع یا عاجزی کیا ہے؟	120
133	پاکباز بی بی والدۂ عیسیٰ علیہ السلام کی پاکبازی کی تعریف:	121
134	کیا شادی نہ کرنا کمال ہے؟	121
135	ایک لطیف نکتہ:	122
136	ہر نبیؑ اپنے عہد کی باکمال ہستی ہوتا ہے:	122
137	دین میں اختلاف کی بنیادی وجہ:	123
138	سورۃ الانبیآء رکوع 7 آیات 94 تا 112	125
139	تفسیر و معارف	127
140	صاحبِ ایمان ہونے کی شرط:	127
141	یاجوج ماجوج:	128
142	مشرکین کا اعتراض:	130
143	ایک بلیغ بات:	132
144	عہدِ حاضر کے مسلمانوں کا روّیہ:	132
145	اللہ کا کرم بے کراں ہے:	133
146	رحمتِ الٰہی صرف رحمۃ العالمین سے وابستہ ہے:	134
147	عبادت کیا ہے؟	137
148	حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا پیغام پہنچانے والے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے قاصد ہیں:	139
149	سورۃ الحج رکوع 1 آیات 1 تا 10	141
150	تفسیر و معارف	143
151	دورِ حاضر کی پستی:	144
152	زلزلہ قیامت:	144
153	صحبت کے اثرات:	145
154	قدرتِ کاملہ کے مظاہر، حصولِ ہدایت کے دلائل:	146
155	تکبر کا انجام:	147
156	سورۃ الحج رکوع 2 آیات 11 تا 22	150
157	تفسیر و معارف	152
158	مشروط عبادت دوعالم کا خسارہ:	152
159	انتہا درجے کی گمراہی:	154
160	بدترین خلائق:	155
161	اہلِ ایمان کے لیے بشارت:	155
162	منکرین کا اسلام کے خلاف غصہ اور اس کا نتیجہ:	157
163	مقامِ فکر:	157
164	مومنین کے حق پر ہونے اور کفار کے گروہوں کا ذکر:	159
165	سجدہ سے مراد:	159
166	مسلمان ایک قوم ہے، کافر ایک الگ قوم ہے:	161
167	سارے فرقے اسلام سے باہر ہیں:	161
168	مومن اور کافر میں اصل جھگڑا اللہ کی ربوبیت کا ہے:	162
169	آج کے کلمہ گو:	163
170	سورۃ الحج رکوع 3 آیات 23 تا 25	166

نمبر شمار	مندرجات	صفحہ نمبر
171	تفسیر و معارف	166
172	ابن خلدون کی تحقیق:	168
173	کافر قولاً فعلاً، عملاً اللہ کی راہ سے روکتا ہے:	168
174	بیت اللہ کی عظمت کے خلاف کام عذابِ الیم کا سبب ہے:	169
175	سورۃ الحج رکوع 4 آیات 26 تا 33	170
176	تفسیر و معارف	171
177	بیت اللہ شریف:	171
178	طواف سے متعلق ایک مسئلہ:	173
179	ابراہیم علیہ السلام، اللہ کے عظیم پیغمبرؑ:	174
180	دل کی طہارت کا بھی اہتمام کرو:	175
181	اللہ کریم نے آواز پہنچادی:	176
182	حقیقی فائدہ:	177
183	ایک فقہی مسئلہ:	177
184	حج اور ذکر اللہ:	178
185	تاکید مکرر:	178
186	رخصت اور عزیمت دونوں پر عمل ضروری ہے:	180
187	احکام شرعی کا احترام اللہ کے ہاں پسندیدہ ہے:	181
188	بدعت گمراہی ہے:	181
189	حِلّت و حرمت:	182
190	ایک ضمنی بات:	182
191	'اجتناب' کی حقیقت:	183
192	شرک سے بچو:	184
193	شرک کا وبال:	184
194	توحید کیا ہے؟	185
195	شعائر اللہ کا احترام:	185
196	قربانی کے جانور:	186
197	سورۃ الحج رکوع 5 آیات 34 تا 38	188
198	تفسیر و معارف	189
199	قربانی، ایک مستقل عبادت:	189
200	قربانی اور آج کے نام نہاد دانشور:	191
201	اللہ واحد ہے احد ہے:	192
202	عاجزی کرنے والے:	192
203	دل ہی عظمتِ الٰہی کو پاسکتا ہے؟	193
204	اقامتِ صلوٰۃ:	195
205	ایک واقعہ:	195
206	انفاق:	196
207	قربانی کے جانور عظمتِ الٰہی کی نشانیاں:	196
208	قربانی کا گوشت:	197
209	مقام شکر:	197
210	کیفیاتِ قلبی مطلوب ہیں:	199
211	ہدایت ' احسانِ عظیم ہے:	200
212	محسنین کے لیے بشارت:	201
213	اللہ مومنین کی حفاظت فرماتے ہیں:	201
214	تاریخ اسلام کا درخشاں باب:	203
215	سورۃ الحج رکوع 6 آیات 39 تا 48	205
216	تفسیر و معارف	207
217	اسلام نے ہمیشہ دفاعی جنگ لڑی ہے:	207
218	حقیقی انقلاب:	208
219	ایک تاریخی جھوٹ:	210
220	مسلمانوں کو ہجرت پر کیوں مجبور کیا گیا؟	210
221	اللہ کا اپنا نظام:	211
222	نصرت الٰہی کے حقدار:	213
223	نصرت الٰہی اور آج کے مسلمان:	215
224	نصرت الٰہی پانے والوں کے اندازِ حکمرانی:	215
225	وطنِ عزیز کا حال:	217
226	تکذیب کیا ہے؟	218
227	حُبّ دنیا:	220
228	دنیا آخرت کا پرتو ہے:	221
229	ظالموں کا انجام:	221
230	دل کی عقل:	223

نمبرشمار	مندرجات	صفحہ نمبر
231	دل کی سماعت و بصارت:	224
232	ایک عجیب مطالبہ:	225
233	زمین پر ہزار برس، آسمان پر ایک دن کے برابر:	226
234	سورۃ الحج آیت رکوع 7 آیات 49 تا 57	228
235	تفسیر و معارف	229
236	ایمان کیا ہے؟	230
237	اللہ کریم کا وعدہ:	232
238	حاصلِ کلام:	233
239	رسول اور نبی علیہ السلام:	233
240	شیطان کی مداخلت اور حفاظتِ الٰہیہ:	234
241	حکمتِ الٰہی کا تقاضا:	235
242	دلوں کی بیماری کا اصل سبب:	236
243	مومن کا قلب کیفیات حاصل کرتا ہے:	239
244	ایمان کا معیار:	240
245	بزرگوں سے تعلق کا زعم:	240
246	کفار کی روش:	241
247	حقیقی بادشاہت:	242
248	سورۃ الحج رکوع 8 آیات 58 تا 64	244
249	تفسیر و معارف	245
250	ہجرت کیا ہے؟	245
251	ہجرت پر بہترین انعامات:	246
252	اللہ کریم کی شانِ حلیمی:	248
253	ایک طے شدہ نظام:	248
254	جنگ اور جہاد میں فرق:	249
255	شب و روز کا نظام:	250
256	نظام کائنات اللہ کے حکم پر چلتا ہے:	251
257	زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے:	253
258	سورۃ الحج رکوع 9 آیات 65 تا 72	255
259	تفسیر و معارف	256
260	زمین پر جو ہے سب انسان کی خدمت کے لیے ہے:	256
261	اللہ کی رحمت کا احاطہ ناممکن ہے:	257

نمبرشمار	مندرجات	صفحہ نمبر
262	زندگی اور موت اللہ کی عطا ہے:	258
263	عظمتِ الٰہی کا ادراک نہ کرنا ناشکری ہے:	258
264	مقصدِ حیات:	259
265	شریعت، احکام و اخبار کا مجموعہ:	259
266	بعثتِ عالی انسانیت کی بلوغت پر ہوئی:	260
267	معترضین کی پروا نہ کریں:	261
268	ایک لطیف نکتہ:	261
269	صراطِ مستقیم:	261
270	بحث کرنے والوں کو سادہ سا جواب:	262
271	اللہ کا علم ساری کائنات کو محیط ہے:	263
272	دین و دنیا کے علوم کے حصول کی دعوت:	264
273	عہدِ حاضر کا المیہ:	265
274	غیر اللہ کی عبادت نری جہالت ہے:	265
275	برائی کا ایک عجیب وبال:	266
276	کفار و منکرین کا انجام:	267
277	ایمان کے دو جز اور انکار کے دو انداز:	267
278	سورۃ الحج رکوع 10 آیات 73 تا 78	269
279	تفسیر و معارف	270
280	غیر اللہ کی پوجا کیوں کی جاتی ہے؟	272
281	اللہ کی عظمت کسی کے ماننے کی محتاج نہیں:	272
282	اللہ کریم کسی کے مشورے کے محتاج نہیں:	273
283	اللہ کا علم حضوری ہے:	274
284	تمام امور اللہ کی بارگاہ کی طرف رجوع کرتے ہیں:	275
285	کرنے کے کام:	275
286	اللہ کی راہ میں مجاہدہ کرو:	278
287	اسلام دینِ فطرت ہے لہٰذا آسان ہے:	279
288	اللہ کریم کا احسان:	280
289	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی گواہی:	280
290	اُمتِ محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان:	280
291	اس نعمت کا حق کیسے ادا ہو؟	281
292	بہترین دوست اور مددگار:	282

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ط
اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ (البقرہ:32)

مَوْلَایَ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا
عَلٰی حَبِیْبِكَ مَنْ زَانَتْ بِهِ الْعُصُرُوْا

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى حَبِيْبِهٖ

مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

پارہ 17 اقترب للناس

سورۃ الانبیاء رکوع 1 آیات 1 تا 10

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِیْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۱ مَا یَاْتِیْهِمْ مِّنْ
ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ یَلْعَبُوْنَ ۲ لَاهِیَةً قُلُوْبُهُمْ ط
وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ۗ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ۗ هَلْ هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ
السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ۳ قٰلَ رَبِّیْ یَعْلَمُ الْقَوْلَ فِی السَّمَآءِ
وَالْاَرْضِ ۫ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۴ بَلْ قَالُوْۤا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ بَلِ
افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۚ فَلْیَاْتِنَا بِاٰیَةٍ كَمَاۤ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ۵ مَاۤ اٰمَنَتْ
قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْیَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ۚ اَفَهُمْ یُؤْمِنُوْنَ ۶ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا
رِجَالًا نُّوْحِیْۤ اِلَیْهِمْ فَسْـَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۷ وَمَا
جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا یَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِیْنَ ۸ ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ
الْوَعْدَ فَاَنْجَیْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَآءُ وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِیْنَ ۹ لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكُمْ
كِتٰبًا فِیْهِ ذِكْرُكُمْ ط اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۱۰

لوگوں کے لیے اُن کا (وقتِ) حساب نزدیک آپہنچا ہے اور وہ غفلت میں پڑے

(اس سے) منہ پھیر رہے ہیں ﴿۱﴾ اُن کے پاس اُن کے پروردگار کی طرف سے جو تازہ نصیحت (اُن کے حسبِ حال) آتی ہے تو یہ اُسے ایسے سنتے ہیں گویا مذاق اڑاتے ہیں ﴿۲﴾ اُن کے دل غفلت میں پڑے ہیں اور ان ظالموں نے (آپس میں) سرگوشیاں کیں کہ یہ (پیغمبر) تمہاری ہی طرح ایک (عام) آدمی ہیں تو تم دیکھتی آنکھوں جادو کی لپیٹ میں کیوں آتے ہو؟ ﴿۳﴾ (پیغمبر نے) فرمایا میرا پروردگار ہر بات کو جانتا ہے (خواہ) آسمان میں ہو اور (خواہ) زمین میں اور وہ خوب سننے والا جاننے والا ہے ﴿۴﴾ بلکہ (یہ کفاریوں) کہتے ہیں کہ (یہ قرآن) پریشان خیالات ہیں بلکہ انہوں نے یہ (اپنی طرف سے) گھڑ لیا ہے، (نہیں) بلکہ یہ شاعر ہیں پس چاہیے کہ ہمارے پاس کوئی نشانی (معجزہ) لے آئیں جیسے پہلے پیغمبر (نشانیاں دے کر) بھیجے گئے تھے ﴿۵﴾ ان سے پہلے کوئی بستی والے جن کو ہم نے ہلاک کیا ایمان نہیں لائے تو کیا یہ ایمان لائیں گے؟ ﴿۶﴾ اور ہم نے آپ سے پہلے صرف آدمیوں کو ہی پیغمبر بنا کر بھیجا تھا جن کے پاس ہم وحی بھیجا کرتے تھے۔ (انکار کرنے والو!) سو اگر تم کو یہ بات معلوم نہ ہو تو جو یاد رکھتے ہیں ان (اہلِ کتاب) سے پوچھ لو ﴿۷﴾ اور ہم نے ان (انبیاؑ) کے ایسے بدن نہیں بنائے تھے کہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور وہ (حضرات بھی) ہمیشہ رہنے والے نہ ہوئے ﴿۸﴾ پھر ہم نے اُن سے جو وعدہ فرمایا تھا وہ سچ کر دکھایا تو ان کو اور جس کو ہم نے چاہا نجات بخشی اور ہم نے حد سے نکل جانے والوں کو ہلاک کر دیا ﴿۹﴾ یقیناً ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب بھیجی ہے جس میں تمہارے لیے نصیحت ہے سو کیا تم نہیں سمجھتے ﴿۱۰﴾

تفسیر و معارف

الحمدللہ سورۃ الانبیاؑ سے سترھواں پارہ شروع ہوتا ہے۔ سورۃ الانبیاؑ مکی سورتوں میں سے ہے اور سورۃ طٰہٰ میں جو سبق دیا جا رہا تھا یہاں اسی کا تسلسل ہے۔

سورۃ طٰہٰ میں یہ ارشاد ہوا تھا کہ لوگ محشر میں اللہ سے شکوہ کریں گے کہ اگر اُن کی راہنمائی کے لیے اللہ نے کسی نبیؐ کو بھیجا ہوتا تو وہ ضرور اللہ کی توحید پر ایمان لاتے اور اللہ کی اطاعت اور عبادت کرتے مگر ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب رسولؐ آجاتے ہیں تو یہ مذاق اڑاتے ہیں، بات نہیں سنتے۔ اسی تسلسل میں بات آگے چل رہی ہے۔

انسانوں کا حال:

فرمایا: اِقۡتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمۡ وَهُمۡ فِیۡ غَفۡلَةٍ مُّعۡرِضُوۡنَ ۚ﴿۱﴾ انسانوں کے حساب کتاب کا وقت آپہنچا ہے یعنی بہت قریب ہے اور اُن کا یہ عالم ہے کہ وہ غفلت میں پڑے اس سے منہ پھیر رہے ہیں۔ اللہ کریم کا علم حضوری ہے، اس میں ماضی حال یا مستقبل نہیں ہے بلکہ ہر چیز اللہ کے علم میں حاضر ہے۔ اللہ کریم جانتے ہیں کہ اب قیامت انسانوں سے کتنی دور ہے یا کسی سے اس کی موت کتنی دور ہے کہ موت بھی آجائے تو ایک طرح کی قیامت قائم ہوجاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد عالی ہے: مَنۡ مَاتَ فَقَدۡ قَامَتۡ قِیَامَتُهٗ (حدیثِ مرفوع) کہ جو مرجاتا ہے ایک لحاظ سے اس کی قیامت آجاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ لوگوں کے حساب کتاب کا وقت بہت قریب ہے لیکن اُن کا یہ عالم ہے کہ وہ اس حقیقت سے رخ پھیر کر صرف دنیا جمع کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اُن کی ساری تگ ودو کا محور صرف دنیا ہے جسے پھر وہ چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ لوگ عظمتِ الٰہی اور احکامِ الٰہی سے منہ پھیرے غفلت کا شکار ہیں، دنیا کے پیچھے بھاگ رہے ہیں کہ یہ بھی حاصل کرلیں، وہ بھی حاصل کرلیں اور سب جمع کرکے ایک دن چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔

یہی بات گزشتہ سبق میں بیان ہوئی تھی کہ لوگوں کے دل جب اللہ کی یاد سے خالی ہوجاتے ہیں تو انہیں آخرت کی فکر نہیں رہتی اور اس خلا کو دنیا کی محبت پُر کردیتی ہے کیونکہ فضائے دل تو خالی نہیں رہتی، کوئی جگہ بھی خالی نہیں رہتی، کسی نہ کسی چیز سے ضرور بھر جاتی ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ جو گھر خالی رہتا ہے اس میں جنات بسیرا کرلیتے ہیں، اسی طرح جب دل سے یادِ الٰہی، عظمتِ الٰہی، آخرت کا یقین رخصت ہوجاتا ہے تو جو خلا بنتا ہے اسے دنیا کی محبت پُر کردیتی ہے، غور کیا جائے تو موت کے بعد شروع ہونے والی ابدی زندگی کے مقابلے میں دنیوی زندگی کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ دنیا میں انسان پچاس سال، اسی سال، سو سال رہ (جی) لے گا جبکہ موت کے بعد شروع ہونے والی زندگی ہمیشہ رہے گی۔ ایک صدی کو ابد کے مقابلے میں کیا حیثیت حاصل ہے، وہاں کا تو ایک دن زمین کے ایک ہزار سال کے برابر ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے: وَاِنَّ یَوۡمًا عِنۡدَ رَبِّکَ کَاَلۡفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ ﴿۴۷﴾ (الحج) عند اللہ آسمانوں پر ایک دن گزرتا ہے تو زمین پر دس صدیاں گزر جاتی ہیں۔ جہاں ہزار سال کا ایک دن ہو تو اس کے

مقابلے میں سو سال کی حیثیت چند لمحوں ہی کی بنتی ہے اور اگر اس زندگی کو ابدی زندگی کے مقابلے میں دیکھیں تو لمحہ بھر بھی نہیں بنتا۔

اللہ کریم نے انسانیت کو ہدایت سے ہر دور میں نوازا:

فرمایا: مَا يَأْتِيهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ ۔۔۔اِن کے پاس اُن کے پروردگار کی طرف سے اُن کے حسبِ حال کوئی نصیحت آتی ہے تو: إِلَّا اسْتَمَعُوهُ وَهُمْ يَلْعَبُونَ ۝۲ تو یہ اُسے ایسے سنتے ہیں گویا مذاق اڑا رہے ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو زمین پر بھیجا اور اُن سے انسانی آبادی کی ابتدا ہوئی تو اللہ کریم نے بہت مہربانی فرمائی اور آدم علیہ السلام کی تربیت فرمائی۔ جبرائیل امین نے آکر انہیں کاشتکاری، گھر بنانے، رہائش اور لباس وغیرہ کے تمام امور سکھائے۔ جوں جوں انسانیت پھیلی تو انسانی شعور بھی بلوغت کی طرف چلا جیسے بچہ شعور کی منازل طے کرتا ہے اور جب بالغ ہوتا ہے تو ساری باتیں سمجھ لیتا ہے۔ اسی طرح آدم علیہ السلام کا دور انسانیت کا بچپن تھا پھر رفتہ رفتہ منازل طے ہوتی رہیں تا آنکہ انسانیت بالغ ہوگئی۔ دریں اثناء ہر دور کے مطابق اللہ کریم انسانوں کی راہنمائی فرماتے رہے۔ اللہ کے نبیؑ اور رسولؑ اللہ کے احکامات پہنچاتے رہے۔ جب انسانیت بلوغت کو پہنچ گئی، اور بلوغت کی دلیل یہ ہے کہ دنیا ایک گلوبل ویلیج بن گئی، ساری دنیا ایک ہی گاؤں بن گئی تو اللہ کریم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما دیا۔ جن کی بعثت نے ہمیشہ کے لیے انسانیت کے سارے مسائل کا حل عطا کر دیا۔ اب قیامت تک انسان جتنی بھی ترقی کرے گا، اس کے جملہ امور کی راہنمائی کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کافی ہوگی۔ گویا انسانی ذہن، عقل و شعور، ہر چیز اپنے اوجِ کمال کو پہنچ چکی۔ اللہ کریم نے اسی کے مطابق اپنا آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آخری دین بھی بھیج دیا، اور قیامت تک انسانوں کی ہر ضرورت اور سوال کا جواب اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت اپنی کتاب میں عطا فرما دیا۔ فرمایا! یہ ایسے عجیب لوگ ہیں کہ اللہ کی آیات میں ایک سے بڑھ کر ایک دلیل موجود ہے لیکن یہ لوگ ان دلائل کی پرواہی نہیں کرتے پہلے انبیاؑ کے عہد کی باتوں پر اعتراض کرتے رہے اور جب ان کے عہد کی بات آئی تو انہوں نے منہ پھیر لیا اور سننے سے انکار کر دیا۔ وَهُمْ يَلْعَبُونَ ۝۲ دنیوی امور میں مستغرق ہو گئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔

دنیا کے امور کب کھیل تماشا بنتے ہیں؟

اگر دین کے مقابلے میں دنیا کے امور مقدم رکھے جائیں تو پھر یہ کھیل تماشا رہ جاتے ہیں اور ان سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ جس طرح بچے کھیلتے ہیں، کبھی چور سپاہی کھیلتے ہیں کبھی بادشاہ اور رعیت بن کر کھیلتے ہیں، گھر اور قلعے

بناتے ہیں اور جب کھیل ختم ہو جاتا ہے تو اسے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ اس کھیل کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا، کچھ حاصل نہیں ہوتا اور بچے کچھ ساتھ لے کر نہیں جاتے۔ اسی طرح اگر دین کو ثانوی حیثیت دے کر امور دنیا انجام دیے جائیں تو ان سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اللہ کا دین وہ نعمت ہے جو دنیوی امور کو عبادت بنا دیتا ہے اور وہ کھیل تماشا نہیں رہتے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادِ عالی کا ترجمہ ہے کہ مومن کی دنیا بھی دین ہے اور کافر کا دین بھی دنیا ہے۔

مومن جب جائز وسائل سے رزق تلاش کرتا ہے اور کما کر لاتا ہے تو وہ عبادت کرتا ہے۔ اپنے اہل وعیال کو پالتا ہے، ماں باپ کی خدمت کرتا ہے، غریب اور مسکین کو دیتا ہے تو بھی یہ عبادت ہے۔ مومن کا کمانا اور خرچ کرنا جب شریعت کے مطابق ہوتا ہے تو اس کی دنیا بھی دین بن جاتی ہے، وہ کام دنیا کے کرتا ہے اور ثواب عبادت کا پاتا ہے جبکہ کافر کا دین بھی دنیا ہے۔ تمام عالمِ کفر کی عبادات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو جتنی عبادات انہوں نے اپنی طرف سے گھڑ رکھی ہیں ان میں سے ہر ایک کے ساتھ کوئی دنیوی مفاد جوڑ رکھا ہے۔ کافر دین کے نام پر بھی جو کچھ کرتا ہے اس سے وہ دنیا ہی حاصل کرنا چاہتا ہے، مومن کی دنیا بھی دین ہوتی ہے۔ ہمارے اشغال وافکار اور ہمارا کردار جس قدر دین سے ہٹا ہوگا وہ اسی قدر کھیل تماشا ہوگا اور اس سے کچھ وصول نہیں ہوگا۔

اللہ کریم معاف فرمائیں، آج ہمارا یہ عالم ہے کہ اللہ کی یاد یا عبادت فرصت پر منحصر ہے اگر فرصت مل جائے تو کر لیتے ہیں۔ اکثر نمازیوں کا یہ حال ہے کہ اُن سے پوچھیں تو کہتے ہیں کہ نماز پڑھتے ہیں لیکن مصروفیت اتنی ہے کہ ساری نمازیں ادا نہیں کر پاتے۔ گویا نماز ان کی مصروفیات میں شامل نہیں ہے۔ اُن کی مصروفیات دنیوی سے اگر فرصت ملے تو نماز بھی پڑھ لی جاتی ہے۔ یہ حال تو نمازیوں کا ہے اور جو نماز ترک ہی کر چکے، اُن کا تو عالم ہی جدا ہے۔

کافر تو بدنصیب تھا، ایمان سے محروم رہا اس کا دین دنیا بنا لیکن یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جسے کلمہ پڑھنا نصیب ہوا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر ایمان لانا نصیب ہوا اور پھر وہ دنیا میں ڈوب گیا! یہ انتہائی لائقِ ملامت بات ہے۔

اسلام تو دینِ فطرت ہے اور زندگی کا راستہ نہیں روکتا کہ فطرت کا نظام روکا جا ہی نہیں سکتا۔ اللہ کا نظام ایسا ہے۔ مثال کے طور پر اگر دریا پر بند باندھ لیا جائے، جتنا بھی اونچا بند باندھیں ایک دن پانی اس کے اوپر یا دائیں بائیں سے گزر جائے گا اس لیے کہ اسے ہمیشہ کے لیے روکا جا نہیں سکتا۔ زندگی بھی ایک بہتے ہوئے دریا کی مانند ہے اسے بھی روکا نہیں جا سکتا، خوبصورت موڑ دیے جا سکتے ہیں کہ یہ وہاں سے گزرے جہاں اسے فائدہ ہو۔ اسلام نے زندگی کو خوبصورت موڑ دیے ہیں، رزق کمانے سے روکا نہیں بلکہ رزق کمانے کے وہ طریقے ارشاد فرما دیے کہ حلال

رزق حاصل ہو۔ مال کو خرچ کرنے کے اسلوب سمجھائے کہ جو محنت سے کمایا ہے اُسے بے جا نہ اڑاؤ، اسراف نہ کرو۔ اچھا لباس پہنو، اچھا کھانا کھاؤ، اچھا گھر بناؤ، اچھی سواری رکھو، جائز جگہ پر خرچ کرو لیکن اُسے ضائع نہ کرو۔ اسلام شادی سے روکتا ہے نہ بچے پالنے سے بلکہ اجازت دیتا ہے کہ شادی کرو، بچے پالو، والدین کی خدمت کرو، ساری آسائشیں حاصل کرو لیکن حلال ذرائع سے۔ چوری کر کے یا کسی کا حق چھین کر نہیں۔ یاد رہے کہ چوری کی پوشاک سے وہ سادہ لباس بہتر ہے جو حلال کمائی سے حاصل ہو اور یہ کہ پھٹا پرانا مرمت کر کے پہن لینا حرام مال سے حاصل کردہ اعلیٰ لباس سے بہتر ہے اسلام نے زندگی کا راستہ نہیں روکا لیکن انسان کی یہ بدنصیبی ہے اسلام کو چھوڑ کر بے مہار زندگی میں کھو جاتا ہے۔ اسلام تو زندگی کو راستے دیتا ہے اور اسلام کو چھوڑ کر جس دنیا میں ہم کھو جاتے ہیں وہ بے راہ ہوتی ہے، بے مہار ہوتی ہے اور اس کا کوئی راستہ متعین نہیں ہوتا۔

فرمایا، لوگوں کا عالم یہ ہے کہ جب اللہ کریم ان کی راہنمائی فرماتا ہے ان کی ضرورت پوری فرماتا ہے اور اپنی طرف سے احکام نازل فرماتا ہے تو یہ بجائے اُن احکام پر غور کرنے کے، اُن پر عمل کرنے کے بات سنتے ہی نہیں توجہ ہی نہیں دیتے ہیں۔ ان لوگوں کے پاس فرصت ہی نہیں ہے کہ احکاماتِ الٰہی کی طرف توجہ دیں، یہ کھیل تماشے میں لگے ہوئے ہیں۔ پیسے جمع کر رہے ہیں، مکان بنا رہے ہیں، گاڑیاں جمع کر رہے ہیں جبکہ یہ سب مال و متاع چھوڑ کر ایک دن چلے جائیں گے۔ یہ سند کسی کے پاس نہیں ہے کہ اسے کفن کے لیے چند گز کپڑا اور قبر کے لیے دو گز زمین بھی میسر ہو گی یا نہیں۔

انسان دنیا میں کیوں کھو جاتا ہے؟

زندگی گزارنے کے سب سے خوبصورت اور خوش کن طریقے اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم بتاتے ہیں پھر انسان انہیں چھوڑ کر نفس اور شیطان کے کہنے پر مٹی کے کھلونوں میں کیوں الجھ جاتے ہیں؟ فرمایا: لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ۔۔۔ ان کے دل غفلت میں پڑے ہیں اور یہ دل کی استعداد ضائع کر چکے ہیں، کھو چکے ہیں۔ جس طرح ظاہری دنیا، مادّی چیز ہے اور مادّی وجود سے محسوس کی جاتی ہے اسی طرح اللہ، کتاب اللہ، عظمتِ رسالت اور آخرت یہ روحانی چیزیں ہیں انہیں قلب محسوس کرتا ہے۔ یہ ایک لطیف حقیقت ہے کہ ان روحانی چیزوں کی لذت کو پانے کے لیے ضروری ہے کہ دل خود زندہ اور بیدار ہو۔ وہ ان کو خود سوچے سمجھے ان کی لذت سے آشنا ہو اور وہ دماغ کو پابند کر دے کہ اس سے باہر نہیں جاتا۔ فرمایا، ان کی مصیبت یہ ہے کہ ان کے سینے میں جو دل ہے وہ صرف ایک Pumping Machine ہے اس کے اندر قلب نام کی چیز مر چکی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی صحبت سے دل زندہ و بیدار ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے نور نبوت کی برکات ہمیشہ کے لیے ہیں۔

مشائخ اور صوفیائے کرام اسی لیے دل کی اصلاح پر زور دیتے ہیں کہ دل ہی اصل ہے، دل ہی اساس ہے۔
جب دل کی صلاحیت ضائع ہو جائے تو پھر اس کا حال اس شخص جیسا ہو جاتا ہے جس کے سامنے پھلوں سے لدے ہوئے درخت ہوں لیکن وہ مٹی کے پھل بنا کر کھا رہا ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ احکامِ شریعت حقیقی پھل ہیں اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے غلام دن رات دعوت دے رہے ہیں کہ یہ پھل کھالو یہ بہت لذیذ ہیں لیکن جب دل کی صلاحیت ضائع ہو جائے تو بندہ تکلف ہی نہیں کرتا کہ اٹھ کر کھالے حالانکہ اُسے کوئی منع نہیں کرتا۔ اس کا قلب غفلت میں پڑا پڑا تباہ ہو گیا ہے جس کی وجہ سے روحانی لذت کو محسوس کرنے والی حس مر گئی۔

جدید سائنسی تحقیق:

جدید سائنسی تحقیق بتاتی ہے کہ دل کا اپنا دماغ ہے، دل کی اپنی سوچ ہے، دل باتیں سنتا ہے، سمجھتا ہے، ان پر سوچ بچار بھی کرتا ہے اور فیصلے کرتا ہے۔ سائنس دان کہتے ہیں کہ دل کا کیا ہوا فیصلہ اگر دماغ کو پسند نہ بھی آئے تو بھی دماغ اس پر عمل درآمد کرنے پر مجبور ہے اور اعضاء و جوارح کو حکم دیتا ہے کہ وہ تعمیل کریں البتہ دماغ جو فیصلہ کرتا ہے۔ اگر دل اُسے منظور نہ کرے تو اس پر عمل نہیں ہوتا، یعنی دماغ دل کا نائب ہے جو دل کے فیصلوں کو نافذ کرتا ہے۔ گویا دل حاکم ہے اور دماغ اس کا وزیر ہے۔

قلب کی غفلت کا نتیجہ:

فرمایا: لَاهِيَةً قُلُوبُهُمْ ۗ وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ۖ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ③ ان کے دل غفلت میں پڑے ہیں اور ان ظالموں نے آپس میں سرگوشیاں کیں کہ یہ پیغمبر تمہاری ہی طرح ایک عام آدمی ہیں تو تم دیکھتی آنکھوں جادو کی لپیٹ میں کیوں آتے ہو؟ یہ ایسے ظالم لوگ ہیں کہ شریعت کے خلاف آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں کہ یہ کیسی شریعت ہے اور یہ رسول کیونکر ہو سکتے ہیں، یہ تو ہمارے ہی جیسے انسان ہیں۔ یہ لوگ سرگوشیوں میں مذاق اڑاتے اور اعتراض کرتے ہیں کہ یہ بھی ہماری طرح کا ایک انسان ہے تو پھر رسولؐ کیسے ہو گیا؟ جس طرح ہمیں بھوک لگتی ہے، پیاس لگتی ہے اسے بھی لگتی ہے اور جس طرح ہمیں لباس اور جوتوں کی ضرورت ہے، اسے بھی ہے۔ اس کی بیوی بچے، گھر بار بھی ہے تو پھر یہ رسولؐ کیسے ہو گیا؟ ان کے خیال میں رسولؐ کو مافوق الفطرت ہونا چاہیے تھا۔ یہ ظالم کہتے ہیں: اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ③ یہ کوئی جادوگر ہے، تو یہ (سب) دیکھتے ہوئے اس کے جادو کے اثر میں کیوں آتے ہو!

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو روکنے کے لیے اہل مکہ کی تدبیریں:

زمانہء جاہلیت میں بھی لوگ حج کیا کرتے تھے اور حج کے موقع پر تقریباً سارا جزیرہ نمائے عرب مکہ میں جمع

ہو جاتا تھا۔ حج کے دنوں میں مکہ میں خوب بازار بھی سج جاتے اور اہل مکہ کے پاس بہت دولت جمع ہو جایا کرتی تھی۔ یہ لوگ حج بھی اپنے انداز سے کرتے اور اس کے لیے بہت سی رسومات ایجاد کر چکے تھے۔ بیت اللہ شریف کے گرد اچھلتے کودتے اور سیٹیاں بجاتے ہوئے طواف کرتے تھے۔

بعثتِ عالی کے بعد جب حج کا موقع آیا تو اہل مکہ نے آپس میں یہ بات کی کہ حج کے موقع پر تو یہاں دور دراز سے لوگ آئیں گے ان (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم) کی باتیں سنیں گے تو ان کی بات پھیلے گی۔ اب تک تو بات مکہ کے شہر تک تھی یا گردونواح کے چند قبائل تک محدود تھی لیکن پھر یہ پورے جزیرہ نمائے عرب تک پھیل جائے گی تو اس کا کوئی تدارک کیا جانا چاہیے۔ ان میں سے کسی نے مشورہ دیا کہ ہم لوگوں سے یہ کہیں گے کہ یہ (معاذ اللہ) جھوٹ بولتے ہیں لیکن سب نے یہ کہہ کر تجویز رد کر دی کہ یہ بات کوئی نہیں مانے گا اس لیے کہ جو لوگ مکہ آتے جاتے رہتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ انہوں نے اپنی چالیس سالہ زندگی میں کسی انسان پر بھی کبھی جھوٹ نہیں بولا لہٰذا کوئی اور بہانہ بناؤ۔

بہت سوچ بچار کے بعد وہ کہنے لگے کہ ہم کہیں گے کہ ان کے پاس جادو ہے اور جو بندہ بھی ان کی بات سنتا ہے وہ پھر نہ ماں باپ کی بات سنتا ہے، نہ بیوی بچوں کی سنتا ہے بلکہ انہی (محمد صلی اللہ علیہ وسلّم) کا ہو کر رہ جاتا ہے اور یوں یہ بھائی کو بھائی سے، اولاد کو والدین سے، شوہر کو بیوی سے جدا کر دیتے ہیں۔ ان کے پاس کوئی ایسا جادو ہے جو سننے والے کو ایسا مسحور کرتا ہے کہ وہ پھر صرف انہی کا دم بھرتا ہے اور انہی کا ہو کر رہ جاتا ہے تو کہنے لگے: اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ۝۳ کہ تم لوگ کھلی آنکھوں، دیکھتی آنکھوں ان کے جادو میں کیوں آتے ہو؟ ان کی بات ماننے کا تو مطلب ہوا کہ اب تک جو باپ دادا سے چلا آ رہا ہے وہ سارا تو غلط ہو گیا اور ہمارے باپ دادا تو جہنمی ہو گئے۔ ان کی بات ماننے والا تو ایسے جادو میں گرفتار ہو جاتا ہے کہ باپ دادا کے دین سے بےزار ہو کر کہتا ہے کہ میں تو مسلمان ہو رہا ہوں اور پھر ان کے سوا نہ کسی کی بات سنتا ہے نہ کسی کی پروا کرتا ہے۔

مسلمانی وہ جسے کافر بھی مانے:

مسلمانوں کی مسلمانی یہ تھی جسے کافر بھی مانتے تھے کہ بھئی جو کلمہ پڑھ لیتا ہے وہ تو پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کے مقابلے میں کسی کی بات نہیں مانتا۔ اس کا جینا مرنا، سونا، جاگنا، اٹھنا بیٹھنا، سب کچھ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلّم) کی اطاعت میں ڈھل جاتا ہے۔ اگر آج اہلِ مکہ کو اللہ کریم واپس دنیا میں بھیج دیں تو انہیں بہت سے ایسے مسلمان مل جائیں گے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی بات نہ سنیں گے بلکہ اہل مکہ کی سنیں گے۔ آج

کے زمانے میں تو بہت مسلمان ہیں جو خود کو مسلمان کہتے ہیں لیکن حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی بات نہیں سنتے بلکہ زمانے کی سنتے ہیں، اہلِ مغرب کی سنتے ہیں، شرقِ بعید کی سنتے ہیں، کفار و مشرکین کی سنتے ہیں۔ سننے سے مراد ہے کہ اُنہیں اُن کی باتیں اچھی لگتی ہیں اور ان پر عمل کرتے ہیں۔

اُن جیسی شکلیں بنانا پسند کرتے ہیں، ان جیسے حلیے اپنا لیتے ہیں۔ ہم اُن کے بنائے ہوئے معاشی اصولوں پر کاروبار کرتے ہوئے نہایت بے دردی سے سود کھاتے ہیں اور پھر یہ دلیل اور جواز بھی دیتے ہیں کہ سب ہی ایسا کر رہے ہیں۔ قرآن پاک تو فرماتا ہے: وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ (سبا:13) اللہ کے بندوں میں بہت کم اس کے شکر گزار بندے ہوتے ہیں۔

گویا اکثریت گمراہ اور ناشکرے لوگوں کی ہوتی ہے تو پھر ہمیں اکثریت کے پیچھے لگنے کی بجائے اللہ کے شکر گزار بندوں کو تلاش کرنا چاہیے۔ ہم پر یہ جادو کیوں نہیں چلتا کہ کلمہ پڑھ لیا تو پھر کلمے کے ہی ہو گئے۔ جینا مرنا ویسے ہی ہو گیا جیسے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کا ہے۔ یہ تھی مسلمانی جسے کافر بھی مانتے تھے کہ جو ان (صلی اللہ علیہ وسلّم) کا کلمہ پڑھتا ہے وہ انہی کا ہو جاتا ہے۔ انہی کی مانتا ہے اُن (صلی اللہ علیہ وسلّم) کے مقابلے میں کسی کی نہیں مانتا۔

اللہ کریم سننے اور جاننے والے ہیں:

فرمایا: قٰلَ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۡ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) انہیں فرما دیجیے کہ میرا پروردگار زمینوں اور آسمانوں میں ہونے والی ہر سرگوشی کو جانتا ہے اور یہ جو تم اسلام کے خلاف چھپ چھپ کر سرگوشیاں کرتے ہو، یہ میرے اللہ سے چھپی ہوئی نہیں ہیں۔ آسمانوں میں کوئی بات ہو یا زمین پر، کسی کے دل میں ہو، زبان پر بھی نہ آئی ہو تو بھی اللہ کے علم میں ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ ابھی دل میں بھی نہ آئی ہو تو بھی وہ جانتا ہے کہ کب کیا بات، کس کے دل میں آنی ہے۔

فرمایا، جاہلو! تم اللہ کے نبیؐ کے خلاف سرگوشیاں کرتے ہو، اللہ کے دین کے خلاف سازشیں کرتے ہو اور چھپ چھپ کر باتیں کرتے ہو جبکہ میرا پروردگار ہر بات کو جانتا ہے۔ تم تو زمین پر سرگوشیاں کرتے ہو وہ آسمانوں کی بھی ہر چھوٹی بڑی بات جانتا ہے اور زمین اور زیرِ زمین جو کچھ ہوتا ہے اسے بھی جانتا ہے۔ وَهُوَ السَّمِيْعُ ۔۔۔ اس کی صفت ہے کہ جیسا وہ سننے والا ہے ایسا کوئی دوسرا نہیں ہے اور الْعَلِيْمُ ۝ وہ سب کچھ جانتا ہے، علم رکھتا ہے اور جیسا وہ جانتا ہے کوئی دوسرا ایسا جاننے والا نہیں ہے۔ کوئی چیز اس سے چھپ نہیں سکتی، کوئی آواز اس سے چھپائی نہیں جا سکتی۔

جدید سائنسی تحقیق:

حال ہی میں ریت کے ذرّوں پر تحقیق کی گئی اور ایک خاص کیمرے سے ریت کے ذرّے کی تصویریں لی گئیں جب اُن تصویروں کو خاص خوردبین سے دیکھا گیا تو اس ذرّے میں سمندری حیات کی تصویریں تھیں اور ریت وہاں ہوتی ہے جہاں کبھی سمندر رہا ہو مٹی تو پانی میں حل ہو کر ضائع ہو جاتی ہے جبکہ ریت پانی میں حل نہیں ہوتی اور یوں جمع ہو جاتی ہے۔ اللہ کریم کا اپنا نظام ہے کہ کہیں سے زمین اونچی ہو جاتی ہے، کہیں سے نشیبی ہو جاتی ہے تو سمندر نشیبی سطح کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور اوپر ریگستان بن جاتا ہے۔ ریت کے ان ذرّوں میں جو تصویریں دیکھی گئی ہیں وہ سب کی سب سمندری حیات سے متعلق ہیں۔

اس تحقیق سے سمجھ آتی ہے کہ یہ تو اللہ کریم نے گواہیاں لکھ رکھی ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ عالی کا مفہوم ہے کہ زمین کے ذرّات بھی گواہی دیں گے کہ اس شخص نے مجھ پر سجدہ کیا، اس نے مجھ پر قتل کیا، اس نے مجھ پر چوری کی۔ گویا محشر میں مٹی کے ذرّات بھی گواہی دیں گے جیسا اس تحقیق میں دیکھا گیا کہ ریت چونکہ سمندر سے ہوتی ہے لہٰذا اس میں سمندری حیات کی تصویریں تھیں۔

یاد رہے! سب سے پہلی تحریر جو انسان نے لکھی، وہ تصویر ہی تھی کہ اگر کوا لکھنا ہوتا تو کوے کی تصویر بنائی جاتی، بیل لکھنا ہوتا تو بیل کی چھوٹی سی تصویر بنائی جاتی۔ اسی طرح حروف اور الفاظ ایجاد ہوئے۔ ا، ب، ج، ایجاد ہوئے جو پہلی انسانی زبان ہے۔ مثال کے طور پر 'جمل' اونٹ کو کہتے ہیں تو اونٹ کی تصویر بنائی جاتی تھی تو اس کی گردن 'ج' رہ گئی اور اس میں نقطہ ڈالا اور جمل بن گیا اور یوں حروف اور الفاظ ایجاد ہوئے۔

اسی طرح ریت کے ذرّوں میں ساری داستان درج ہے کہ وہاں کون کون بسا اور ان کی بود و باش کیسی تھی۔ اگر اللہ کریم محققین کو توفیق دیں اور یہ زمین کے ذرّات میں سے بھی کسی چھوٹے سے چھوٹے ذرّے کی تصویر بنا لیں تو زمین کے ذرّے ذرّے میں انسانوں کی کہانیاں لکھی ہوئی ہیں۔ اللہ کے علم میں تو سب ہے، وہ خود تو جانتا ہے اور اس کے کاتب بھی بہت ہیں، لوحِ محفوظ میں بھی لکھا ہوا ہے اور فرشتے بھی سب کے اعمال لکھ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ زمین پر جو کچھ ہوتا ہے وہ اس کے ذرّوں میں بھی لکھا ہوا ہوتا ہے۔

عظمتِ رسالت علیہ الصلوٰۃ والسلام اور کفار کا رویہ:

اہلِ مکہ یعنی کفار و مشرکین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سرگوشیاں کرتے ہیں اور ان کے لائے ہوئے دین کا راستہ روکنے کی منصوبہ بندی کرتے رہتے ہیں جبکہ انہیں اس بات کا احساس ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کو مبعوث کر کے ان لوگوں پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسا عظیم الشان رسول صلی اللہ علیہ وسلّم مبعوث فرمایا کہ جس پر ایمان لانے سے، ایک بار کلمہ طیبہ پڑھ لینے سے صدیوں سے طاری کفر وشرک صاف ہو جائے اور یہ نور میں نہا جائیں۔ ان کی زندگی بھر کی ظلمتیں، گناہ، شرک اور کفر کی ظلمتیں ایک نگاہِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلّم سے دھل جائیں اور یہ روشن اور منور ہو جائیں لیکن ان لوگوں کی قدر شناسی کا یہ عالم ہے کہ کہتے ہیں: بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۢ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۔۔۔ کہ ان پر وحی نہیں آئی بلکہ انہوں نے خواب دیکھ لیا ہوگا جس میں کوئی تصویریں دیکھ لیں، اور یہ رسالت کا دعویٰ کیے پھرتے ہیں کہ میں رسول ہو گیا ہوں۔ ان کی باتیں (معاذ اللہ) فضول خوابوں کا مجموعہ ہیں جو یہ سناتے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب ہڈیاں گل جائیں گی، مٹی میں مل جائیں گی تو پھر مردے زندہ ہو جائیں گے اور اُن کا حساب کتاب ہوگا۔ کچھ کافر یہ کہتے ہیں کہ یہ باتیں خود ہی انہوں نے گھڑ لیں ہیں اور اللہ پر بھی بہتان باندھ رہے ہیں کہ یہ من جانب اللہ ہیں، وحی الٰہی ہے۔ تیسری رائے بعض کفار کی یہ ہے کہ یہ قادر الکلام شاعر ہیں جو مسجّع و مقفّیٰ عبارتیں جوڑ لیتا ہے۔ افسوس اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی یہ قدر کی کفار نے!

مسلمانوں کا رویہ:

یہاں ہم سب کے لیے لمحہء فکریہ ہے کہ مشرکین تو یہ باتیں کہتے تھے اور بے شک کہنا بھی اپنی حیثیت رکھتا ہے، لیکن کہنے اور کرنے میں بہت فاصلہ ہے۔ مثلاً ایک شخص کہتا ہے کہ میں اسے قتل کر دوں گا اور ایک شخص قتل کر دیتا ہے تو زیادہ مجرم تو قتل کرنے والا ہوگا۔ قتل کا ارادہ بھی جرم ہے لیکن قتل کر دینا زیادہ بڑا جرم ہے۔ مشرکین جب یہ کہتے تھے کہ ہم احکام شریعت کو قابلِ توجہ، قابلِ عمل نہیں سمجھتے اور اس کے خلاف عمل کرتے تھے تو وہ اس درجے میں تھے گویا کہہ رہے ہیں کہ "ہم قتل کریں گے" جبکہ آج ہم جب شریعت کو چھوڑ کر خلافِ شریعت عمل کرتے ہیں تو ہم عملاً ثابت کرتے ہیں کہ ہمارے نزدیک شریعت فضول ہے۔ ہم کفار سے آگے بڑھ گئے ہم زیادہ بڑے مجرم ٹھہرتے ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ اقدس خود معجزہ ہے:

فرمایا: فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ۝۵ مشرکین کہتے ہیں کہ اگر یہ نبیؐ ہیں تو جس طرح پہلی اُمتوں کو اُن کے انبیاءؑ معجزے دکھاتے تھے ہمیں بھی ہماری مرضی کا معجزہ دکھائیں۔ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم نے اُن سے معجزہ طلب کیا کہ چٹان میں سے ایک اونٹنی نکلے اور وہ بچہ دینے والی بھی ہو، اور ایسا ہی ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سمندر پھاڑ دیا اور راستے بن گئے، پانی کی ضرورت پیش آئی تو پتھر سے چشمے جاری ہو گئے۔ کفار کہنے لگے اگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) بھی نبیؐ ہیں

تو ہماری پسند کا معجزہ دکھادیں۔ قرآن کریم نے اس کے بہت خوبصورت جواب دیے ہیں، پچھلے سبق میں یہ بات گزری تو قرآن نے جواب دیا کہ یہ لوگ تو جاہل ہیں کہ معجزہ طلب کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ ستودہ صفات تو سرتاپا معجزہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا نام نامی آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ذکرِ خیر تو پہلی کتابوں میں موجود ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا خاندان، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی جائے پیدائش آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا حلیہ مبارک یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے غلاموں کا حلیہ مبارک تک پہلی آسمانی کتابوں میں موجود ہے۔ صدیوں سے جس ہستی کے آنے کی خبر انبیاء اور اللہ کی کتابیں دیتی آئی ہیں اور ہو بہو مجسم وہ ہستی تشریف لے آئی تو اب اس سے بڑا معجزہ اور کیا ہوگا؟

منہ مانگا معجزہ ظاہر نہ کرنا بھی رحمتِ الٰہی ہے:

یہاں مشرکین کی بات کا ایک اور انداز میں جواب دیتے ہوئے فرمایا: مَآ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا۔۔۔ ان سے پہلے کوئی بستی والے جن کو ہم نے ہلاک کیا ایمان نہیں لائے تو کیا یہ ایمان لائیں گے؟

جن قوموں نے انبیاء سے معجزے طلب کیے اور انہیں وہ دکھادیے گئے پھر جب انہوں نے انکار کیا اور ایمان نہیں لائے تو قومیں ہلاک کردی گئیں۔ کوئی غرقِ آب ہوا تو کسی پر آسمانوں سے آگ برسی، پتھر برسے اور کوئی زمین میں دھنس گیا۔ لوگ بندر اور خنزیر بھی بنادیے گئے۔ مگر تم لوگوں کے ساتھ اللہ کریم یہ سلوک نہیں کرنا چاہتے۔

اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ۝ یہ لوگ بھی پہلے لوگوں کی طرح ایمان نہیں لائیں گے جنہوں نے منہ مانگے معجزے طلب کیے اور جب وہ معجزے ظاہر ہوگئے تو پھر بھی انکار پر ہی جمے رہے اور بالآخر اس کے نتیجے میں ہلاک کردیے گئے۔ اب اگر ان لوگوں پر بھی معجزہ ظاہر کردیا جائے تو یہ بھی ایمان نہیں لائیں گے اور تباہ ہوجائیں گے۔ اللہ ان پر احسان فرمارہے ہیں اور انہیں مہلت دے رہے ہیں کہ یہ غور و فکر کریں اور دامنِ نبوت کو تھام لیں۔ یہ اللہ کریم کا احسان ہے کہ وہ انہیں من حیث القوم ہلاک نہیں کرنا چاہتے لہٰذا انہیں بھی چاہیے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم سے ایسی فرمائشیں نہ کریں کہ اگر وہ ظاہر کردی جائیں اور پھر یہ نہ مانیں تو اجتماعی طور پر ہلاک کردیے جائیں۔ انہیں تو مہلت دی جارہی ہے کہ جب تک زندگی ہے فرصت ہے، سوچیں اور سمجھیں اور حق کا دامن تھام لیں۔

اللہ کریم کی دی ہوئی مہلت سے کتنے ایسے لوگوں کو ایمان نصیب ہوا جو بدر اور اُحد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے خلاف لڑ رہے تھے اور ایمان لانے کے بعد وہ اسلام کے نامور جرنیل ثابت ہوئے۔ اگر بدر و اُحد میں ہلاک ہوجاتے تو کفر میں ہلاک ہوتے۔ ابوجہل اور مشرکین مکہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم سے معجزہ طلب کیا تھا کہ وہ چاند کو دو ٹکڑے کر دیں تو یہ ایمان لے آئیں گے لیکن جب شق القمر ہوگیا تو کیا وہ ایمان لے آئے؟ پھر اس کے بعد کیا وہ مکہ میں آباد رہ سکے؟

اُن کی لاشیں بدر کے میدان میں خاک میں مل گئیں۔ ابوجہل کے فرزند حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ بدر واُحد میں اسلام کے خلاف نہایت بے جگری سے لڑے اور جب مکہ فتح ہوگیا تو انہوں نے ارادہ کیا کہ وہ شام کی طرف نکل جائیں یا کہیں اور بھاگ جائیں۔ اُن کی اہلیہ نے سمجھایا کہ بھاگنے کا ارادہ چھوڑ دیں کہ اسلام جس تیزی سے پھیل رہا ہے عین ممکن ہے کہ اُن کے پہنچنے سے پہلے ہی شام میں اسلام پہنچ چکا ہو اور وہ نظروں میں آجائیں۔ اُن کی اہلیہ کہنے لگیں کہ آپ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں جائیں چنانچہ بارگاہِ رسالت میں آگئے، مقبول ہوئے اور نامور جرنیل ہوئے، بالآخر شہادت کا رتبہ پایا۔ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ قبولِ اسلام کے بعد جب بھی میدانِ جنگ میں جاتے تو زِرّہ نہیں پہنتے تھے۔ اُن کے ساتھی سمجھاتے کہ اللہ نے زرّہ حفاظت کے لیے دی ہے، اسے نہ پہننا تو جہالت ہے تو وہ کہتے تھے کہ اس بدن نے اسلام کے خلاف جنگیں لڑی ہیں اب اسے زِرّہ نہیں چاہیے، اسے تلواریں لگنی چاہیے، اسے نیزے لگنے چاہیں اور زخم لگنے چاہیں کہ اس نے اسلام کے خلاف لڑنے کی جرأت کیوں کی تھی؟ اللہ نے انہیں شہادت سے سرفراز فرمایا۔

نبوت صرف مردوں کو عطا ہوئی:

فرمایا: وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیۡۤ اِلَیۡهِمْ ۔۔۔ اور ہم نے آپ سے پہلے صرف آدمیوں کو ہی پیغمبر بنا کر بھیجا تھا جن کے پاس ہم وحی بھیجا کرتے تھے۔ یہ لوگ پہلے نبیوںؑ کو مانتے ہیں، اُن کے متعلق جانتے ہیں، کوئی ملتِ ابراہیمی پر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، کوئی حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو ماننے کا دعویٰ کرتا ہے اور کوئی کہتا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کو مانتا ہے۔ ان سے پوچھو کہ جو پہلے نبیؑ آئے کیا وہ مرد نہیں تھے؟ یہاں لفظ رجال آیا ہے جو رجل کی جمع ہے اور رجل مرد کو کہتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خواتین میں نبوت نہیں ہے اور کوئی خاتون نبی نہیں ہوئی۔ فرمایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم سے پہلے بھی ہم نے سارے نبی مرد ہی بھیجے اور اُن میں مردانہ اوصاف تھے وہ کھاتے پیتے بھی تھے لباس بھی پہنتے تھے، شادیاں بھی کرتے تھے اور اُن کی اولاد بھی ہوتی تھی۔ یہ لوگ پہلے انبیاءؑ کو تو مانتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم پر اعتراض کر رہے ہیں، یہ تو اندھے ہوگئے ہیں۔

عورت امام نہیں ہوسکتی:

خواتین میں نبوت نہیں ہے تو خواتین امامت بھی نہیں کر سکتیں۔ آج کل تو خواتین کو امامت کا بہت شوق ہوگیا ہے اور ساتھ یہ بھی کہتی ہیں کہ ہم آگے نہیں کھڑی ہوتیں بلکہ صف میں کھڑی ہو کر نماز پڑھاتی ہیں۔ کچھ لوگوں نے تو اس کے حق میں روایات تک گھڑ رکھی ہیں۔ سب کو اللہ سے ڈرنا چاہیے اور جیسا جیسا مرتبہ اللہ نے عطا کیا ہے اس کے مطابق اپنا اپنا کام کرنا چاہیے۔ عورت کو نبی نہیں بنایا لیکن ہر نبیؑ نے ایک عورت کی گود میں پرورش پائی، سوائے

حضرت آدم علیہ السّلام کے جن کو ماں باپ کے بغیر پیدا فرمایا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو باپ کے بغیر پیدا کیا اور ایسا کوئی نبی نہیں ہے جس کا باپ ہو اور ماں نہ ہو۔ عورت کو نبیؑ کی ماں ہونے کا رتبہ دیا، نبیؑ کی زوجیت عطا کی، نبیؑ کی بیٹی بنایا، نبیؑ کی اُمت بنایا لہٰذا جو جس کا مقام ہے اسے وہاں ہی رہنا چاہیے۔ نبوت مردوں کا حصہ ہے کیونکہ معاشرے میں کام کرنا، ہر بندے سے ملنا ہر ایک کی بات سننا ہر ایک تک اپنی بات پہنچانا، کفار سے مقابلہ کرنا یہ سارے کام مردوں کے کرنے کے ہیں۔

جاہل پر عالم کی تقلید واجب ہے:

مشرکین و کفار کہتے ہیں کہ یہ تو ہمارے ہی جیسے انسان ہیں، کھاتے پیتے ہیں، اہل خانہ رکھتے ہیں اور انہوں نے خود ہی باتیں گھڑ لی ہیں۔ فرمایا: فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

(انکار کرنے والو!) سو اگر تم کو یہ بات معلوم نہ ہو تو جو یاد رکھتے ہیں ان (اہل کتاب) سے پوچھ لو۔ پہلے انبیاؑ جن کو ماننے کا یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں وہ انبیاؑ بھی انسان تھے اور سارے انسانی اوصاف رکھتے تھے اُن پر بھی وحی بھیجی گئی تو اگر ان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم پر اعتراض ہو رہے ہیں یا سمجھ نہیں آ رہی تو انہیں چاہیے کہ اہل ذکر سے، اُن لوگوں سے پوچھ لیں جو پہلی کتابوں کے عالم اور ماہر تھے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلّم پر بھی ایمان لے آئے۔ جو لوگ نہیں جانتے انہیں جاننے والوں سے پوچھنا چاہیے۔ وہ اہلِ علم جو پہلے موسوی دین میں تھے، جو عیسوی دین میں تھے اور پھر مسلمان ہو گئے اُن کے پاس پہلی کتابوں کا، پہلے انبیاؑ کا علم بھی ہے لہٰذا اُن سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے۔ فرمایا جا رہا ہے کہ ان سے کہیے اہلِ ذکر، اہلِ علم سے، منور القلوب لوگوں سے، روشن سینے والوں سے پوچھ لیں اگر یہ نہیں جانتے۔ اسی آیہ مبارکہ سے علما نے تقلید کا مسئلہ اخذ کیا ہے کہ جاہل پر عالم کی تقلید واجب ہے۔ جو نہیں جانتا اس پر واجب ہے کہ وہ جاننے والے سے پوچھے۔

مقلد اور غیر مقلد:

یاد رہے کہ عقائد میں تقلید نہیں ہوتی کہ ہر بندے کا عقیدہ ذاتی ہوتا ہے، تقلید احکام میں کی جاتی ہے۔ مثلاً ایک شخص وضو کا طریقہ نہیں جانتا تو وہ کسی جاننے والے سے پوچھے گا، تو یہی تقلید ہے۔ اسی طرح اگر کسی کو نماز پڑھنے کا طریقہ نہیں آتا تو جس سے سیکھے گا، اس کی تقلید کرے گا۔ اسی لیے امت نے اُن مجتہدین کی تقلید کی جن پر اُمّت متفق ہو گئی کہ انہوں نے اخذِ مسائل میں کمال کر دیا اور کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا۔ جو لوگ مقلد ہیں وہ تمام مسائل میں ایک ہی امام کی تقلید کر لیتے ہیں اور جو خود کو غیر مقلد کہلواتے ہیں وہ بھی کسی نہ کسی سے پوچھ کر ہی سیکھتے ہیں۔ وہ کسی سے قرآن سیکھتے ہیں، نماز سیکھتے ہیں اور دیگر احکام سیکھتے ہیں۔ غیر مقلد مختلف لوگوں کی مختلف مسئلوں میں تقلید کرتے ہیں جبکہ

مقلدین جملہ مسائل میں کسی ایک امام کی ہی تقلید کرتے ہیں، دونوں میں اتنا ہی فرق ہے۔ تقلید سب کو کرنی پڑتی ہے۔

انبیاؑ اور بشریت کے تقاضے:

گزشتہ آیت میں یہ بات ہورہی تھی کہ کفار و مشرکین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم پر یہ اعتراض کرتے تھے کہ یہ تو ہمارے جیسے انسان ہیں، کھانا کھاتے ہیں، لباس پہنتے ہیں اور بیوی اور اولاد رکھتے ہیں۔ ان معترضین میں چونکہ اکثریت کسی نہ کسی نبیؑ کے پیروکار ہونے کی دعوے دار بھی تھی لہٰذا اللہ کریم نے فرمایا کہ ان جاہلوں کو چاہیے کہ اہل علم سے جو پہلی کتابوں کا علم رکھتے ہیں اور اسلام بھی قبول کر چکے ہیں اُن سے پوچھیں کہ حقیقت کیا ہے۔ فرمایا: وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَأْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ۝۸ ہم نے کسی نبیؑ کا وجود ایسا نہیں بنایا کہ وہ کھانا نہ کھاتا ہو۔ اور وہ (حضرات) بھی ہمیشہ رہنے والے نہ ہوئے۔

مشرکینِ مکہ ملتِ ابراہیمی کے پیروکار ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو، اور یہودیوں نے حضرت عزیر علیہ السّلام کو اللہ کا بیٹا مان رکھا تھا اور خود کو اُن کا پیروکار مانتے تھے۔ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ کیا وہ انبیاؑ لباس نہیں پہنتے تھے، کیا وہ کھانا نہیں کھاتے تھے، کیا وہ مرد نہیں تھے؟ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ۝۸ اور کوئی نبیؑ ہم نے ایسا نہیں بنایا کہ وہ دنیا سے رخصت نہ ہوا ہو کہ جب یہ دنیا ہی ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے تو یہاں ہمیشہ رہنے کے لیے کون آئے گا؟ اس دنیا نے خود فنا ہو جانا ہے۔ انبیاؑ بھی ہمیشہ رہنے کے لیے نہیں آئے بلکہ اپنا اپنا کام سرانجام دینے کے لیے تشریف لائے اور اللہ کریم کی طرف سے جو ذمہ داری انہیں سونپی گئی اس کا حق ادا کر کے عالمِ برزخ میں تشریف لے گئے۔ وہ ہمیشہ رہنے کے لیے دنیا میں نہیں آئے تھے اور نہ ہی رہے۔

نبیؑ کی پیروی میں ہی نجات ہے:

فرمایا: ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَيْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَآءُ وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ۝۹ یہ بھی یاد رکھو کہ ہم نے انبیاؑ سے جو وعدے کیے سب پورے کیے۔ تاریخِ انسانی دیکھ لو کہ جب بھی لوگوں نے انبیاؑ کی نافرمانی کی اور برائی میں بڑھتے ہی چلے گئے تو اُن پر عذابِ الٰہی وارد ہوا اور تباہ کر دیے گئے جبکہ انبیاؑ اور اُن کے اطاعت گزاروں کو سلامتی اور نجات دی گئی۔ انبیاؑ کو بھی اور جن کو وَمَنْ نَّشَآءُ۔۔۔ ہم چاہتے تھے، جانتے تھے کہ یہ نبیؑ کے پیروکار ہیں ان سب کو ہم نے بچا لیا۔

اسراف میں ہلاکت ہے:

وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ۝۹ اور جو نبیؑ کے حلقہء اطاعت سے باہر نکل گئے اُن سب کو ہم نے تباہ کر دیا۔

اسراف فضول خرچی کو کہتے ہیں کہ بندہ حد سے نکل کر کام کرے یعنی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے جو حدود و قیود متعین کی ہیں، اُن سے متجاوز ہو جائے۔ مسرفین وہ ہیں جنہوں نے حلال و حرام، جائز ناجائز کی پروا نہ کی اور ہر معاملے میں انبیاء کی اطاعت سے نکل کر کام کیا تو اللہ کریم نے انہیں ہلاک کر دیا۔ شہروں کے شہر غرق ہو گئے، زمین میں دھنسا دیے گئے اور کتنی آبادیاں ایسی تھیں جن پر آسمانوں سے آگ برسائی گئی، پتھروں کی بارش کی گئی اور کتنی طاقتور قوموں کو ہوا اڑا کر لے گئی۔ یہ انجام اس لیے ہوا کہ وہ حد سے تجاوز کرنے والے یعنی اسراف کرنے والے لوگ تھے۔

قرآن حکیم ہر انسان کے لیے اللہ کا پیغام ہے:

فرمایا: لَقَدۡ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکُمۡ کِتٰبًا فِیۡہِ ذِکۡرُکُمۡ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۰﴾ یقیناً ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب بھیجی ہے جس میں تمہارے لیے نصیحت ہے۔ سو کیا تم نہیں سمجھتے! اللہ کریم فرماتے ہیں کہ لوگو! ہم نے اس کتاب کو نازل فرما کر تم پر اتنا احسان فرمایا ہے کہ اس میں تمہاری اگلی پچھلی ساری حقیقتوں کو کھول کر رکھ دیا ہے۔ لَقَدۡ اَنۡزَلۡنَاۤ۔۔۔ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ یہ ہم نے نازل فرمائی ہے یہ کسی اور کی بات نہیں بلکہ میرا ذاتی کلام ہے اور یہ تمہارے لیے ہے۔ اس میں فِیۡہِ ذِکۡرُکُمۡ۔۔۔ ساری تمہاری ہی باتیں لکھی ہیں، تمہارا ہی ذکر ہے کہ تمہیں زندگی کیسے گزارنی ہے، تمہارے تعلقات کیسے ہوں گے، والدین کے ساتھ کیا تعلق ہوگا، اولاد کے ساتھ تمہارا رشتہ کیا ہوگا، دوستی اور دشمنی کی حدود کیا ہوں گی، یہ سب باتیں اس کتاب میں لکھی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ معاملاتِ دنیا کی ساری تفصیل اس میں موجود ہے کہ تم رزق کیسے حاصل کرو گے، خرید و فروخت کا طریقہ کیا ہوگا، کھانے پینے کا سلیقہ کیا ہوگا؟ اس میں تمہارے گھر بسانے سے لے کر، قومی زندگی کی باتیں ہیں۔ تمہارا عدالتی نظام، تعلیمی نظام، معاشی نظام اور سیاسی نظام کیسا ہونا چاہیے یہ سب باتیں قرآن کریم میں نازل کر دی ہیں۔ لوگو! ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے قرآن عطا فرمایا ہے اس میں معلم و امام کا ذکر بھی ہے۔ مقتدی کا ذکر بھی ہے، امیر کی بات ہے تو غریب کا قصہ بھی ہے، پڑھے لکھوں کی بات ہے تو ان پڑھوں کی بات بھی ہے۔ یہ ہر مسلمان کے لیے اللہ کا پیغام ہے اور اس نظر سے پڑھا جانا چاہیے کہ میرا اللہ مجھے یہ بات فرما رہا ہے اور میں سُن رہا ہوں، مجھے حکم دے رہا ہے کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو۔

عقلمندی کا تقاضا:

قرآن میں ساری باتیں تمہاری ہدایت کے لیے ہیں۔ راہنمائی کے لیے ہیں پھر بھلا اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۰﴾ تم میں اتنا شعور بھی نہیں ہے کہ تم اللہ کی کتاب سے بات کو سمجھ لو؟ ہمارا ایک عجیب سا رویہ ہے کہ ہم نے بڑی حد تک یہ سمجھ رکھا ہے کہ دین صرف مولویوں کے لیے ہے اور صرف اُن کا کام ہے کہ وہ قرآن کو پڑھیں سمجھیں اور سمجھائیں۔ دوسری

زیادتی یہ کی جاتی ہے کہ ہم کسی سے سیکھنے کا تکلف ہی نہیں کرتے اگر ہمارے پاس کسی عزیز کا خط آ جائے اور ہم پڑھنا نہ جانتے ہوں تو کیا ہم اس خط کو ریشمی غلاف میں لپیٹ کر رکھ دیتے ہیں کہ پڑا رہے؟ نہیں بلکہ فوراً کسی پڑھے لکھے شخص کے پاس جاتے ہیں کہ پڑھ کر سنائے۔ ایک بار سن کر تسلی نہیں ہوتی کسی اور کے پاس جاتے ہیں کہ ذرا دوبارہ بتانا اس میں کیا لکھا ہے؟ ہم رب العالمین کی کتاب اٹھا کر پڑھنے والوں کے پاس، اہلِ ذکر کے پاس کیوں نہیں جاتے کہ اُن سے پوچھیں کہ ہمارا ربّ ہم سے کیا فرماتا ہے، ہم سے کیا چاہتا ہے؟ ہم اُن سے پوچھیں کہ اس کتاب میں ہمارا کیا ذکر ہے، ہمارے لیے کیا حکم ہے؟ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم اسے ریشمی غلافوں میں لپیٹ کر رکھ دیتے ہیں اور بقول علامہ اقبال مرحوم کے، اب قرآن کا مصرف یہ رہ گیا ہے کہ جب کوئی مرنے لگتا ہے تو اس کے سرہانے پڑھنے بیٹھ جاتے ہیں کہ اس کی برکت سے مرنے والا آرام سے مرجائے۔

یہ کتاب تو حیاتِ دوام کا پیغام تھی اور زندگی کے لیے تھی بلکہ ایسی حیات کا پیغام تھی کہ تم مر کر بھی زندہ رہو گے، موت بھی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی لیکن ہم نے اسے موت کا نسخہ سمجھ لیا۔ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ۝۱۰ کیا تم اتنا شعور، اتنی عقل بھی نہیں رکھتے کہ اللہ کے احسان کی قدر کرو کہ اللہ کریم نے اپنی رحمت سے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلّم کو مبعوث فرمایا اور اُن صلی اللہ علیہ وسلّم پر کتاب نازل فرمائی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے کتنی محنت، کتنے مجاہدے سے تم تک پہنچائی۔

اللہ کریم نے یہ احسان بھی فرمایا کہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا۔ فرمایا: اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ (الحجر:9) بے شک یہ ذکر (قرآن) ہم نے نازل فرمایا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ اگر کسی میں اتنا شعور بیدار ہو جائے کہ یہ قرآن کریم وہی ہے جیسا لوحِ محفوظ میں ہے، جیسا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم پر نازل ہوا اور جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے اسے ترتیب دلائی۔ اگر یہ احساس ہو جائے کہ یہ اللہ کریم کے الفاظ ہیں جو زبانِ حق ترجمان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے ادا ہوئے، وہی آیات مبارکہ ہیں جو لب ہائے مبارک صلی اللہ علیہ وسلّم سے ادا ہوئیں اور میں انہیں دہرا رہا ہوں تو اس بات کی شیرینی اسے تلاوت میں مشغول رکھنے کو کافی ہے۔

ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ کسی شاعر کا شعر اچھا لگے تو لوگ اگرچہ شاعر سے واقف نہ بھی ہوں تو بھی اس شعر میں ایسی لذت محسوس کرتے ہیں کہ بار بار اُسے دہراتے رہتے ہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ اللہ کریم کا کلام ہو اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے لب ہائے مبارک سے نکلا ہو تو پھر کیوں نہ آیاتِ الٰہی ہماری زبان پر جاری رہیں، کیوں نہ دن رات، صبح شام ہم اسے دہراتے رہیں! اللہ کریم نے ایسی کتاب نازل فرمائی ہے جس میں ہر سوال کا جواب ہے، جینے مرنے کے سارے آداب ہیں تو کیا انسان اتنی عقل بھی نہیں رکھتا کہ اس کو پڑھ کر دیکھے، سمجھنے کی کوشش کرے؟

سورۃ الانبیآء رکوع 2 آیات 11 تا 29

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ﴿۱۱﴾
فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ﴿۱۲﴾ لَا تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْٓا اِلٰى
مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ ﴿۱۳﴾ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا
ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴﴾ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ ﴿۱۵﴾
وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴿۱۶﴾ لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ
لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۱۷﴾ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى
الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۭ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾ وَلَهٗ مَنْ
فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا
يَسْتَحْسِرُوْنَ ﴿۱۹﴾ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ﴿۲۰﴾ اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً
مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ﴿۲۱﴾ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ
فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۲۲﴾ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ
يُسْـَٔلُوْنَ ﴿۲۳﴾ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۭ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ هٰذَا ذِكْرُ
مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ
مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ
اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴿۲۵﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۭ بَلْ عِبَادٌ
مُّكْرَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴿۲۷﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ

اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾

اور ہم نے بہت سی بستیوں کو جو ظالم تھیں ہلاک کر دیا اور ہم نے اُن کے بعد دوسری قوم پیدا فرما دی ﴿۱۱﴾ پس جب انہوں نے ہمارے عذاب کو آتے دیکھا تو تب ہی اُس سے بھاگنے لگے ﴿۱۲﴾ بھاگو مت اور اپنے سامان عیش کی طرف پلٹ آؤ اور اپنے (عمدہ) مکانوں کی طرف شاید تم سے (اس بارے میں) پوچھا جائے ﴿۱۳﴾ کہنے لگے وائے ہماری کم بختی! بے شک ہم ہی ظالم تھے ﴿۱۴﴾ پھر وہ اسی طرح چیختے چلاتے رہے یہاں تک کہ ہم نے ان کو ایسے (نیست و نابود) کر دیا جیسے کھیتی کاٹ دی گئی (یا) آگ بجھ گئی ہو ﴿۱۵﴾ اور ہم نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس کو کھیل تماشے کے طور پہ پیدا نہیں فرمایا ﴿۱۶﴾ اگر ہم چاہتے کہ ہم کھیل کی چیزیں (یعنی زن و فرزند وغیرہ) بنائیں تو اگر ہم کو کرنا ہی تھا تو ہم اپنے پاس سے ہی اُسے بنا لیتے ﴿۱۷﴾ نہیں بلکہ ہم حق کو باطل پر مارتے ہیں پھر وہ (حق) اس کا سر توڑ دیتا ہے پس وہ (باطل) نابود ہو جاتا ہے۔ اور جو باتیں تم بناتے ہو اس سے تمہاری ہی خرابی ہے ﴿۱۸﴾ اور جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے سب اُسی کا ہے اور (ان میں) جو اس کے قریب (فرشتے اور مقربانِ بارگاہ) ہیں وہ اس کی عبادت سے عار نہیں کرتے اور نہ تھکتے ہیں ﴿۱۹﴾ رات اور دن (اس کی) پاکی بیان کرتے ہیں (اور) اکتاتے نہیں ﴿۲۰﴾ بھلا ان لوگوں نے زمین کی چیزوں سے معبود بنا لیا ہے تو (کیا) وہ (مرنے کے بعد) اُن کو اٹھا کھڑا کریں گے؟ ﴿۲۱﴾ اگر اُن (آسمان اور زمین) میں اللہ کے سوا کوئی معبود ہوتا تو دونوں تباہ ہو جاتے سو اللہ جو عرش کا مالک ہے ان امور سے پاک ہے جو یہ لوگ بیان کر رہے ہیں ﴿۲۲﴾ وہ جو کام کرتا ہے اُس سے پُرسش نہیں ہو سکتی اور ان

سب سے (جو کام یہ کرتے ہیں) پوچھا جائے گا ﴿۲۳﴾ کیا انہوں نے اس (اللہ) کو چھوڑ کر اور معبود بنائے ہیں اُن سے فرمایئے (اس بات پر) اپنی دلیل پیش کرو یہ (میری اور) میرے ساتھ والوں کی کتاب (یعنی قرآن) بھی ہے اور جو مجھ سے پہلے (پیغمبرؑ) ہوئے ہیں ان کی کتابیں بھی۔ بلکہ (بات یہ ہے کہ) ان میں سے اکثر وہ ہیں جو امرِ حق کو نہیں جانتے پس اس وجہ سے وہ منہ پھیر رہے ہیں ﴿۲۴﴾ اور جو بھی پیغمبر ہم نے آپ سے پہلے بھیجے تھے ان کی طرف یہی وحی بھیجی یہ کہ میرے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں لہٰذا میری ہی عبادت کرو ﴿۲۵﴾ اور کہتے ہیں کہ رحمٰن (اللہ) نے کسی (یعنی فرشتوں) کو اولاد بنا رکھا ہے۔ وہ اس سے پاک ہے بلکہ وہ (فرشتے اُس کے) معزز بندے ہیں ﴿۲۶﴾ وہ اس سے آگے بڑھ کر بول نہیں سکتے اور وہ اس کے ارشاد پر عمل کرتے ہیں ﴿۲۷﴾ وہ (اللہ) اُن کے اگلے اور ان کے پچھلے احوال سے باخبر ہے اور اس کی مرضی کے بغیر وہ کسی کی سفارش تک نہیں کر سکتے اور وہ سب اس کی ہیبت سے ڈرتے ہیں ﴿۲۸﴾ اور ان میں جو شخص یوں کہے کہ میں اُس (اللہ) کے سوا عبادت کا مستحق ہوں تو اُسے ہم دوزخ کی سزا دیں گے ظالموں کو ہم ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں ﴿۲۹﴾

تفسیر و معارف

ظلم تباہی کا سبب ہے:

فرمایا: وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ﴿۱۱﴾ اور ہم نے بہت سی بستیوں کو جو ظالم تھیں ہلاک کر دیا اور ہم نے ان کے بعد دوسری قوم پیدا فرما دی۔ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ کتنی ہی ایسی بستیاں، آبادیاں، قومیں اس لیے تباہ کر دی گئیں کہ وہ ظلم کرنے والے لوگ تھے اور یہ ظلم وہ اپنے آپ پر ڈھاتے تھے۔ یہ ظلم کیا تھا؟ ان کا ظلم یہ تھا کہ اُن کی طرف جو نبیؑ مبعوث ہوتا وہ اس کی نافرمانی کرتے تھے۔ انبیاؑ کی نافرمانی ایسا ظلم ہے جو انسان اپنے ساتھ کرتا ہے، ظلم کی بھی ایک حد ہے۔ جس طرح کشتی کا ایک حجم ہوتا ہے اس میں اگر اتنا وزن رکھ دیا جائے جو اس کی برداشت سے باہر ہو تو وہ ڈوب جاتی ہے۔ اسی طرح حیاتِ مستعار میں بھی ظلم یعنی

گناہ کرنے کی بھی ایک حد ہے، ایک پیمانہ ہے، اگر لبریز ہو جائے تو قوموں کی قومیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ اب لوگ پیدا تو اپنے اپنے وقت میں ہوئے تھے موت سب پر اکٹھی کیوں آئی؟ ایک بندے نے تو بیس، تیس، چالیس سال نافرمانی کی، بہت ظلم کیا لیکن جو نومولود تھے وہ کیوں ہلاک ہوئے؟ اس لیے کہ وہ بھی بڑے ہو کر انہی کے ساتھ شامل ہو جاتے لہٰذا انہیں بھی ساتھ ہلاک کر دیا گیا۔ گویا انسان کا ظلم اس کی نسلوں کو لے ڈوبتا ہے، آبادیوں کو تباہ کر دیتا ہے لیکن اللہ کے نظام کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ اُن کے بعد ہم نے دوسرے لوگ پیدا کر دیے جو اطاعت گزار تھے۔ جب اُن کی طرف انبیاؑ بھیجے تو انہوں نے اطاعت کی اور کامیابی پائی جبکہ نافرمانی کرنے والے تباہ کر دیے گئے۔ دنیا کا نظام رکا نہیں۔ اللہ نے اور مخلوق پیدا کر دی۔ نظامِ کائنات چل رہا ہے اور جب تک اللہ نے چلانا ہے یہ چلتا رہے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرنے والا یہ نہ سمجھے کہ دنیا اس کے دم سے قائم ہے کہ اللہ چاہے تو ہلاک کر دے اور نئی مخلوق پیدا کر دے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب عالی ہے کہ اللہ کی بات مخلوق تک پہنچا دیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بات پہنچا کر حق ادا کر دیا۔ اب جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرے یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات نہ مانے وہ اپنے آپ پر ظلم کرے گا۔ لوگوں کی نافرمانی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی نقصان نہیں ہوگا البتہ نافرمانی کرنے والے اپنے ساتھ ظلم کریں گے۔ پہلے بھی کتنی ہی قومیں ظلم کرنے پر تباہ کر دی گئیں تو کیا دنیا ویران ہو گئی؟ اُن کے بعد اور قومیں آ گئیں انسان باپ دادا کی بنائی ہوئی حویلیاں گرا کر نئے گھر بنا لیتا ہے تو کیا کبھی یہ سوچنا گوارا کرتا ہے کہ یہ حویلیاں بھی کبھی کسی نے بنائی تھیں۔ ان میں بھی کسی نے عمریں بسر کیں تھیں اب وہ کہاں گئے اور اُن کے جانے سے نظامِ کائنات کو کیا فرق پڑا؟ کچھ بھی فرق نہیں پڑا اور مسلمانو! اگر تم بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاداتِ عالی کی پروا نہیں کرو گے تو خود پر بہت ظلم کرو گے اور ہو سکتا ہے کہ تباہ ہو جاؤ اور اللہ کریم تمہاری جگہ پر اور لوگوں کو لے آئیں۔

عذاب سے بچنے کا واحد راستہ اطاعتِ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام ہے:

فرمایا: فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا یَرْكُضُوْنَ﴿۱۲﴾ پس جب انہوں نے ہمارے عذاب کو آتے دیکھا تو تب ہی اس سے بھاگنے لگے۔ جب لوگ ساری عمر نافرمانی کرتے رہے، آخر اللہ کی گرفت میں آ گئے اور جب عذابِ الٰہی کے آثار نظر آئے تو پھر کوشش کرنے لگے کہ کسی طرح اللہ کے عذاب سے بچ سکیں، کہیں بھاگ کر جان بچا لیں، دور جنگلوں میں نکل جائیں کہ شاید بچ جائیں۔ فرمایا: لَا تَرْكُضُوْا۔۔۔ اب مت بھاگو کہ یہ تمہیں بھاگنے نہیں دے گا۔ اس عذاب سے بچنے کا راستہ تو اتباعِ نبوت تھا، ایک ہی دروازہ تھا جس میں تم داخل ہی نہیں ہوئے تو اب کہاں بھاگتے ہو؟ وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِیْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ﴿۱۳﴾ بھاگو مت

اور اپنے سامانِ عیش کی طرف پلٹ آؤ اور اپنے (عمدہ) مکانوں کی طرف شاید تم سے (اس بارے میں) پوچھا جائے، یہ بڑے شاندار محل ہیں، مکان ہیں جو تم نے بڑی محنت سے بنائے اب ان میں بیٹھ کر دیکھو، اب چھوڑ کر کیوں بھاگتے ہو اور کہاں بھاگتے ہو؟ اس شاندار محل میں بھاگتے رہو اس نے تو تباہ ہونا ہے، دنیا کا میدان بھی تو ایک محدود جگہ ہے، Globe ہی ہے تو بھاگ کر کہاں جا سکتے ہو، اس نے تو خود تباہ ہو جانا ہے۔ عذاب سے نکلنے کا ایک ہی دروازہ تھا اطاعتِ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا، اس میں داخل ہو جاتے لیکن تم نافرمانی کرتے رہے۔ اب بیٹھو اپنے عالی شان مکانوں میں۔ اب تم سے پوچھا جائے گا کہ تم کیا کرتے رہے؟ تمہیں جواب دینا ہوگا، ثابت کرنا ہوگا کہ جو تم کرتے رہے وہ درست تھا اور جو اللہ کا نبیؑ بتا تا رہا وہ معاذ اللہ صحیح نہیں تھا۔ اب کہاں بھاگتے ہو اب کھڑے رہو اپنی بات پر اور جواب دو۔ وہ کہیں گے: قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿١٤﴾ وائے ہماری کمبختی! بے شک ہم ہی ظالم تھے۔ اس وقت کہیں گے کہ ہم برباد ہو گئے، ہم نے نبیؑ کی نافرمانی کر کے اپنے آپ کو تباہ کر لیا اور اپنے آپ پر بہت بڑا ظلم کر دیا۔ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ ۔۔۔ پھر وہ اسی طرح چیختے چلاتے رہے کہ ہم نے بڑا ظلم کیا اور اپنا وقت ضائع کر دیا۔ جو قبول کرنے کی باتیں تھیں انہیں چھوڑ دیا اور جو نہیں ماننی چاہیے تھیں، اُن کے پیچھے لگ گئے اور یوں عقائد اور اعمال تباہ کر لیے لیکن وہ رونا پیٹنا اُن کے کام نہیں آیا حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ ﴿١٥﴾ یہاں تک کہ ہم نے ان کو ایسے (نیست ونابود) کر دیا جیسے کھیتی کاٹ دی گئی (یا) آگ بجھ گئی ہو۔

کائنات کی تخلیق بلا مقصد نہیں:

فرمایا: وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ﴿١٦﴾ اور ہم نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، اس کو کھیل تماشے کے طور پر پیدا نہیں فرمایا۔ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ زمینوں، آسمانوں اور جو مخلوق اُن میں ہے اُن سب کی تخلیق محض کھیل کے طور پر نہیں کی گئی بلکہ اس سب کا ایک مقصد ہے اور ہر چیز اپنے انجام تک پہنچے گی۔ آسمانی قوتیں، سیارے، ستارے چاند اور سورج سب کی توجہ کا مرکز زمین ہے۔ کسی کے سبب سے روئیدگی ہے پیداوار ہو رہی ہے، کسی سے پھل پک رہے ہیں، بارش برستی ہے، ہوائیں چلتی ہیں۔ زمین کی بات آتی ہے تو فرمایا: هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۔۔۔ (البقرہ:29) وہی تو ہے جس نے زمین میں سب کچھ تمہارے لیے پیدا کیا۔۔۔ زمین وآسمان کی تمام مخلوق کا حاصل انسان ہے۔ زمین پر جو کچھ پیدا کیا گیا ہے وہ سب انسان کی خدمت کے لیے ہے۔ فلکی توجہات سے زمین پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں، سبزہ اور اناج، پھل اُگتے ہیں، سب انسان کی غذا ہیں۔ زمین پر جتنی مخلوق ہے، چرند پرند ہیں، جانور ہیں سب انسانیت کی خدمت پر مامور ہیں۔ گویا ساری

کائنات کو اللہ کریم نے ایک ایک انسان کی خدمت پر لگا رکھا ہے اور جب انسان کی بات آئی تو فرمایا، انسان کو میں نے اپنی معرفت کے لیے پیدا فرمایا۔ انسان کا مقصدِ حیات معرفتِ الٰہی کو پانا ہے اور جب یہ برزخ کی انتظار گاہ سے گزر کر حشر میں پہنچے گا تو یہ جانچا جائے گا کہ اس نے کس درجے کی معرفت حاصل کی اور کتنا وقت ضائع کر دیا۔ بعض انسانوں نے تو اتنی نافرمانی کی اتنے مظالم ڈھائے کہ وہ دنیا میں اپنی (مہلت) بھی پوری نہ کر سکے اور وہ اس طرح تباہ کیے گئے جیسے کسی پھلتی پھولتی کھیتی کو کاٹ دیا جاتا ہے یا جلتی ہوئی آگ کو بجھا دیا جاتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو کائنات کا اتنا وسیع، اتنا مضبوط اور محفوظ نظام جسے اتنی باریکی سے ترتیب دیا گیا ہے یہ محض کھیل تماشا تو نہیں ہے اور اللہ کریم نے یہ سب بلا مقصد تخلیق نہیں فرمایا بلکہ اس کا ایک انجام ہے اور ہر چیز اپنے نتیجے تک پہنچے گی۔

اللہ کی شان بہت بلند ہے:

فرمایا: لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿١٧﴾ اگر ہم چاہتے کہ ہم کھیل کی چیزیں (یعنی زن وفرزند وغیرہ) بنائیں تو اگر ہم کو یہی کرنا تھا تو ہم اپنے پاس سے ہی اُسے بنا لیتے۔ جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے اس کا معیار یہ ہے کہ وہ سب مخلوق کے لیے ہے جو کہ اللہ کی شان کو زیبا نہیں ہے۔ یہاں بعض مترجمین اور مفسرین حضرات نے لکھا ہے کہ اگر اللہ کا کوئی فرزند ہوتا، بیوی ہوتی تو چونکہ وہ اللہ کے ہوتے اُن میں بھی الوہیت ہوتی اور اُن کی عبادت کی جاتی۔ یہودی عزیر علیہ السّلام کو اللہ کا بیٹا کہتے تھے، عیسائی عیسیٰ علیہ السّلام کو اور بہت سے لوگ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں مانتے تھے۔ اب اگر یہ اللہ کی اولاد ہوتے تو پھر یہ خود عبادت کے مستحق ہوتے لیکن یہ سب تو خود اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور جہلاء ان کو اللہ کی اولاد کہتے ہیں۔ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ یہ زن وفرزند، خاندان یہ بھی ایک کھیل تماشا ہے جو اس کی شان کو زیبا نہیں ہے۔ یہ مخلوق کے لیے ہے اور ایسا تماشا ہے کہ یہ بندے کو اس طرح مصروف کر لیتا ہے کہ اس کی پوری زندگی اسی کی نذر ہو جاتی ہے۔ کھیل سے مراد ہی یہ ہے کہ ایک ایسا کام جو انسان کو اپنے میں جذب کر لے اور اس کا وقت گزر جائے۔ اللہ تعالیٰ ان چیزوں سے پاک اور بالاتر ہیں۔ اگر اللہ کا خاندان ہوتا تو اس کی شان کے مطابق ہوتا اور وہ بھی معبود ہوتا، اُن کی بھی عبادت کی جاتی کہ اُن میں بھی بنیادی طور پر الوہیت ہوتی۔ عیسائی مریم علیہ السلام کو اللہ کی بیوی اور عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں لیکن ان حضرات میں الوہیت نہیں تھی بلکہ وہ خود اللہ کی عبادت کرتے تھے۔ وہ عام انسانوں کی طرح رہتے تھے کھانا کھاتے تھے لباس پہنتے تھے ان میں تمام انسانی اوصاف تھے۔

مِٹنا باطل کا مقدر ہے:

فرمایا: بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ ؕ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُونَ ﴿۱۸﴾ نہیں بلکہ ہم حق کو باطل پر مارتے ہیں پھر وہ (حق) اس کا سر توڑ دیتا ہے پس وہ (باطل) نابود ہو جاتا ہے۔اور جو باتیں تم بناتے ہو اس سے تمہاری ہی خرابی ہے۔

اللہ کا قانون ہے کہ باطل جب بھی حد سے بڑھتا ہے تو اللہ کریم اس پر حق کی ضرب لگاتے ہیں جو اسے تباہ کر دیتی ہے۔ باطل ہمیشہ نہیں رہتا اس کے پاس محدود وقت ہوتا ہے اور ایک حد تک اسے برداشت کیا جاتا ہے۔ جب یہ اس حد سے بڑھنے لگتا ہے تو اللہ اس پر حق کو کھینچ مارتے ہیں جو اسے نابود کر دیتا ہے۔لوگو! تم جو باتیں بناتے ہو اور باطل پر بھروسہ کر کے اکڑتے ہو، سمجھ لو کہ باطل تو خود تباہ ہو جانے والا ہے، تمہاری مدد کیا کرے گا۔ مِٹنا تو باطل کا مقدر ہے اور اسے اپنا کر تم نے بھی اپنے لیے نامرادی اور تباہی خرید لی۔

قربِ الٰہی پانے والوں کا حال:

فرمایا: وَلَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ؕ وَمَنْ عِنْدَهُ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَلَا يَسْتَحْسِرُونَ ﴿۱۹﴾ اور جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے سب اُسی کا ہے (ان میں) جو اس کے قریب (فرشتے اور مقربانِ بارگاہ) ہیں وہ اس کی عبادت سے عار نہیں کرتے اور نہ تھکتے ہیں۔

کائنات کا ہر ذرّہ اللہ ہی کے لیے ہے اور جو اس کی بارگاہ میں بہت مقرب ہیں، مقرب فرشتے ہیں یا اس کے مقرب بندے ہیں اُن کا تو یہ حال ہے کہ اللہ کی عبادت سے سر ہی نہیں اٹھاتے اور عاجزی کے ساتھ جھکے رہتے ہیں۔ مقربینِ بارگاہ کبھی اپنی بڑائی میں مبتلا نہیں ہوتے بلکہ اللہ ہی کی عظمت کا اقرار کرتے ہیں اور اس کے سامنے سرنگوں رہتے ہیں، اس کی عبادت کرتے ہیں اور اطاعت کرتے ہیں۔ مقربین بارگاہ کا تو یہ حال ہے کہ اللہ کی عبادت سے تھکتے ہی نہیں یعنی ہمہ وقت عبادت میں لگے رہتے ہیں۔ جب یہ کہا جائے کہ فلاں اس کام سے تھکتا نہیں ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ اس کام کو کثرت سے کرتا ہے۔ اللہ کریم نے انسان کو ایسا دین عطا فرمایا ہے جس میں زندگی گزارنے کے وہ سلیقے اور طریقے ارشاد ہوئے ہیں کہ انسان کا سونا بھی عبادت ہو جاتا ہے اور جاگنا بھی عبادت ہو جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ گرامی کے مطابق جو عشاء کی نماز باجماعت ادا کرے پھر بیدار ہونے کے بعد فجر کی نماز باجماعت ادا کرے تو قیام اللیل کا ثواب پاتا ہے گویا ساری رات نماز میں ہی کھڑا رہا حالانکہ وہ سویا رہا تھا۔ گویا اس کا سونا بھی عبادت ہو گیا اور ثواب پا گیا۔ دنیا کا ہر وہ کام باعثِ ثواب ہے جو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی

کامل اطاعت میں کیا جائے اور وہ ہی دین ہے۔ یعنی تلاوت وتسبیحات جو پڑھتا ہے وہ تو ہیں ہی عبادت، ان کے علاوہ اُس کی زندگی کے باقی سب کام بھی عبادت بن جاتے ہیں۔

اللہ کریم فرماتے ہیں میرے مقربین تو میری عبادت میں ہی مشغول رہتے ہیں کبھی تھکتے ہی نہیں ہیں۔

فرمایا: یُسَبِّحُوْنَ الَّیْلَ وَالنَّھَارَ لَا یَفْتُرُوْنَ ﴿۲۰﴾ وہ رات اور دن (اس کی) پاکی بیان کرتے ہیں (اور) اکتاتے نہیں۔ رات دن یعنی ہمہ وقت وہ اللہ کا ذکر کرتے ہیں، اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں اور کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ وہ اکتا جائیں یا تھک جائیں کہ اب بہت ہو گیا اب طبیعت بھر گئی یا تھک گئے۔ اللہ کے مقربین کے دن بھر کے معمولات میں اللہ کی یاد ہمہ وقت موجود ہوتی ہے۔ جتنی گفتگو کرتے ہیں اس میں اللہ کی عظمت کا لحاظ رکھتے ہیں اور کوئی بات منہ سے ایسی ادا نہیں کرتے جو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ناپسندیدہ ہو۔ وہ کوئی ایسا کام نہیں کرتے جو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی کا سبب بنے اور ہمہ وقت اللہ کی یاد سے دل کو آباد رکھتے ہیں۔ اللہ کی یاد میں انہیں وہ لذتِ حضوری نصیب ہوتی ہے کہ پھر وہ عبادت سے کبھی تھکتے ہیں نہ اکتاتے ہیں۔

اللہ ہی معبودِ برحق ہے:

فرمایا: اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ﴿۲۱﴾ بھلا ان لوگوں نے زمین (کی چیزوں) سے معبود بنالیا ہے تو (کیا) وہ (مرنے کے بعد) اُن کو اٹھا کھڑا کریں گے؟ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ لوگوں نے اپنے خالق کو چھوڑ کر مخلوق کو معبود بنالیا ہے اور اتنا بھی نہیں سوچتے کہ کیا یہ زمینی مخلوق انہیں حشر میں کھڑا کرے گی یا پھر اللہ ایسا کریں گے؟ یہ معبودانِ باطلہ ان کا حساب لیں گے یا اللہ کریم نے حساب لینا ہے جبکہ وہ تو خود اللہ کے روبرو پیش ہو کر اپنا حساب دینے والے ہیں۔ اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کو معبود سمجھ کر اس کی خدمت اور اطاعت کرنے والا یہ کیوں نہیں سوچتا کہ جب اللہ نے قیامت میں اُسے اپنے روبرو بلا کر اس سے اعمال کا حساب لینا ہے اور اپنی دی ہوئی نعمتوں کی پرسش کرنی ہے تو پھر عبادت کا مستحق بھی وہ اکیلا ہی ہے۔

نظامِ کائنات اللہ کی توحید پر گواہ ہے:

فرمایا: لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا۔۔۔ اگر ان (آسمان اور زمین) میں اللہ کے سوا کوئی معبود ہوتا تو دونوں تباہ ہو جاتے۔ اللہ کو چھوڑ کر کسی مخلوق کو معبود بنانے والوں نے یہ تو سوچا ہوتا کہ اگر کائنات میں اللہ کے علاوہ کوئی اور معبود بھی ہوتا، کوئی اور حاکم بھی ہوتا جس کا حکم چلتا تو یہ کائنات تو اب تک تباہ ہو چکی ہوتی۔ زمین وآسمان میں اگر دو معبود ہوتے تو کہیں تو ان میں اختلاف پیدا ہوتا، ایک کہتا دن ہونا چاہیے، دوسرا کہتا رات ہونی

چاہیے۔ ایک حکم دیتا کہ بارش برسے دوسرا کہتا کہ دھوپ ہونی چاہیے، اسی طرح ہر معاملے میں اُن میں اختلاف ہو جاتا۔ اس کائنات کے نظام کی خوبصورت روانی اس بات کی گواہ ہے کہ اللہ واحد و لاشریک معبودِ برحق ہے۔ زمین کے ادنیٰ ذرّے سے لے کر ساری کائنات تک ہر شے ایک لگے بندھے مربوط نظام میں بلا چوں و چرا چلتی ہے۔ ہر ذرّہ قدرت کے طے شدہ اصولوں کے تحت اپنا کام سرانجام دے رہا ہے اور تحقیق کر کے دیکھ لو تو یہی بات ثابت ہوگی کہ ہر چیز ایک طے شدہ نظام میں اپنے فرائض ادا کر رہی ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سب کسی ایک ہی ہستی کے حکم کے تابع ہیں اور کوئی دوسرا اس کے مقابلے میں اختلاف رائے یا رکاوٹ ڈالنے والا ہے ہی نہیں۔ اللہ کے بنائے ہوئے نظام میں کوئی رخنہ ڈالنے والا نہیں ہے اس لیے کہ وہ وحدہٗ لاشریک ہے اس کا کوئی ثانی نہیں ہے، وہ بے مثل و بے مثال ہے۔ اگر کائنات میں دو معبود ہوتے تو یہ نظام اس روانی سے نہ چلتا بلکہ دونوں کے اختلافات کی نذر ہو چکا ہوتا اور تباہ ہو چکا ہوتا۔ فرمایا: فَسُبۡحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الۡعَرۡشِ عَمَّا يَصِفُوۡنَ ﴿۲۲﴾ سو اللہ جو عرش کا مالک ہے ان امور سے پاک ہے جو یہ لوگ بیان کر رہے ہیں۔

اللہ کی ذات بہت بلند، بہت پاک ہے اور سب تعریفیں اسی کے لیے ہیں، وہ ان لوگوں کی بنائی ہوئی خرافات سے بہت بالاتر ہے۔ اللہ عرش کا بھی ربّ ہے یعنی عرش کو بنانے اور قائم رکھنے والا اللہ ہے۔ ساری کائنات کا، ساری مخلوق کا قبلہ عرش ہے۔ جس طرح ملک میں ایک ادارہ Secretariat ہوتا ہے جہاں سارے ملک کی خبریں جاتی ہیں اور جہاں سے سارے احکامات صادر ہوتے ہیں اسی طرح کائنات کا سیکرٹیریٹ عرش ہے۔ عرش کائنات کا وہ مرکز ہے جہاں سے ساری کائنات کے لیے احکامات آتے ہیں، جہاں سے رزق اور روزی کے فیصلے صادر ہوتے ہیں، زندگی اور موت کے فیصلے آتے ہیں اور کائنات کا نظام چلتا ہے۔ لوگ کائنات کی کیا بات کرتے ہیں، وہ عرش جو کائنات کا مرکز ہے جہاں سے ساری کائنات کے لیے فیصلے صادر ہوتے ہیں۔ اللہ تو اس عرش کا بھی رب ہے، اس کی ذات پاک ہے اور کوئی دوسرا اس کا ثانی نہیں ہے۔ جو لوگ اللہ کے ساتھ معبود بناتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ وہ بتوں کو اس لیے پوجتے ہیں کہ یہ بت انہیں اللہ کا تقرب عطا کر دیں گے تو یہ اُن کی بنائی ہوئی خرافات میں۔ اللہ نے اپنے قرب کو پانے کے طریقے بنا دیے ہیں۔ اس کے لیے اللہ نے انسانوں کی طرف اپنے انبیاؑ مبعوث فرمائے، کتابیں نازل فرمائیں اور قربِ الٰہی کو تلاش کرنے کے طریقے بتا دیے۔ انسان خود سے کچھ طریقے ایجاد کر لے تو بات نہیں بنتی نہ ہی انسان کے ایجاد کردہ طریقوں سے قربِ الٰہی ملتا ہے۔

اللہ پر کوئی سوال نہیں کر سکتا:

فرمایا: لَا يُسۡـَٔلُ عَمَّا يَفۡعَلُ ۔۔۔ وہ جو کام کرتا ہے اُس سے پرسش نہیں ہو سکتی۔ اللہ کریم قادرِ مطلق

ہے، جو چاہے سو کرے اس پر سوال نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ وہ خود مالک ہے اور اس سے بڑا کوئی ہے ہی نہیں۔ سوال تو وہ پوچھ سکتا ہے جو بالا ہو۔ باز پرس تو وہ کرسکتا ہے جو اپنے سے بڑا ہو، اللہ کا تو کوئی ہمسر بھی نہیں ہے تو اُس سے بڑا کون ہوگا! وہ مالک ہے جو چاہے کرے، اس کی ذات کے مقابلے میں کوئی سوال کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔

مخلوق اپنی جوابدہی کی فکر کرے:

فرمایا: وَهُمۡ يُسۡـَٔلُونَ۝٢٣ اور ان سب سے (جو کام یہ کرتے ہیں) پوچھا جائے گا۔ ساری مخلوق سے باز پُرس ہوگی کہ اُس کے ذمّے کیا تھا اور اس نے کیا کیا۔ ایک ایک ذرّہ، ہوا کا ہر جھونکا، بارش کا ہر قطرہ اُس کی بارگاہ میں جواب دہ ہے، اسے اپنا جواب دینا ہے۔ مخلوق تو جوابدہی کے شکنجے میں ہے اس لیے انسان کو چاہیے کہ اُن باتوں کی فکر کرے جن کا جواب دینا ہے، اُن چیزوں پر توجہ دے جن کے بارے میں اس سے پوچھا جائے گا۔

شرک کرنے والوں سے ایک سوال:

فرمایا: اَمِ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اٰلِهَةً۔۔۔ کیا انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اور معبود بنائے ہیں؟ یعنی قدرت کی سب نشانیاں دیکھنے کے باوجود اگر یہ لوگ اللہ کے علاوہ دوسروں کو معبود بناتے ہیں اور اس پر اصرار کرتے ہیں کہ یہی دین ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم ان سے فرما دیجیے: قُلۡ هَاتُوۡا بُرۡهَانَكُمۡ۔۔۔ کہ اپنی دلیل پیش کرو۔ اگر تمہارے پاس کوئی عقلی یا نقلی دلیل ہے تو پیش کرو۔ یہ بھی یاد رہے کہ عقل کی اپنی مجبوری ہے کہ اُسے پروردگار کو ماننا پڑتا ہے۔ لہٰذا عقلاً کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جو شرک کے حق میں پیش کی جا سکتی ہو۔

یہ بہت عجیب بات ہے کہ اللہ کا انکار کسی نے نہیں کیا لیکن مانتے اپنے طریقے سے ہیں۔ کوئی کہتا ہے (معاذ اللہ) اس کی اولاد ہے، اس کی بیوی ہے کوئی فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتا ہے۔ مشرکین و کفار کے پاس ایک تصور تو ضرور تھا اللہ کا لیکن اس تصور کو کفر قرار دیا گیا ہے۔ گویا اللہ کو ویسا ماننا ضروری ہے جیسا اللہ کا نبیؐ منوائے اور یہ ہی ایمان ہے جبکہ از خود تصور گھڑ لینا ایمان نہیں ہے۔

فرمایا: هٰذَا ذِكۡرُ مَنۡ مَّعِىَ وَذِكۡرُ مَنۡ قَبۡلِىۡ۔۔۔ یہ (میری اور) میرے ساتھ والوں کی کتاب (یعنی قرآن) بھی ہے اور جو مجھ سے پہلے (پیغمبرؑ) ہوئے ہیں ان کی کتابیں بھی۔ فرمایا ان سے کہیے کہ تم عقلی دلیل بھی پیش نہیں کرسکتے اور نقلی بھی۔ جتنے نبیؑ آئے، جتنی کتابیں آئیں، جتنے صحیفے آئے اُن میں سے کسی نبیؑ کا یہ دعویٰ دکھاؤ کہ اس نے کہا ہو کہ اللہ کے علاوہ کوئی اور معبود بھی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ آدم علیہ السّلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السّلام تک ہر نبیؑ نے وحدتِ الٰہی کی دعوت دی۔ ہر نبیؑ کے کلمے کا بنیادی جز لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تھا، لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ آدمُ صَفِیُّ اللّٰہ، لَآ

اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ نُوْحٌ نَجِیُّ اللّٰهِ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اِبْرَاهِیْمُ خَلِیْلُ اللّٰهِ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اِسْمٰعِیْلُ ذَبِیْحُ اللّٰهِ۔

فرمایا: هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِیَ ۔۔۔ یہ قرآن جو میں لایا ہوں، یہ کتاب جو میرے ساتھ ہے اس میں سے دکھاؤ اگر کہیں کوئی دوسرا معبود ثابت ہوتا ہے، یا، وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِیْ ۔۔۔ جو کتابیں مجھ سے پہلے نازل ہوئیں اُن میں سے دیکھ کر بتاؤ اگر توحید سے ہٹ کر کوئی عقیدہ ہے؟ تمہارے پاس شرک کرنے کی نہ کوئی عقلی دلیل ہے نہ ہی کوئی نقلی دلیل ہے تو پھر تم کون سا مذہب اختیار کیے ہوئے ہو؟

گمراہی کا سبب:

فرمایا: بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۴﴾ بلکہ ان میں سے اکثر وہ ہیں جو امرِ حق کو نہیں جانتے پس اس وجہ سے وہ منہ پھیر رہے ہیں۔ ان لوگوں کی گمراہی کا سبب یہ ہے کہ یہ حق کو جانتے ہی نہیں اور محض اپنی تراشی ہوئی باتوں کی پیروی میں مشغول ہو کر حق سے منہ پھیرے بیٹھے ہیں۔

افسوس کہ آج یہ روّیہ مسلمانوں میں در آیا ہے کہ حق کی بجائے اپنی رائے پر چلتے ہوئے چھوٹے چھوٹے فرقوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے اکثریت کو حقیقت کا ادراک ہی نہیں ہے، دین سے غرض ہی نہیں ہے محض اپنے دھڑے پال رہے ہیں۔

فروعات میں اختلاف اور فرقہ بندی:

یاد رہے جہاں اصول کا اختلاف آ جاتا ہے وہاں فرقہ نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک الگ مذہب بن جاتا ہے اور وہ اسلام نہیں رہتا۔ جب عقائد میں فرق آ جائے، اللہ کی توحید کے عقیدے میں فرق آ جائے یا عقیدۂ رسالت میں فرق آ جائے۔ قرآن کے کتاب اللہ ہونے، آخرت اور فرشتوں کے بارے عقائد میں اگر فرق آ جائے تو پھر ایک الگ مذہب بن جاتا ہے۔ جو گروہ حق پر رہتا ہے وہ مسلمان ہے، جو ضروریاتِ دین میں اختلاف کرتا ہے وہ حق پر نہیں رہتا اور مسلمان نہیں رہتا، تو یہ فرقہ نہ ہوا بلکہ اسلام سے باہر کوئی مذہب ہو گیا۔

فرقے وہ ہیں جن کا اصول پر کوئی اختلاف نہیں ہے محض فروعات کی تشریحات و تفصیلات میں اختلاف ہے۔ فروعات کے اختلاف سے کوئی اسلام سے خارج نہیں ہوتا، سب مسلمان ہی رہتے ہیں مثلاً اہلِ حدیث حضرات بالجہر آمین کہتے ہیں اور ہر تکبیر پر رفع یدین کرتے ہیں۔ اب اصول میں تو کوئی اختلاف نہیں ہے کہ نماز میں سورت فاتحہ کے بعد آمین کہنے کا حکم موجود ہے۔ اس کی تشریحات میں فرق ہے کوئی کہتا ہے دل میں کہنا چاہیے، کوئی بلند آواز سے کہنے کو ترجیح دیتا ہے، لیکن آمین کہنا سب کے لیے ضروری ہے کہ یہ اصول ہے اور سب کہتے ہیں تو پھر یہ

فرقہ بندی تو نہ ہوئی۔ اسی طرح رفع یدین یعنی تکبیر پر ہاتھ اٹھانے کا حکم موجود ہے۔ ہر مکتب فکر مانتا ہے۔ اگر ہر تکبیر پر ہاتھ نہیں بھی اٹھاتا تو کم از کم تکبیر اولی پر تو ہر کوئی ہاتھ اٹھاتا ہے تو یہ فرق تو محض تشریح کا ہے کہ صرف ایک تکبیر پر ہاتھ اٹھانا کافی ہے یا ہر تکبیر پر اٹھایا جائے۔ اصول پر تو سب متفق ہیں کہ تکبیر پر ہاتھ اٹھائے جائیں۔

آج ہم نے جو فرقے بنا لیے ہیں شافعی، مالکی، حنبلی، حنفی، بریلوی، دیوبندی، اہل حدیث مقلد غیر مقلد وغیرہ یہ فرقے نہیں ہیں کیونکہ یہ سب اصول کے پابند ہیں اور فروعات میں اختلاف رکھتے ہیں جس سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن یہ یکجہتی تو صرف تب ممکن ہے جب ہمارا مقصد دین ہو۔ جب ہمارا مقصد ہی دھڑے بندی ہوگا تو پھر یہ سب ہی فرقے بن جائیں گے پھر مسجدیں بھی تقسیم ہو جاتی ہیں کہ یہ اہلِ حدیث کی مسجد ہے، یہ بریلویوں کی مسجد ہے، یہ دیوبندیوں کی مسجد ہے۔ اس کے ساتھ ہی اکابر بھی تقسیم کر دیے جاتے ہیں کہ یہ فلاں بزرگ دیوبندیوں کا ہے لہٰذا میں اس کی عزت نہیں کرتا یا فلاں بزرگ بریلویوں کا ہے میں اس کو نہیں مانتا۔ لیکن افسوس ہے کہ کوئی یہ سوچنے کا تکلف بھی نہیں کرتا کہ بریلوی اور دیوبندی دو مدرسے ہیں جو لگ بھگ ایک صدی اور دس یا بیس سال پرانے ہیں۔ اسلام تو ساڑھے چودہ صدیاں پرانا ہے تو جب یہ مدرسے نہیں تھے تب مسلمان کیا کرتے تھے؟ یہ سوچنا چاہیے لوگوں کو کہ جب یہ مدارس نہیں تھے تو کوئی بھی دیوبندی یا بریلوی نہیں تھا، پھر وہ کیا تھے؟ دیوبندی سے مراد ہے کہ وہ دیوبند مدرسے کا پڑھا ہوا، بریلوی سے مراد ہے بریلی کا پڑھا ہوا، تو جنہوں نے ان مدارس میں قدم بھی نہیں رکھا وہ آج ڈنڈے لیے پھرتے ہیں اور فرقے بنائے بیٹھے ہیں، اپنی اپنی پارٹی بنالی ہے اور دین سے انہیں کوئی غرض نہیں ہے۔ جیسے ہم دیکھتے ہیں کہ جو علی گڑھ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کرے وہ اپنے نام کے ساتھ علیگ لکھتا ہے، اب جو علی گڑھ سے پڑھا ہی نہیں کیا وہ اپنے نام کے ساتھ علیگ لکھے گا؟ یہی بات قرآن ارشاد فرما رہا ہے کہ لوگ دین تلاش نہیں کرتے، حق سے نا آشنا ہیں اور ہم سے منہ پھیر کر دھڑے بندی میں مشغول ہیں۔ افسوس کہ یہ بات تو کفار کی حالتِ زار کی ہو رہی تھی کہ وہ حق کو سمجھتے نہیں ہیں اور محض اپنے تراشے ہوئے عقائد کے مطابق فرقے بنا لیے ہیں اور حق کے مقابلے میں اپنے اپنے فرقے کی تائید کرتے ہیں۔ یہی آج کے دور کی بدنصیبی ہے کہ مسلمان بھی اس روش کو اپنائے ہوئے ہیں ہر ایک نے اپنا اپنا فرقہ بنالیا ہے اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ خود کو حق پر اور دوسروں کو مسلمان تک ماننے کو تیار نہیں ہے۔ قرآن اس روّیے کو جہالت کہتا ہے کہ یہ حق سے نا آشنائی ہے، بے رخی ہے۔

جائے عبرت ہے!

تقسیم برصغیر سے پہلے زیادہ تر دکانیں ہندوؤں اور سکھوں کی ہوتی تھیں۔ مسلمان تجارت کی طرف کم ہی توجہ کرتے تھے اس لیے دیہات میں بھی اور شہروں میں بھی مسلمانوں کی دکانیں کم ہوتی تھیں۔ مساجد کے ساتھ، گلی

کے پار اکثر ہندوؤں کی دکانیں ہوتی تھیں کہ وہ جانتے تھے کہ مسلمان دن میں پانچ وقت مسجد آئیں گے تو کچھ تو خرید لیں گے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ایسا ایک واقعہ سنایا کہ کسی گاؤں کی مسجد کے پڑوس میں ایک ہندو کی دکان تھی۔ اس مسجد میں جو مولوی صاحب نماز پڑھاتے تھے اُن سے لوگوں کا جھگڑا ہو گیا انہوں نے کہا کہ ان کو ہٹا دیا جائے اور ان کی جگہ ایک دوسرے مولوی صاحب کو لے آئے۔ اب حال یہ ہوا کہ کچھ لوگ پرانے مولوی صاحب کے حق میں ہو گئے اور کچھ نئے مولوی صاحب کے لیے اصرار کرنے لگے چنانچہ وہاں دو جماعتیں کرائی جانے لگیں۔ نئے مولوی صاحب کے ساتھ زیادہ لوگ پڑھنا شروع ہو گئے جبکہ پہلے والے مولوی صاحب کی اقتدا میں نماز پڑھنے والوں کی تعداد خاصی کم ہو گئی۔ یہ بات اس ہندو دکاندار نے بھی محسوس کی کیونکہ ان مولوی صاحب سے ہندو دکاندار کی دوستی تھی کہ وہ اکثر فارغ ہو کر اس کی دکان پر بیٹھا کرتے تھے۔ ایک دن مولوی صاحب ہندو کی دوکان پر بیٹھے تھے تو وہ ہندو اُن سے کہنے لگا کہ مولانا! ہم گھر کے بیس پچیس افراد بنتے ہیں کچھ میرے بیٹے ہیں، بھائی ہیں بھتیجے ہیں اور اُن کی اولاد ہے۔ اب ہمیں وضو یا نماز تو نہیں آتی لیکن اگر آپ کہیں تو جب آپ کی جماعت ہو رہی ہو تو ہم آپ کے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔ اس طرح دوسروں سے آپ کی 'پال' تو بڑی ہو جائے گی کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ دوسرے مولوی کے پیچھے لمبی 'پال' ہوتی ہے۔ آپ ہمیں اجازت دیں تو ہم آپ کی 'پال' تو کم از کم بڑی کر دیں گے۔

کیا آج بھی مولوی نما جاہل یہی کچھ نہیں کر رہے؟

تکمیل نبوت پر ایک دلیل:

فرمایا: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴿۲۵﴾

اور جو بھی پیغمبر ہم نے آپ سے پہلے بھیجے تھے ان کی طرف یہی وحی بھیجی، کہ میرے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں لہٰذا میری ہی عبادت کرو۔ یہاں یہ فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم سے پہلے ہم نے جتنے نبیؐ بھیجے، یہ نہیں فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد بھی جو نبی آئے گا۔ اگر نبوت بعد میں ہوتی تو یہاں کچھ اس طرح سے ارشاد ہوتا کہ جو نبی علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلّم سے پہلے آئے ہیں یا جو نبیؐ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد آئے گا سب یہ بات کہیں گے۔ لیکن یہاں بعد کا ذکر نہیں ہے۔ جتنے نبیؐ آنے تھے سب آپ صلی اللہ علیہ وسلّم سے پہلے تشریف لا چکے ہیں۔ آدم علیہ السلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک تمام انبیاؑ تشریف لا چکے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلّم سے پہلے جتنے رسول تشریف لائے اُن پر یہی وحی کی گئی کہ اللہ کی ذات کے علاوہ کوئی دوسرا عبادت کے لائق نہیں ہے لہٰذا سب صرف اللہ ہی کی عبادت کرو اللہ ہی کو معبودِ برحق مانو۔ اللہ ہی کو اپنا

حاجت روا مشکل کشا مانو اور اللہ ہی کی بارگاہ میں اپنی ساری گزارشات پیش کرو اور اللہ ہی سے سب کچھ مانگو۔ اللہ کی تعریف اور کبریائی بیان کرو اور اس کی بارگاہ میں رکوع و سجود کرو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثتِ عالی سے پہلے جتنے انبیاؑ و رسلؑ تشریف لائے، سب نے یہی بات کی لہٰذا جس امر پر تمام انبیاؑ متفق ہیں تو پھر اس میں مزید جستجو کی گنجائش کہاں رہتی ہے۔

ایک ضمنی بات:

یہاں ضمناً ایک بات آ گئی کہ آج کل یہ بہت بحث کی جاتی ہے کہ داڑھی رکھنا اس دور کا رواج تھا جس دور میں آپ صلی اللہ علیہ وسلّم مبعوث ہوئے۔ اس زمانے میں ہر شریف بندہ یا معزز بندہ داڑھی رکھ لیتا اور یہ بہت عرصے تک رہا۔ عیسائیوں میں بھی یہ رواج رہا اور اُن کے چہارم پنجم بادشاہوں تک بھی یہ جاری تھا پھر بعد میں نہ رہا۔ بحث کرنے والے کہتے ہیں کہ یہ رواج تھا جسے عرب اور عیسائی تک اپنائے ہوئے تھے لہٰذا داڑھی رکھنا اتنا ضروری نہیں ہے، اس وقت کا رواج تھا بعد میں نہیں رہا تو کیا ہوا!

یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ داڑھی رکھنا بعثتِ عالی کے دور میں مروجہ عمل تھا لیکن جب آدم علیہ السّلام مبعوث ہوئے کیا تب بھی رواج تھا؟ ان سے پہلے تو کوئی تھا ہی نہیں تو رواج کس کا تھا؟ آدم علیہ السّلام سے لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم تک کوئی ایک نبیؑ ایسا نہیں جس کی داڑھی نہ ہو۔ تمام انبیاؑ، اولوالعزم رسولؑ سب باریش تھے، اگر یہ سارا رواج ہی تھا تو پھر ہم وہ رواج کیوں نہ اپنائیں جس رواج کو تمام انبیاؑ نے اپنایا؟ جس رواج پر سارے نبیؑ اور رسولؑ متفق رہے ہمیں بھی وہی اپنانا چاہیے۔ ہم کیوں انبیاؑ کو چھوڑ کر کفار کا رواج اپنائیں۔

اللہ کی ذات بہت پاک ہے:

فرمایا: وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ اور کہتے ہیں کہ رحمٰن (اللہ) نے کسی (یعنی فرشتوں) کو اولاد بنا رکھا ہے۔ وہ اس سے پاک ہے بلکہ وہ (فرشتے اس کے) معزز بندے ہیں۔

ذرا ان کی عقل دیکھو! کہتے ہیں، رحمٰن (اللہ) کی اولاد ہے! ارے جاہلو! کوئی کرنے کی بات کرو۔ اللہ پاک ہے رحمٰن ہے، اس کے برابر دوسرا کوئی رحم کرنے والا نہیں ہے اور تم کہتے ہو کہ اس کی اولاد ہے۔ اگر اس کی اولاد ہوتی تو وہ بھی رحمٰن ہوتی، وہ بھی اِلٰہ ہوتی جبکہ اس کے علاوہ نہ تو کائنات میں کوئی اِلٰہ ہے نہ ہی کوئی رحمٰن۔ رحمٰن سے مراد وہ ہستی ہے جو بلا امتیاز سب پر مہربان ہے جو ہر ذرّے کو وجود بخشتی ہے، اُسے رزق دے رہی ہے پال رہی ہے۔ یہ اس کی رحمانیت ہے۔ حتیٰ کہ کافر و مشرک کو پیدا کرنا، وجود بخشنا، انسانی خصوصیات دینا، روزی دینا، اولاد دینا اس کی

رحمانیت ہے۔ اللہ کے علاوہ تو کوئی ایسا رحمٰن نہیں ہے جو کسی ایک ذرّے کی تخلیق ہی کرے یا اسے رزق دے اور پرورش کرے۔ اگر اس کی اولاد ہوتی تو وہ بھی الرحمٰن ہوتی پھر وہ بھی اِلٰہ ہوتی، معبود ہوتی۔ اللہ ان باتوں سے پاک ہے، بہت بلند ہے۔ بلکہ جتنی مخلوق ہے، مقرب فرشتے بھی اس کے اطاعت گزار بندے ہیں اور انبیاؑ اور رسلؑ بھی اس کی بارگاہ میں اطاعت گزار بندے ہیں۔ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ۝۲۷ وہ اس سے آگے بڑھ کر بول نہیں سکتے اور وہ اس کے ارشاد پر عمل کرتے ہیں۔ جو حکم بھی اللہ کی طرف سے ارشاد ہو جائے یہ ہستیاں (یہ بندے) اس سے اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتے۔ اس کی بات پر اپنی بات نہیں بڑھا سکتے بلکہ سب اس کے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ فرمایا: يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ۝۲۸ وہ (اللہ) اُن کے اگلے اور ان کے پچھلے احوال سے باخبر ہے اور اس کی مرضی کے بغیر وہ کسی کی سفارش تک نہیں کر سکتے اور وہ سب اس کی ہیبت سے ڈرتے ہیں۔ اللہ کریم ہر بات سے آگاہ ہے۔ جو کچھ ان سے پہلے ہو چکا اور جو ان کے بعد ہوگا۔ جو انہوں نے کیا، جو ان سے رہ گیا، ہر چیز سے اللہ کریم باخبر ہے۔ اس کے مقربین فرشتے ہوں، انبیاؑ، رسولؐ یا اہل اللہ، اولیاء ہوں، وہ کسی کی سفارش نہیں کرتے، کسی کے حق میں لب کشائی نہیں کرتے سوائے ان کے جن کی سفارش کے لیے اللہ نے اجازت دی۔ یعنی یہ ہستیاں صرف ایمان والوں کی سفارش کریں گی، کفار کی سفارش نہیں کریں گے۔ کفار و مشرکین انبیاؑ کے بت بنا کر انہیں پوجتے ہیں، اولیاء اور صلحاء کے بت بنا لیتے ہیں فرشتوں کو پوجتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ یہ ہستیاں اللہ سے ان کی سفارش کریں گی۔ کافروں کو ان کی سفارش سے خوش نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ کافر کی سفارش نہیں کریں گے کہ اس کی اجازت نہیں ہوگی۔ قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ کفار ان کی پوجا اس لیے کرتے:

اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۔۔۔ (الزمر: 3) کہ یہ انہیں اللہ کا مقرب بنا دیں گی لیکن یہ ہستیاں کفار کے لیے ہرگز سفارش نہیں کریں گی۔ کفار کے لیے کوئی بھی لب کشائی نہیں کرے گا۔ اللہ کی اجازت سے اللہ کریم کے مقرب بندے، فرشتے، اللہ کی عبادت، نماز، روزہ، تلاوتِ قرآن یہ ساری چیزیں مومن کے لیے سفارش کریں گی۔ ارشاد ہو رہا ہے کہ یہ ہستیاں ہمہ وقت خشیتِ الٰہی سے لرزاں و ترساں رہی ہیں، ڈرتی ہیں۔ جتنا جس کو قرب نصیب ہوتا ہے اتنا ہی وہ مؤدب ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے افکار اپنی زبان اور کردار کو اتنا قابو میں کر لیتا ہے اور اتنا ہی زیادہ ڈرتا ہے۔ گویا خشیتِ الٰہی کے لیے عبادتِ الٰہی ضروری ہے۔ عبادات سے، رزق حلال کمانے اور کھانے سے، پوری زندگی کو عبادت میں ڈھال لینے سے قربِ الٰہی نصیب ہوتا ہے اور جتنا قرب نصیب ہوتا ہے۔ خشیتِ الٰہی اتنی ہی بڑھتی چلی جاتی ہے۔

امرِ محال:

مخلوق میں سب سے زیادہ قربِ الٰہی نبیؐ کو نصیب ہوتا ہے اور ان میں بھی پھر اپنے اپنے درجات ہیں۔ سب انبیاؑ کو وحیٔ الٰہی نصیب ہوئی کسی کو براہِ راست کلام نصیب ہوا سب ہی مقربانِ بارگاہ تھے لیکن: وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿٢٩﴾ (بالفرض المحال) ان میں جو شخص یوں کہے کہ میں اس (اللہ) کے سوا عبادت کا مستحق ہوں تو اُسے ہم دوزخ کی سزا دیں گے۔ ظالموں کو ہم ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔

جو لوگ نبیؐ کو اللہ کا بیٹا قرار دے کر پوجا کرتے ہیں اُن کا کیا انجام ہوگا جبکہ اگر نبیؐ بھی (بالفرض محال) یا مقربانِ بارگاہ میں سے کوئی یہ دعویٰ کر دے کہ میں معبود ہوں، میری عبادت کرو تو فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ اسے بھی جہنم میں ڈال دے گا۔ یہاں امرِ محال کی مثال دی گئی ہے کہ اللہ کے مقربین سے یہ محال ہے کہ وہ ایسی بات کہیں کہ میری عبادت کرو اور جو ان ہستیوں کی پوجا کرنا شروع کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان ہستیوں نے ہمیں ایسا حکم دیا ہے۔ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ یہ محال ہے کہ اللہ کا کوئی مقرب یہ کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر میری عبادت کرو لیکن اگر ایسا کہے تو اللہ قادر ہے اسے بھی جہنم میں بھیج دے تو تم لوگ جو غیر اللہ کی پرستش، عبادت پر لگے ہوئے ہو، تم کس کھیت کی مولی ہو کہ تم عذاب سے بچ جاؤ گے۔ غیر اللہ کی عبادت ظلم ہے اور ظالموں کی سزا جہنم ہے لہٰذا اس پر غور کرو۔ اللہ کو واحد ولاشریک مانو۔ اللہ کو ویسا مانو جیسا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم منواتے ہیں۔

فقہاء کی وضاحت:

سچ تو یہ ہے کہ یہ مسلمانی کافی نہیں ہے کہ جو سنا وہی مان لیا اور زندگی اسی پر گزار دی بلکہ یہ سوچنا چاہیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے اللہ کو کیسا ماننے کا حکم دیا ہے۔ فقہاء نے اس کی تشریح کر دی ہے کہ جب بچے کو اللہ کا تصور دو تو اُسے سمجھاؤ کہ میں اللہ کو مانتا ہوں اور ویسا مانتا ہوں جیسا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم منواتے ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم جو حضرت عبداللہ کے فرزند تھے اور مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے، ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو اللہ کو، جیسا وہ صلی اللہ علیہ وسلّم منواتے ہیں میں اللہ کو ویسا مانتا ہوں۔ یعنی اپنی طرف سے اللہ کے بارے میں کوئی تصور گھڑ لینا کافی نہیں ہے بلکہ اللہ کی ذات اور صفات کے متعلق وہ عقیدہ ضروری ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے تعلیم فرمایا۔

سورۃ الانبیآء رکوع 3 آیات 30 تا 41

اَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَوَلَمۡ يَرَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ كَانَتَا رَتۡقًا
فَفَتَقۡنٰهُمَا ؕ وَجَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ كُلَّ شَىۡءٍ حَىٍّ ؕ اَفَلَا يُؤۡمِنُوۡنَ ۝۳۰
وَجَعَلۡنَا فِى الۡاَرۡضِ رَوَاسِىَ اَنۡ تَمِيۡدَ بِهِمۡ ۖ وَجَعَلۡنَا فِيۡهَا فِجَاجًا سُبُلًا
لَّعَلَّهُمۡ يَهۡتَدُوۡنَ ۝۳۱ وَجَعَلۡنَا السَّمَآءَ سَقۡفًا مَّحۡفُوۡظًا ۖۚ وَّهُمۡ عَنۡ اٰيٰتِهَا
مُعۡرِضُوۡنَ ۝۳۲ وَهُوَ الَّذِىۡ خَلَقَ الَّيۡلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ ؕ كُلٌّ
فِىۡ فَلَكٍ يَّسۡبَحُوۡنَ ۝۳۳ وَمَا جَعَلۡنَا لِبَشَرٍ مِّنۡ قَبۡلِكَ الۡخُلۡدَ ؕ اَفَا۟ٮِٕنۡ مِّتَّ
فَهُمُ الۡخٰلِدُوۡنَ ۝۳۴ كُلُّ نَفۡسٍ ذَآٮِٕقَةُ الۡمَوۡتِ ؕ وَنَبۡلُوۡكُمۡ بِالشَّرِّ وَالۡخَيۡرِ
فِتۡنَةً ؕ وَاِلَيۡنَا تُرۡجَعُوۡنَ ۝۳۵ وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اِنۡ يَّتَّخِذُوۡنَكَ اِلَّا
هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِىۡ يَذۡكُرُ اٰلِهَتَكُمۡ ۚ وَهُمۡ بِذِكۡرِ الرَّحۡمٰنِ هُمۡ
كٰفِرُوۡنَ ۝۳۶ خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ مِنۡ عَجَلٍ ؕ سَاُورِيۡكُمۡ اٰيٰتِىۡ فَلَا
تَسۡتَعۡجِلُوۡنِ ۝۳۷ وَيَقُوۡلُوۡنَ مَتٰى هٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۝۳۸ لَوۡ
يَعۡلَمُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا حِيۡنَ لَا يَكُفُّوۡنَ عَنۡ وُّجُوۡهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَنۡ
ظُهُوۡرِهِمۡ وَلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ ۝۳۹ بَلۡ تَاۡتِيۡهِمۡ بَغۡتَةً فَتَبۡهَتُهُمۡ فَلَا
يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ رَدَّهَا وَلَا هُمۡ يُنۡظَرُوۡنَ ۝۴۰ وَلَقَدِ اسۡتُهۡزِئَ بِرُسُلٍ مِّنۡ
قَبۡلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيۡنَ سَخِرُوۡا مِنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ۝۴۱

کیا کافروں نے نہیں دیکھا (یعنی جانتے نہیں) کہ آسمان اور زمین ملے ہوئے تھے تو ہم نے ان کو جدا جدا کر دیا اور ہم نے (بارش کے) پانی سے ہر جاندار چیز بنائی کیا پھر بھی ایمان نہیں لاتے؟ ﴿۳۰﴾ اور ہم نے زمین میں اس لیے پہاڑ بنائے کہ ان لوگوں کو لے کر ہلنے (نہ) لگے اور ہم نے اس میں کشادہ رستے بنائے تاکہ (ان کے ذریعے) وہ (اپنی) منزل پر پہنچیں ﴿۳۱﴾ اور ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا اور یہ لوگ اس (کے اندر) کی نشانیوں سے منہ پھیرے ہوئے ہیں ﴿۳۲﴾ اور وہ ایسا ہے کہ اس نے رات اور دن اور سورج اور چاند بنائے یہ سب آسمان میں (اس طرح چلتے ہیں گویا) تیر رہے ہیں ﴿۳۳﴾ اور ہم نے آپ سے پہلے کسی بشر کے لیے ہمیشہ رہنا تجویز نہیں فرمایا پھر اگر آپ کا انتقال ہو جائے تو کیا یہ لوگ (دنیا میں) ہمیشہ رہیں گے؟ ﴿۳۴﴾ ہر جاندار موت کا مزہ چکھے گا اور (لوگو!) ہم تم کو بری اور بھلی (حالتوں) میں خوب آزماتے ہیں اور تم ہماری طرف ہی لوٹ کر آؤ گے ﴿۳۵﴾ اور جب کافر لوگ آپ کو دیکھتے ہیں تو آپ کا مذاق اڑاتے ہیں (کہتے ہیں) کیا یہی شخص ہے جو تمہارے معبودوں کا ذکر (برائی سے) کرتا ہے اور (خود) یہ لوگ رحمٰن (اللہ) کے ذکر کے منکر ہیں ﴿۳۶﴾ انسان (ایسا جلد باز ہے گویا) جلد بازی سے بنایا گیا ہم عنقریب تم لوگوں کو اپنی نشانیاں دکھا دیں گے تو تم جلدی نہ کرو ﴿۳۷﴾ اور وہ کہتے ہیں یہ وعدہ (جس عذاب کی آپ خبر دیتے ہیں) کب تک آئے گا اگر آپ سچے ہیں تو؟ ﴿۳۸﴾ اے کاش! کافر اس وقت کو جانیں جب وہ اپنے چہروں پر سے آگ کو روک نہ سکیں گے اور نہ اپنی پیٹھوں پر سے اور نہ ان کی کوئی مدد کی جائے گی ﴿۳۹﴾ بلکہ ان پر (قیامت) ناگہاں واقع ہوگی سو اُن کو بدحواس کر دے گی پھر نہ وہ اس کو ہٹا سکیں گے اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی ﴿۴۰﴾ اور بے شک آپ سے پہلے پیغمبروں کا بھی مذاق اڑایا گیا تو ان میں سے جن لوگوں نے مذاق اڑایا تھا سو اُن پر وہ (عذاب) واقع ہو گیا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے ﴿۴۱﴾

تفسیر ومعارف

نظامِ کائنات کی ابتدا:

فرمایا: اَوَلَمۡ یَرَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ کَانَتَا رَتۡقًا فَفَتَقۡنٰهُمَا ؕ ۔۔۔کیا کافروں نے نہیں دیکھا (یعنی جانتے نہیں) کہ آسمان اور زمین ملے ہوئے تھے تو ہم نے ان کو جدا جدا کر دیا۔

ابتدا میں زمین اور آسمان ملے ہوئے تھے یعنی ایک ہی شے تھے اور ان میں کسی اور حیات کا تصور نہیں تھا۔ پھر اللہ کریم نے انہیں الگ کر دیا۔ لہٰذا زمین بچھا دی گئی اور آسمان کی چھت بنا دی گئی تو اللہ کے حکم سے سارا نظام چل پڑا۔ ہوائیں چلنا شروع ہو گئیں، بادل بننے لگے، بارشیں برسنے لگیں اور روئیدگی پیدا ہوئی۔ جانور پیدا کیے گئے، انسان کو پیدا کیا گیا اور زندگی رواں دواں ہوگئی۔ فرمایا، کفار کی تحقیق بھی تو یہیں تک پہنچتی ہے کہ یہ سب کس نے کیا ہے۔ اتنا بڑا نظام از خود تو نہیں بنتا۔ اللہ کریم فرما رہے ہیں کہ ہم نے زمین و آسمان کو الگ کر کے حیات کا ایک باب کھول دیا کہ جب یہ ملے ہوئے تھے تو کسی حیات کا تصور نہیں تھا۔

حیات کا دارومدار پانی پر رکھا:

فرمایا: وَجَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ کُلَّ شَیۡءٍ حَیٍّ ۔۔۔اور ہم نے (بارش کے) پانی سے ہر جاندار چیز بنائی۔ اللہ کریم نے پانی کو زندگی کا بنیادی عنصر بنا دیا۔ زمین پر جتنے جاندار بستے ہیں خواہ نباتات ہوں حیوانات ہوں سب کی حیات کا دارومدار پانی پر ہے۔ زمین میں بیج ڈالیں تو نمی کی ضرورت ہوگی اور نمی ہوگی، پانی ہوگا تو روئیدگی ہوگی۔ جاندار چیزوں کی بنیاد ایک قطرے پانی پر رکھ دی گئی اور پھر جب تک وہ زندہ رہتا ہے پانی اس کی بنیادی ضرورت رہتا ہے۔

اللہ کی عظمت پر دلیل ہے:

قرآنِ حکیم نے جو حقائق ارشاد فرمائے، آج ساڑھے چودہ سو سال بعد سائنس وہاں پہنچ پائی ہے۔ یہ کفار بھی جانتے ہیں کہ اتنا بڑا نظام از خود تو نہیں بن سکتا۔ ایک چھوٹے سے پودے کو دیکھیں تو اس میں بھی یہ نظام موجود ہے کہ جڑ خوراک حاصل کرتی ہے، پھر وہ پتوں میں جاتی ہے اور ہر پتے میں ایک کارخانہ لگا ہوا ہے، جہاں وہ خوراک بنتی ہے پکتی ہے اور پھر تقسیم بھی ہوتی ہے۔ پودے کے ہر جز کو اس کی حصے کی خوراک پہنچائی جاتی ہے اور جس شاخ پر پھل یا پھول بننا ہے تو وہ حصہ شاخ سے الگ ہو کر اس طرف چلا جاتا ہے اور پھل یا پھول بنتا ہے۔ تو ایک ادنیٰ سے پودے

سے لے کر ہر جاندار میں یہ نظام موجود ہے کہ وہ غذا لیتا ہے وہ اس کے وجود میں جا کر پکتی ہے اور سارے وجود کی حیات کا سبب بنتی ہے۔اس غذا کے اجزا بنتے ہیں جن سے خون بھی بنتا ہے، ہڈیاں بھی بنتی ہیں۔ دماغ، زبان، آنکھوں میں بینائی الغرض تمام اعضائے بدن کو اُن کا حصہ تقسیم ہو کر پہنچتا ہے اور پھر اللہ کریم نے سب کی حیات کا سبب پانی کو بنا دیا ہے۔اب اگر کافر سمجھتے ہیں کہ یہ سارا نظام اللہ کریم نے نہیں بنایا تو وہ اس نظام کو بدل کر دکھا دیں۔ یہ اس نظام کو تبدیل کر کے دکھا دیں تا کہ پتا چلے کہ یہ تو کوئی اور بھی کر سکتا ہے۔ اگر نہیں بدل سکتے تو: اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۰﴾ پھر انہیں عظمتِ الٰہی کا اقرار کرنا چاہیے، تو پھر یہ ایمان کیوں نہیں لاتے؟

اللہ کریم نے جاندار چیزوں کی زندگی کی بنیاد ایک قطرہ پانی پر رکھ دی جس سے وجود بنتا ہے اور جب تک زندہ رہتا ہے پانی اس کی بنیادی ضرورت رہتا ہے۔ کسی درخت کو پانی نہ ملے تو وہ سوکھ جائے گا۔انسان کو پانی نہ ملے تو وہ مر جائے گا۔ انسان کے وجود میں پانی کی کمی ہو جائے تو وہ زیادہ دیر تک اس کمی کو برداشت نہیں کر سکتا، چل پھر نہیں سکے گا، گر جائے گا۔ مر جائے گا۔ کسی جانور کو پانی نہ ملے تو وہ مر جائے گا۔ اگر کفار سمجھتے ہیں کہ یہ سارا نظام اللہ کریم کا بنایا ہوا نہیں ہے تو وہ اس نظام کو بدل دیں اور ایسا کر دیں کہ زندگی کا مدار پانی پر نہ رہے۔ اگر وہ کر سکتے ہیں تو زمین اور آسمان کو پھر سے ملا دیں۔ زمین پر روئیدگی کو روک سکتے ہیں تو روک دیں، ہوا کو چلنے سے روک سکتے ہیں تو روک دیں۔ اگر کچھ کر سکتے ہیں تو کر کے دکھائیں۔

یہی بات حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے نمرود سے فرمائی تھی: قَالَ اِبْرٰهِمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ ۔۔۔ اللہ جو معبودِ برحق ہے، قادرِ مطلق ہے اس نے جو نظام بنایا ہے اس میں وہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے۔ اگر تو خود کو معبود کہلواتا ہے تو فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ ۔۔۔ تو سورج کو مغرب سے نکال دے۔ یہ سن کر فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ۔۔۔ (البقرہ:258) کافر مبہوت ہو گیا لاجواب ہو گیا۔ یہی بات اللہ کریم یہاں ارشاد فرما رہے ہیں کہ اس نظامِ کائنات کو دیکھ کر انہیں عظمتِ الٰہی کا اقرار کر لینا چاہیے۔

پہاڑ اور راستے:

فرمایا: وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ ۔۔۔ اور ہم نے زمین میں اس لیے پہاڑ بنائے کہ ان لوگوں کو لے کر ہلنے نہ لگے۔ اللہ کریم نے اسی زمین پر بڑے بڑے پہاڑ بنا کر اس پر بہت بڑا بوجھ لاد دیا ہے۔ یہ اہتمام اس لیے کیا تا کہ یہ بوجھ زمین کو برابر رکھے، جما کر رکھے، یہ نیچے سے لڑھکنا اور ہلنا نہ شروع کر دے۔ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۳۱﴾ اور ہم نے اس میں کشادہ کشادہ راستے بنائے تا کہ (ان کے

ذریعے) وہ (اپنی) منزل پر پہنچیں۔ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ ان پہاڑوں، نالوں، وادیوں، میدانوں میں ہم نے نشانیاں بنادیں اور راستے بنادیے۔ اگر زمین ایک چٹیل صحرا کی مانند ہوتی تو اس میں انسانوں کو راہیں نہ ملتیں، گم ہو جاتیں، ہم نے نشیب وفراز بنا کر زمین میں نشانیاں بنادیں گزرگاہیں بنادیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنے کے وسائل بنادیے۔ یہ سب انسانی زندگی کی ضرورتیں ہیں جو ہم نے پہلے سے مہیا کردیں تاکہ لوگ اپنی منزل تک پہنچ سکیں۔ اُن کو کچھ ایسے آثار ونشان مل سکیں جو منزل کا پتا دیں۔ اللہ کریم نے ایسے آثار اور راستے متعین کردیے جو راہنمائی کرتے ہیں۔ ذرا چشمِ تصور سے دیکھیں کہ اگر زمین ایک چٹیل میدان ہوتی جس میں کوئی گھاٹی، پہاڑ، ندی، نالہ نہ ہوتا، نہ کوئی بلندی ہوتی نہ ہی کوئی پستی تو انسانوں کو راہ بھی نہ ملتا۔

آسمان، ایک مضبوط چھت:

فرمایا: وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا۔۔۔ اور ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا۔ ایک ایسی چھت جو ساری کائنات کی حفاظت پر مامور ہے۔ یہ نہ تو بوسیدہ ہوتی ہے نہ ہی کہیں سے پھٹتی ہے کہ اس کی مرمت کرانا پڑے۔ اللہ کریم نے جب سے آسمان بنایا ہے اور جب تک اسے رکھیں گے یہ اسی حالت میں قائم رہے گا اور اپنا کام کرتا رہے گا۔ دنیا میں ہم جب کوئی مکان تعمیر کرتے ہیں تو جب تک اس کی چھت نہ ہو یا چھت مضبوط نہ ہو ہم اس میں داخل ہونا پسند نہیں کرتے نہ ہی اسے سجانے کا یا اس میں اسباب رکھنے کا سوچتے ہیں۔ اس لیے کہ تحفظ کا مدار چھت پر ہوتا ہے اور اسی لیے تعمیر کے وقت لوگ بہت احتیاط سے چھتیں بنواتے ہیں تاکہ گھر کی ڈھال درست بنے۔ بارش برسے تو چھت سے گزر جائے، پانی اندر نہ داخل ہو۔ آندھی طوفان آئے تو چھت پورے گھر کی حفاظت کرتی ہے اسے مضبوط ہونا چاہیے۔ اصل بات یہ ہے کہ: وَّهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۳۲﴾ یہ اللہ کی نشانیوں میں، اس کی عظمت کے دلائل میں غور وفکر نہیں کرتے بلکہ اعراض کرتے ہیں۔ اللہ کی عظمت کی نشانیوں کی پرواہی نہیں کرتے، لاپروائی کرتے ہیں، منہ پھیر کر چل دیتے ہیں۔

قدرتِ باری کا ترتیب کردہ نظام:

اللہ کریم ایسا قادر ہے کہ اس نے رات اور دن کو پیدا فرمادیا: وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ۔۔۔ رات اور دن کی تخلیق میں اللہ کی قدرت کی نشانیاں ہیں، رات سکون اور راحت کے لیے ہوتی ہے جبکہ دن میں لوگ اپنا روزگار تلاش کرتے ہیں۔ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ ہم نے ایک ایسا نظام بنایا ہے کہ رات اور دن باری باری آتے ہیں اور اپنے مقررہ اوقات میں آتے ہیں۔ دن میں لوگ مصروفِ عمل رہتے ہیں اور رات کو آرام کرتے ہیں۔ دن بھر کام

کاج میں جتنی توانائی خرچ کرتے ہیں، بدن میں جتنی کمزوری پیدا ہوتی ہے، جب رات کو آرام کرتے ہیں تو وہ ساری کمی پوری ہو جاتی ہے۔ صبح تازہ دم ہو کر پھر کام کاج پر نکل جاتے ہیں۔ اگرچہ رات باعثِ سکون ہے لیکن اگر صرف رات ہی ہوتی تو زندگی کتنی دشوار ہو جاتی اور اگر صرف دن ہی ہوتا تو زندگی کی کیسی عجیب صورت ہوتی! کوئی کام کر رہا ہوتا، کوئی اونگھ رہا ہوتا، کوئی تھکا ماندہ ہوتا تو کوئی سو رہا ہوتا۔ قدرتِ باری نے ایسا نظام جاری فرما دیا کہ رات اور دن تسلسل سے آتے ہیں اور روئے زمین پر کہیں دن ہوتا ہے اور کہیں رات ہوتی ہے۔

فلکی نظام:

فرمایا: وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴿۳۳﴾ اس نے سورج اور چاند بنائے یہ سب آسمان میں (اس طرح چلتے ہیں گویا) تیر رہے ہیں۔ ان کی راہیں مقرر ہیں، مقام و منازل مقرر ہیں اور یہ بھی طے شدہ ہے کہ ہر روز انہیں کتنی حرکت کرنی ہے اور کہاں سے کہاں جانا ہے۔ اس حرکت کا زمین پر کیا اثر ہوگا، روئیدگی پر کیا اثر ہوگا، انسانوں پر کیا ہوگا، بادل اور بارش کے نظام پر کیا ہوگا یہ سب طے شدہ ہے۔ ایک ایک ذرّے پر ان حرکات کا اثر آتا ہے۔ اللہ کریم نے یہ نظام بنا دیا ہے کہ سورج، چاند، ستارے سیارے آسمان میں محوِ سفر ہیں اور جب سے کائنات بنی ہے تب سے آج تک نہ رات اور دن نے اپنی روش بدلی ہے نہ ہی اجرامِ فلکی نے اپنی روش بدلی ہے۔ کیا کوئی چیز اپنا راستہ چھوڑ کر دوسرے راستے کی طرف ہو گئی ہے؟ سارے اُن راہوں پر چل رہے ہیں جو اُن کے لیے آسمان میں متعین ہیں اور آپس میں ٹکراتے نہیں ہیں کہ اگر یہ اپنی راہوں سے بھٹک جاتے تو ایک دوسرے سے ٹکرا کر تباہ ہو جاتے اور یوں دنیا کو بھی تباہ کر دیتے۔ یہ نظامِ قدرت اللہ کی عظمت پر اتنی بڑی دلیل ہے کہ انسان اگر ذرا سا بھی غور کرے تو از خود اس کی پیشانی زمین پر سجدہ ریز ہو جاتی ہے اور اس کی زبان سے بے اختیار سبحان ربی الاعلیٰ نکلتا ہے۔

مدّتوں بھٹکنے کے بعد سائنس اب اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ زمین اپنی جگہ پر حرکت کر رہی ہے، سورج اپنی جگہ اور چاند اپنی حرکت کر رہا ہے۔ اس سے پہلے سائنس کا تجزیہ تھا کہ زمین ساکن ہے جبکہ سورج گھوم رہا ہے۔ کچھ عرصے بعد سائنس نے اپنا تجزیہ بدل کر کہا کہ زمین گھوم رہی ہے جبکہ سورج اپنے مقام پر جما ہوا ہے۔ صدیوں تحقیق کے بعد سائنس نے آج وہ بات کہی ہے جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ساڑھے چودہ صدیاں پہلے ارشاد فرما دی تھی کہ سورج، چاند، ستارے سب اپنے اپنے آسمان میں تیر رہے ہیں۔ یعنی آسمان میں ہر ایک کی منازل اور راہیں متعین ہیں اور وہ اسی راستے پر رواں دواں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ جدھر جس کی مرضی آئے وہ ادھر چل دے۔

عہدِ حاضر کے نجومی اور اُن کے دعوے:

ہمارے ہاں آج کل نجومیوں نے عجیب وغریب باتیں بنا رکھی ہیں۔ کبھی کہہ دیتے ہیں کہ فلاں ستارہ تو فلاں برج میں مقیم ہے لہٰذا اس شخص پر مصیبتیں آرہی ہیں۔ یا کسی کو کہیں گے کہ تمہارا ستارہ فلاں برج میں ہے اس لیے تم بیمار رہتے ہو تم پر مصیبت آئی ہوئی ہے۔ لوگوں کی جہالت قابلِ دید ہے کہ وہ ان نجومیوں کو ارب پتی بنا دیتے ہیں جنھوں نے محض ڈھکوسلے جوڑ رکھے ہوتے ہیں۔ لوگوں کو اتنا سوچنا چاہیے کہ اگر ان نجومیوں نے یہی بتانا ہے کہ تمھیں بخار چڑھا ہے یہ تب تک رہے گا جب تک تمہارا ستارہ فلاں برج میں رہے گا تو پھر نجومی کے پاس جانے کا فائدہ کیا ہے؟ نجومی سے پوچھنے کی ضرورت کیا ہے کہ بخار تو پہلے ہی چڑھا ہوا ہے؟ یا تو یہ نجومی اس ستارے کو مصیبت والے برج سے نکال کر راحت والے برج میں داخل کر دیں تو پھر تو کوئی بات بھی ہوتی۔ ستارے نے تو خود بخود نکلنا ہے اور اللہ کے حکم سے نکلنا ہے تو پھر یہ کس بات کے پیسے لیتے ہیں؟ نجومیوں کے پاس جانے والوں کو یہ سوچنا چاہیے کہ وہ ان کے پاس کیوں جاتے ہیں جبکہ نجومی صرف انہیں اتنا بتاتے ہیں کہ ستارہ فلاں جگہ ہے اور اس جگہ مصیبت ہے تو اُن سے کہیں کہ اسے مصیبت سے پھر نکالو۔ اس پر نجومی کہتے ہیں کہ ستارہ خود ہی نکلے گا۔ لوگوں کو اُن سے پوچھنا چاہیے کہ پھر تمہاری مخبری کی کیا ضرورت ہے، تمھیں پیسے دینے کی کیا وجہ ہے؟

ہماری قوم کا مزاج بہت عجیب سا ہو گیا ہے اب اسے ایک دینی تقدس دے کر استخارہ کے نام پر قسمت کے حال معلوم کرتے ہیں۔ اب تو یہ عالم ہے کہ ٹیلی وژن پر باقاعدہ ایک پروگرام چلتا ہے جس کا نام ہی استخارہ ہے۔ اس پروگرام میں ایک شخص لوگوں کے پیغامات سنتا ہے، کوئی بچی کی بیماری کا پوچھتا ہے تو کوئی اپنی ملازمت ختم ہو جانے کا رونا روتا ہے چنانچہ یہ شخص جو بزرگ بنا بیٹھا ہے لوگوں سے ماں کا نام پوچھتا ہے پھر جواب دیتا ہے۔ کوئی فون کر کے کہتا ہے کہ میں نے نوکری چھوڑ دی اب نئی نہیں مل رہی تو اُسے جواب ملتا ہے کہ تم نے استعفیٰ دے کر غلطی کی جس سے اللہ کو ناراض کیا ہے لہٰذا اس نے تمہاری روزی بند کر رکھی ہے۔ اس طرح کی خرافات وہ شخص کہہ رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح کتنے ہی لوگ بیٹی کی شادی نہ ہونے کا رونا اس سے روتے ہیں اور نجانے کتنے پیسے اس کی نذر کرتے ہوں گے تاکہ بیٹی کی شادی کا مسئلہ حل ہو سکے کاش لوگوں کو یہ سمجھ آ جائے کہ اگر وہ محتاج ہیں تو یہ نجومی قسم کے لوگ تو خود اُن کے محتاج ہیں۔ لوگ انہیں مشکل کشا سمجھتے ہیں جبکہ اگر انہیں پیسے نہ دیں تو یہ کھانا نہ کھا سکیں، لیکن افسوس کہ ہر بندہ نجومیوں کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔

مسائل کا اصل حل:

مسائل کا اصل حل یہ ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں آ جاؤ جس کے دستِ قدرت میں سارا نظامِ کائنات ہے، جو ستاروں کا خالق ہے انہیں چلا رہا ہے اور جس نے اُن میں تاثیر رکھی ہے۔ زندگی کی مشکلات کا آسان سا حل ہے کہ کوئی مصیبت ہے تو وضو کرو، قبلہ رو ہو جاؤ، نوافل پڑھو، قرآنِ کریم کی تلاوت کر کے دعا مانگو، درود شریف پڑھ کر دعا مانگو۔ اللہ کریم سے رجوع کرو کہ وہ قادرِ مطلق ہے، ارحم الرّحمین ہے۔ وہ مصیبت کو راحت میں بدل دیتا ہے۔ اللہ کریم مسبب الاسباب ہے کہ اسباب بھی از خود پیدا نہیں ہوتے لہٰذا اس کی بارگاہ میں حاضر ہو جاؤ، وہاں رجوع کرو۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ وہ اتنا کریم ہے کہ تمہاری مصیبتیں اور پریشانی بھی دور فرما دے گا اور جو عبادت کی، اس کا اجر الگ سے عطا فرمائے گا۔ یہ نہیں کہے گا کہ اب بیماری دور ہو گئی ہے جس کے لیے تم نے عبادت کی تھی لہٰذا اب اجر نہیں دوں گا۔ اللہ تو اتنا کریم ہے کہ تکلیفیں بھی دور کر دیتا ہے اور عبادت کا اجر اور انعام الگ سے دے دیتا ہے اور ہر نیکی کا اجر دس گنا بڑھا کر عطا فرماتا ہے جبکہ ہر برائی کی سزا اتنی ہی دیتا ہے جتنی برائی ہو، اس میں زیادتی نہیں فرماتا۔

اللہ کریم کے دستِ قدرت میں تمام نظامِ کائنات ہے اور اس کے حکم سے سورج، چاند، ستارے اور سیارے آسمان میں محوِ سفر ہیں۔ اس معمورۂ عالم میں انسان کو بستے ہوئے کتنا عرصہ بیت چکا ہے اس کے متعلق کسی کے پاس حتمی معلومات نہیں ہیں، محض اندازے ہیں۔ کچھ لوگوں کے مطابق انسان کو وارد ہوئے کروڑوں سال بیت گئے، کچھ لوگ ہزاروں سال کی بات کرتے ہیں۔ انسانی اندازوں میں اگرچہ اختلاف ہے لیکن یہ بات کتنی عجیب ہے کہ آج تک نہ رات دن نے اپنی روش بدلی ہے نہ ہی سورج چاند اور ستاروں کا معمول تبدیل ہوا، کوئی بھی اپنا راستہ چھوڑ کر دوسرے راستے کی طرف نہیں گیا۔ سورج کی روشنی اور تمازت بھی نہیں بدلی نہ ہی چاند کی ٹھنڈک، ہواؤں کے چلنے اور بارش کے برسنے کا نظام بھی جاری ہے۔ کہیں کوئی گڑبڑ نہیں ہوتی، جیسا حکم ہوتا ہے، ویسا ہی ہوتا ہے تو انسان کو بھی ہر حال میں رجوع الی اللہ کرنا چاہیے۔ اس نظام کو جو ہستی چلا رہی ہے اسی کی بارگاہ میں رجوع کرنا چاہیے۔ اگر تکلیف ہے تو اللہ سے دعا کرو اور اگر خوشحالی ہے تو اسی کی اطاعت کرو اور شکر ادا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ فراخی میں بگڑ جاؤ اور اپنے آپ کو بڑا (متکبر) سمجھنے لگو یا تنگی میں دوسروں کے دروازے پر چلے جاؤ۔

موت کا مزہ ہر متنفس کو چکھنا ہے:

مشرکین کہنے لگے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کہتے ہیں کہ صرف اللہ ہے جو سب کا خالق ہے، مالک ہے عبادت کے لائق ہے جبکہ ہمارے بتوں کا انکار کرتے ہیں تو یہ ان (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی تک ہی بات رہے گی۔

کسی نے دنیا میں ہمیشہ نہیں رہنا تو یہ فسانہ جو انہوں (صلی اللہ علیہ وسلّم) نے چھیڑا ہے، جب یہ (صلی اللہ علیہ وسلّم) دنیا سے رخصت ہوں گے تو یہ فسانہ بھی ختم ہو جائے گا۔ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ یہ ایسے بے وقوف ہیں کہ یہ نہیں سمجھتے کہ: وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ۔۔۔ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم سے پہلے کسی بشر کے لیے ہمیشہ رہنا تجویز نہیں فرمایا یعنی کسی بشر کے لیے زمین پر دائمی رہنے کا نظام نہیں بنایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم سے پہلے جو نبیؑ گزرے جن کو یہ لوگ بھی نبیؑ مانتے ہیں اور اُن کے پیروکار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں کیا وہ دنیا سے تشریف نہیں لے گئے۔ کہ یہ دنیا کا نظام ہے۔ دنیا نے خود ایک دن فنا ہو جانا ہے تو اس میں رہنے والے کیسے ہمیشہ رہ سکتے ہیں۔ اَفَاۡئِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ﴿۳۴﴾ پھر اگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کا انتقال ہو جائے تو کیا یہ لوگ خود دنیا میں ہمیشہ رہیں گے؟ یہ لوگ کیوں نہیں سوچتے کہ اگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) پر موت آنی ہے تو کیا ان پر نہیں آنی؟ کیا یہ ہمیشہ دنیا میں رہیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم دنیا سے پردہ فرما جائیں گے تو کیا ان لوگوں کو نہیں مرنا، کیا ان کے باپ دادا اب تک بیٹھے ہیں؟ ہر ایک کو جانا ہے اور موت کا مزہ چکھنا ہے۔ فرمایا: كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ۔۔۔ ہر جاندار موت کا مزہ چکھے گا۔ لیکن موت کیا ہے؟ استاذی المکرم حضرت اللہ یار خان رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تشریح میں فرمایا کرتے تھے کہ یہ جو موت کا مزہ چکھنا ہے تو اس سے مراد تو یہ ہے کہ ذائقہ چکھنے والا کوئی موجود ہے۔ اگر موت زندگی کے خاتمے کا نام ہے تو پھر ذائقہ کس نے چکھا؟ موت میں ذائقہ ہے، تلخ ہے یا شیریں یا جیسا بھی ہے جس پر موت آتی ہے اُس نے وہ چکھنا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ موت فنا کا نام نہیں ہے، اس کی کوئی حیثیت باقی ہے۔ کوئی ذائق ہے تو وہ ذائقہ چکھے گا اور ہر متنفس نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ یعنی یہ بھاگنے والی چیز نہیں ہے اس سے فرار ممکن نہیں ہے اس میں بڑی تلخیاں، بڑی کڑواہٹ بھی ہے اور بڑی لذت اور شیرینی بھی ہے۔ اصل کام یہ ہے کہ اس کی تیاری کرنی چاہیے کہ جب موت آئے تو اس کی شیرینی اور لذت نصیب ہو اور اس کی تلخی اور کڑواہٹ سے اللہ کریم محفوظ رکھیں۔ مرنے والا موت کا مزہ چکھتا ہے اس کی روح باقی ہوتی ہے۔ بدن بکھر جاتا ہے اس لیے کہ دنیا کی زندگی کا وہ تعلق جو بدن اور روح میں تھا اسے توڑ دیا جاتا ہے۔ یہ موت کہلاتی ہے۔

شہدا کا حال:

کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں کہ ان کی دنیا کی زندگی کا تعلق تو ختم ہو جاتا ہے لیکن بدن کے ساتھ روح کا تعلق باقی رہتا ہے۔ یہ تعلق اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے بدن خراب نہیں ہوتا نہ ہی بوسیدہ ہوتا ہے بلکہ تر و تازہ رہتا ہے۔ انہیں ہی شہید کہتے ہیں۔ انہی کے لیے قرآنِ کریم نے ارشاد فرمایا ہے کہ انہیں مردہ نہ کہا جائے اس لیے کہ

وہ زندہ ہیں۔ شہید کی موت کو موت کہنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ حالانکہ اللہ کی راہ میں جو قتل ہوا، خواہ تلوار سے جسم کے ٹکڑے ہوں یا بندوق کی گولیوں سے وجود چھلنی ہو گیا ہو یا توپ کے گولے سے وجود کے پرخچے اڑ گئے ہوں اسے مردہ کہنے کی ممانعت ہے۔ شہید کے وجود کو اسی لباس میں دفن کیا جاتا ہے جو اس نے پہن رکھا ہوتا ہے۔ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ اسے نہلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس کا لہو بھی پاک ہو گیا ہے اور یہی غسل کافی ہے جو اس نے اپنے خون سے کرلیا ہے۔ اس کو اسی طرح میرے پاس آنے دو۔ یہ قابلِ غور بات ہے کہ زندگی میں ہمارا ذرا سا خون بہہ نکلے تو وضو ٹوٹ جاتا ہے، کپڑوں پر لگ جائے تو کپڑے ناپاک ہو جاتے ہیں لیکن شہید کا خون ہی پاک ہے۔ اس کا یہ کٹا پھٹا لباس ہی اس کا کفن ہے، اسی حال میں اسے دفن کر دو لیکن خبردار اسے مردہ نہ کہنا۔ یہ زندہ ہے۔

یہ بات عقل نہیں سمجھ سکتی کہ ایک بندہ قتل بھی ہو گیا، دفن بھی ہو گیا پھر بھی وہ زندہ ہے تو بتایا جا رہا ہے کہ موت موت میں فرق ہے۔

موت فنا کا نام نہیں:

اگرچہ موت، موت میں فرق ہے لیکن کسی کی بھی موت فنا کا نام نہیں ہے۔ کافر پر جب موت آتی ہے تو اس کا بدن گل سڑ جاتا ہے یا جسے آگ میں جلا دیا جائے تو بھی وہ کسی بھی صورت میں بالآخر مادّے کی کوئی شکل بنتی ہے۔ اگر وہ پانی میں ڈوب کر ہلاک ہوتا ہے، جانور کھاتے ہیں یا فضا میں بکھر جاتا ہے، کہیں بھی کوئی بھی شکل تبدیل کرلے آخرکار مادّی ذرّات ہی کی کوئی شکل بنتی ہے۔ پہلے بھی تو اللہ کریم نے مادّے سے ہی اُس کا وجود بنایا تھا۔ روح اور بدن کا تعلق اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ بدن جل جائے، اُسے مٹی کھا جائے، ریزہ ریزہ ہو جائے تو بھی ہر ریزے کا تعلق روح کے ساتھ قائم رہتا ہے۔ دنیا میں ہم کام کرتے ہیں تو لذّت بدن حاصل کرتا ہے لیکن اثرات روح پر بھی مرتب ہوتے ہیں۔ نیکی کرنے سے، حلال اور طیب غذا سے جہاں بدن لذت حاصل کرتا ہے وہاں روح بھی صحتمند ہوتی ہے۔ حرام کھانے سے، برائی کرنے سے وقتی طور پر بدن لذت حاصل کرتا ہے لیکن روح پر ویرانی چھا جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر انسان گناہ کرنے کے بعد پشیمان ہوتا ہے۔ ایک انسان خطاکار ہے یا ایک بندہ ایمان ہی نہیں لایا لیکن جب وہ گناہ کرتا ہے تو بعد میں وہ بھی پشیمان ہوتا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لیے کہ اس کی روح پر بھی گناہ کا اثر مرتب ہوتا ہے۔ روح پر جب برائی کی سیاہی یا دھند چھاتی ہے تو انسانی قلب پریشان ہو جاتا ہے۔ جبکہ نیک کام کرنے کے بعد ایک انجانی سی خوشی ہوتی ہے۔ نیکی سے روح کو طاقت اور صحت ملتی ہے اور اس توانائی کو قلب بھی محسوس کرتا ہے۔ دنیا میں اعمال کا اثر بظاہر بدن پر ہوتا تھا لیکن روح بھی محسوس کرتی تھی، جب برزخ میں جاتا ہے تو مکلف بالذات

روح ہوجاتی ہے اور بدن اس کے تابع ہوجاتا ہے۔ چنانچہ جو سلوک روح سے ہوتا ہے اس کا اثر بدن کے ہر ذرّے تک پہنچتا ہے۔ اگر روح کو عذاب ہو رہا ہے تو بدن کے ایک ایک ذرّے کو عذاب پہنچتا ہے۔ قیامت قائم ہوگی تو بدن اور روح برابر مکلف ہوجائیں گے اور ایک حدیثِ مبارکہ کا خلاصہ ہے کہ وہاں باہم جھگڑا کریں گے۔ روح عرض کرے گی کہ بارِالٰہا! میں تو تیرے پاس امانت تھی، تیری بارگاہ میں حاضر، تیری مخلوق تھی اور جب تک اس بدن میں نہیں گئی میں نے تو گناہ کیا ہی نہیں۔ یہ ساری شرارتیں اس بدن کی ہیں، اسے عذاب دے اور مجھے معاف کردے۔

بدن عرض کرے گا، یا اللہ! جب تک یہ مجھ میں نہیں آئی تھی، میں بھی تو خاکی ذرّات ہی تھا میں نے کیا کیا تھا۔ یہ سارا فساد اسی کے آنے سے بنا لہٰذا سارا عذاب اسی کو ہونا چاہیے۔ اللہ کریم پھر ان دونوں کو ایک نظارہ دکھائیں گے۔ دو بندے ہوں گے جن میں سے ایک اپاہج ہوگا چلنے سے معذور ہوگا اس کے باقی حواس اور اعضا درست ہوں گے۔ دوسرا شخص صحتمند ہوگا لیکن نابینا ہوگا۔ وہ دونوں باغ میں جاتے ہیں اور ایک درخت ہے جس پر بہت مزے دار پھل ہے تو اپاہج شخص اس نابینا کو بتاتا ہے کہ اس درخت پر بڑا مزے دار پھل ہے۔ اسے ہدایات دیتا ہے کہ تم سیدھا جاؤ پھر دائیں ہوجاؤ پھر بائیں مڑ جاؤ تو سامنے درخت آجائے گا۔ وہ نابینا باغ میں جائے گا، پھرتا رہے گا لیکن اُسے سمجھ نہیں آئے گی کہ پھل کیسے توڑے۔ چنانچہ وہ اپاہج سے کہے گا کہ اس طرح تو پھل نہیں ٹوٹے گا ایسا کرتے ہیں کہ تم میرے کندھے پر سوار ہوجاؤ اور راستہ بھی بتاتے چلو۔ اپاہج اس کے کندھے پر سوار ہوجائے گا اور نابینا کو راستہ بتائے گا پھر پھل توڑ لے گا۔

اللہ کریم روح اور بدن کو یہ نظارہ دکھا کر پوچھیں گے کہ ان دونوں میں سے قصوروار کون ہے؟ وہ کہیں گے کہ یا اللہ! دونوں ہی برابر کے قصوروار ہیں کہ دونوں نے پھل توڑنے کا مشورہ کیا اور دونوں نے ہی اس کا انتظام کیا۔ اللہ کریم فرمائیں گے کہ یہی حال تمہارا اور بدن کا ہے چنانچہ یہاں جھگڑا نہ کرو، جاؤ اور بھگتو!

موت کسی فنا کا نام نہیں ہے، موت پر قصہ ختم نہیں ہوگا بلکہ موت پر تو قصے شروع ہوجاتے ہیں:

موت کو سمجھا ہے غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شام زندگی، صبحِ دوامِ زندگی

بظاہر تو زندگی کی شام ہوجاتی ہے لیکن درحقیقت ابدی زندگی کا سورج طلوع ہوتا ہے۔

کافروں کا یہ کہنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے جو نیا دین ایجاد کیا ہے اور ہمارے بتوں کو برا بھلا کہا ہے یہ بس چند دنوں ہی کی بات ہے آخر دنیا سے چلے جائیں گے اور یہ قصہ ختم ہوجائے گا۔ فرمایا! کیا اس سے پہلے بھی کوئی

ہمیشہ رہا ہے؟ یا اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلّم پر موت وارد ہوگی تو یہ لوگ خود کیا ہمیشہ رہیں گے؟

عقیدہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلّم:

اب یہاں یہ خلط ملط ہو جاتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم پر موت آنے کا انکار کیا جائے تو یہ انکار درست نہیں ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم دنیا سے پردہ فرما گئے ہیں۔ علمائے حق فرماتے ہیں کہ نبیؑ کی موت عام آدمی کی موت کی طرح نہیں ہوتی بلکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی روحِ عالی کو بدنِ عالی سے جدا نہیں کیا گیا اور روحِ عالی بدنِ عالی میں ہی جلوہ افروز ہے۔ ایک رشتہ جو دنیوی زندگی کو قائم رکھنے کے لیے بدن کا روح سے تھا وہ ختم کر دیا گیا۔

یہ عقیدہ حیات النبیؐ کہلاتا ہے۔ اس پر آج کل بڑے مناظرے اور شور ہوتا ہے، ہوتا رہے لیکن حقیقت کو ماننا چاہیے۔ اللہ کریم کے بعد کائنات کی افضل ترین ہستی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم ہیں۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ وجودِ عالی اور روحِ عالی دونوں مل کر ذاتِ پاک صلی اللہ علیہ وسلّم ہیں کیونکہ محض روحِ عالی رسول نہیں ہے اور نہ ہی محض وجودِ عالی رسولؐ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ روح مع البدن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ہیں اور اللہ کے علاوہ کائنات کی ہر چیز سے افضل ہیں جس میں زمین، آسمان، عرش جنت سب آ گئے۔ اب اگر روحِ اقدس کو وجودِ اطہر سے الگ کر کے جنت کے اعلیٰ ترین مقام پر بھی رکھ دیں تو کیا وجودِ عالی جنت سے زیادہ افضل نہیں ہے؟ اگر ایسا کیا جائے تو بہر حال یہ لازم آئے گا کہ روحِ اطہر کو اعلیٰ جگہ سے نکال کر اس سے کمتر مقام پر رکھا جائے تو یہ درست نہیں ہے۔ اللہ کریم نے وجودِ اطہر سے زیادہ کوئی اعلیٰ جگہ نہیں بنائی۔ اسی لیے علمائے حق فرماتے ہیں کہ روحِ اطہر کو وجودِ اطہر سے جدا نہیں کیا گیا۔

مکان کی عظمت مکین سے ہوتی ہے:

شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ زمین کا وہ ٹکڑا جس پر بیت اللہ ہے، وہ روئے زمین سے افضل تر ہے لیکن مدینہ منوّرہ میں روضۂ اطہر میں قبر مبارک کا وہ حصّہ جو وجودِ اطہر صلی اللہ علیہ وسلّم سے مَس ہو رہا ہے وہ حصّہ سب سے افضل ہے۔ اس لیے کہ مکان کی عظمت مکین سے ہوتی ہے اور وجودِ اطہر کائنات کی افضل ترین شئے ہے۔

کافرانہ سوچ:

یہ سوچ تو کفار کی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا وصال ہو جائے گا تو بس قصہ ہی ختم ہو جائے گا اور وہ موت کو فنا سمجھتے تھے۔ افسوس کی بات ہے کہ ایک مسلمان بھی آج ایسا سوچتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے ایک شخص ملنے آیا اور موت

کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کر کے حیرت میں ڈال گیا۔ کہنے لگا کہ بڑا سنتے ہیں کہ موت ہوگی، کیسی ہوگی، میرا تجربہ تو یہ ہے کہ میں رات دس بجے سو گیا اور صبح چھ بجے جاگا۔ اس دوران کیا ہوا مجھے کچھ خبر نہیں۔ بلکہ میرے پڑوس میں دھما کہ بھی ہوا جس سے میری بیوی جاگ گئی لیکن میری نیند میں خلل نہیں آیا۔ میرے خیال میں تو موت بھی یہی ہوگی، سو جائیں گے کچھ پتا نہیں چلے گا۔ اس کی بات سن کر بہت حیرت ہوئی کہ اس نے یہ سوچ رکھا ہے کہ موت ایسی بے خبری یا بے ہوشی کا نام ہے۔ کافروں کی رائے بھی موت کے بارے میں ایسی ہی تھی کہ موت شاید محض فنا کا نام ہے۔ اس شخص کی بات سن کر سوچا کہ یہ تو جب موت آئے گی تو تمہیں پتا چلے گا کہ حقیقت کیا ہے۔

آزمائش دنیا:

فرمایا: وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ۭ وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿٣٥﴾ اور (لوگو!) ہم تم کو بری اور بھلی (حالتوں) میں خوب آزماتے ہیں اور تم ہماری طرف ہی لوٹ کر آؤ گے۔ دنیا میں انسان کو خیر و شر سے آزمایا جاتا ہے۔ سہولتیں اور آسانیاں دی جاتی ہیں اور دیکھا جاتا ہے کہ آسانیاں پا کر اللہ کا شکر ادا کرتا ہے یا نافرمانی کرتا ہے۔ دکھ اور مصائب بھیج کر بھی پرکھا جاتا ہے کہ تکلیف میں اللہ کی بارگاہ میں جاتا ہے یا اس کا در چھوڑ کر دوسرے دروازوں پر بھٹکتا پھرتا ہے۔ یہ خیر و شر دراصل آزمائش ہیں۔ آرام و تکلیف، فراخی و تنگدستی، صحت و بیماری سب اللہ کی طرف سے آزمائش ہے۔ بالآخر سب نے اللہ کی بارگاہ میں لوٹ کر جانا ہے اور وہیں حساب ہوگا اور وہیں فیصلے بھی ہوں گے۔

عظمتِ صحابہؓ کی دلیل، ایک تاریخی واقعہ:

شہدا کی شان میں قرآن کریم کا ارشاد ہے: وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (البقرہ:154) اور جو اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں انہیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم سمجھ نہیں سکتے۔ گویا شہید کی موت کو موت کہنا شرعاً جائز نہیں ہے۔ اُن کے وجود کے ساتھ روح کا اتنا مضبوط تعلق ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے وجود بکھرتا نہیں ہے نہ ہی بوسیدہ ہوتا ہے۔ اس کی زندہ مثال دنیا کے سامنے آئی جب صدیوں بعد دو صحابہ کرامؓ کی قبروں سے اُن کے مبارک وجود دوسری جگہ منتقل کرنے پڑے تو وہ بالکل صحیح سلامت تھے۔ یہ واقعہ 1932ء میں عراق میں پیش آیا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ دو عظیم صحابہؓ تھے جو دریائے دجلہ کے کنارے مدفون تھے۔ عراق کے شاہ فیصل بن حسین (اوّل) کے دور تک یہ صحابہؓ وہاں مدفون رہے۔ ایک دن شاہ فیصل (اوّل) نے خواب میں دیکھا کہ حضرت حذیفہؓ فرما رہے ہیں کہ میری قبر میں پانی اور جابرؓ کی قبر میں نمی آنا شروع ہو گئی ہے، اس لیے آپ ہم دونوں کو یہاں سے منتقل کر دیں اور دریا سے کچھ فاصلے پر دفن کر

دیں۔ صبح ہوئی تو بادشاہ اپنے روزمرہ کے معمولات میں خواب یکسر بھول گیا۔ دوسری رات پھر بادشاہ کو خواب میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نظر آئے اور انہوں نے وہی بات دہرائی اور اگلے روز پھر بادشاہ کو یاد نہ رہی۔ تیسری رات عراق کے مفتی اعظم کے خواب میں حضرت حذیفہؓ نے فرمایا کہ ہم دو راتوں سے بادشاہ سے کہہ رہے ہیں کہ ہمیں یہاں سے منتقل کرو لیکن وہ ہر روز بھول جاتا ہے، آپ بادشاہ کو متوجہ کریں اور ہمیں یہاں سے منتقل کریں۔ چنانچہ مفتی اعظم نے شاہ فیصل (اوّل) کی خدمت میں حاضر ہو کر جب عرض کی تو بادشاہ نے تصدیق کی کہ وہ بھی ایسا ہی خواب دیکھ رہے ہیں۔ مفتی اعظم نے بادشاہ پر زور دیا کہ صحابہ کرامؓ کے مزارات کی جگہ فوری طور پر تبدیل کر دی جائے لیکن بادشاہ نے تجویز دی کہ پہلے اس بات کی تصدیق کر لینی چاہیے کہ دریا کا پانی اُن کے مزارات کی طرف آ بھی رہا ہے یا نہیں۔ چنانچہ محکمہ تعمیرات نے دریا سے تیس فٹ کے فاصلے پر بورنگ کی اور ٹیسٹ لیے اور اس موقع پر مفتی اعظم ساتھ رہے۔ جب محکمے کی رپورٹ سامنے آئی تو پانی کا مزارات کی طرف آنا تو درکنار نمی تک کے آثار نہ ملے۔ اگلی رات بادشاہ نے پھر خواب میں حضرت حذیفہؓ کو اپنا مطالبہ دہراتے دیکھا لیکن چونکہ محکمہ تعمیرات کا تجزیہ بادشاہ کو مل چکا تھا اس لیے اس نے محض ایک خواب سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ اگلی رات حضرت حذیفہؓ مفتی اعظم کے خواب میں آئے اور انہیں سختی سے کہا کہ پانی ہمارے مزارات میں داخل ہو رہا ہے اور آپ پروا نہیں کر رہے۔ ہمیں فوری طور پر منتقل کیا جائے۔ مفتی اعظم نے اگلے روز بادشاہ کو صورتحال سے آگاہ کیا اور مشورہ دیا کہ بہتر یہی ہے کہ اصحاب پاکؓ کے مزارات کھلوا دیے جائیں۔ چنانچہ مفتی اعظم نے فتویٰ جاری کر دیا اور سرکاری طور پر اعلان کر دیا گیا کہ عید الضحیٰ کے موقع پر نمازِ ظہر کے بعد حضرت حذیفہؓ اور حضرت جابرؓ کے مزارات کھولے جائیں گے اور انہیں دوسری جگہ دفن کیا جائے گا۔ اس اعلان کے ساتھ دنیائے اسلام میں کھلبلی مچ گئی اسلامی ممالک سے پیغامات کا تانتا بندھ گیا کہ حج کے بعد کی تاریخ رکھی جائے چنانچہ 20 ذی الحج 1351 بمطابق 1932ء بعد نمازِ ظہر صحابہ کرامؓ کے وجود مبارک کی منتقلی کا کام شروع ہوا اور دنیا بھر کے نشریاتی اداروں کے نمائندے عراق پہنچنا شروع ہو گئے۔ دنیا کے بڑے بڑے حکمران وہاں جمع ہو گئے اور سائنس دانوں کو بھی بلایا گیا۔ اس موقع پر غیر مسلم بھی اس واقعہ کو دیکھنے کے لیے پہنچ گئے اور اُن کی ایک کثیر تعداد بغداد میں جمع ہو گئی۔ شاہِ عراق معززینِ شہر اور حکومت کے عہدیداروں کے علاوہ پانچ لاکھ افراد کی موجودگی میں مزارات کو کھولنے کا اہتمام کیا گیا۔ جب مزارات کو کھولا گیا تو حضرت حذیفہؓ کی قبر میں پانی داخل ہو چکا تھا اور حضرت جابر بن عبداللہؓ کی قبر میں نمی آ چکی تھی۔ نہایت احترام سے ان کے مبارک جسموں کو وہاں سے نکالا گیا تو سب یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ دونوں اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاک جسم بالکل محفوظ تھے۔ اُن مبارک ہستیوں کے چہروں سے کفن ہٹائے گئے تو لوگ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں جیسے وہ سب کچھ دیکھ

رہے ہوں، سر اور داڑھی کے بال بھی محفوظ تھے حتیٰ کہ کفن بھی صحیح حالت میں تھا۔ ایک جرمن ماہرِ چشم نے کہا کہ یہ تو زندہ انسان کی آنکھ ہے اس کی ساری قوت بینائی موجود ہے، اس میں زندگی ہے اور موت کا کوئی اثر نہیں ہے وہ مفتی اعظم کے ہاتھ پر مسلمان ہوا بعد میں بھی ان کے وجودِ مبارکہ کو دیکھ کر غیر مسلموں کی ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کرلیا۔ یہ واقعہ بہت مشہور ہوا۔

اب موت تو اُن پر بھی آئی تھی لیکن بدن مبارک سے روح کا تعلق اتنا مضبوط ہے کہ نہ وہ بکھرا نہ ہی بوسیدہ ہوا۔ شہدا کی یہ شان ہے۔

عظمتِ رسالت سے ناآشنائی کا نتیجہ:

فرمایا: وَإِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا۔۔۔ اور جب کافر لوگ آپ کو دیکھتے ہیں تو آپ کا مذاق اڑاتے ہیں۔ یعنی کافر آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو دیکھتے ہیں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی عظمت سے ناآشنا ہیں لہٰذا مکہ کا ایک شہری سمجھ کر مذاق اڑاتے ہیں۔ یہی بات ایک اور انداز میں سورۃ الاعراف میں ارشاد ہوئی يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ (الاعراف:198) گویا آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں اور نہیں دیکھتے۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف نگاہ تو پھیرتے ہیں مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو بحیثیت رسول اللہ نہیں دیکھ پاتے بلکہ اپنے ایک قریشی بھائی کو ہی دیکھتے ہیں۔ انہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا امام الانبیاؑ ہونا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے کمالاتِ رسالت و نبوت نظر نہیں آتے۔ یہاں بھی ایسا ہی ارشاد ہوا ہے کہ کفار آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے مقامِ رسالت اور عظمت سے ناآشنا ہیں اور ایک عام آدمی سمجھ کر مذاق اڑاتے ہیں۔ کہتے ہیں: اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ۔۔۔ کیا یہی وہ شخص ہے جو تمہارے معبودوں کا ذکر (برائی سے) کرتا ہے؟ وہ مذاق اڑاتے ہیں کہ دیکھو یہ تو ایسا شخص ہے کہ یہ کسی بھی بت کی پوجا نہیں کرتا تو اس کی رکھوالی کون کرے گا۔ اس کی مشکلات کون حل کرے گا، اس کی راہنمائی کون کرے گا، اس کو روزی کون دے گا؟ اُن کے خیال میں یہ سارے امور بتوں کے سپرد تھے اور وہی انجام دیتے تھے تو کفار مذاق اڑاتے ہیں کہ دیکھو یہ کیسے عجیب آدمی ہیں کہ کسی بُت سے ان کا رابطہ نہیں ہے ان کی زندگی کیسے بسر ہوگی، ان کے کام کون کرے گا؟ ان کو دیکھو یہ بجائے اس کے کہ بتوں کو راضی کرتے الٹا اُن کی ناراضگی مول لے رہے ہیں۔ یہ کتنی بڑی غلطی کر رہے ہیں اور کیسے عجیب آدمی ہیں! اللہ کریم فرماتے ہیں کہ اس سے زیادہ مذاق تو ان لوگوں کا اڑایا جانا چاہیے اور بہت بڑی بیوقوفی تو یہ لوگ خود کر رہے ہیں۔ فرمایا: وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ

كُفِرُوْنَ ﴿۳۶﴾ اور (خود) یہ لوگ رحمٰن (اللہ) کے ذکر کے منکر ہیں۔

وہ رحمٰن، جس کی عطا سے یہ پیدا ہوئے، جس کی عطا سے یہ پل رہے ہیں، جس نے انہیں دنیا کی ساری نعمتیں دیں یہ اس کا انکار کیے بیٹھے ہیں۔ بتوں نے کسی کو کیا دینا ہے، وہ تو خود مخلوق ہیں اور بے حس و بے جان ہیں جو نہ سنتے ہیں نہ بولتے ہیں۔ انہیں زمین پر پھینک دو تو خود کو کھڑا نہیں کر سکتے، کرسی پر رکھ دو تو پڑے رہیں، تو بتوں میں کیا رکھا ہے؟ یہاں اللہ کریم کا صفاتی نام الرحمٰن استعمال ہوا ہے اور یہ بحث پہلے بھی گزر چکی ہے کہ رحمانیت ایک ایسی صفت ہے جو دائمی نہیں ہے اور اس کا ظہور وقتی طور پر ہوتا ہے۔ دنیا میں اللہ کی رحمانیت کا ظہور ہے جس کے طفیل کافر، مشرک اور بدکار بھی رزق پاتے ہیں۔ دنیا کی ہر نعمت انہیں اللہ کی طرف سے رزق کے طور پر مل رہی ہے۔ حکومت و اقتدار، مال و منال اور اولاد یہ سب رحمانیتِ باری ہیں۔ جبکہ خود ان کا وجود، ان کی ضروریات اور ضروریات کی تکمیل، یہ سب نعمتیں وہ دنیا میں رحمانیت کے طفیل حاصل کر رہے ہیں جو عمومی اور وقتی ہوتی ہے۔ جب تک دنیا قائم ہے رحمانیت کا ظہور ہوتا رہے گا لیکن جب آخرت قائم ہوگی تو بات رحیمیت پر چلی جائے گی جس کا ظہور دائمی اور ابدی ہوگا۔ یہ اُنہی کو نصیب ہوگی جن میں نورِ ایمان ہوگا یعنی رحمت قبول کرنے کی استعداد ہوگی۔ کافر اور مشرک کو رحیمیتِ الٰہی سے کوئی حصّہ نصیب نہیں ہوگا۔ فرمایا یہ ایسے بے وقوف ہیں کہ جس نے انہیں پیدا کیا جو انہیں مسلسل پال رہا ہے، جو ان کی تمام ضروریات پوری کر رہا ہے، جس نے انہیں سننے بولنے اور دیکھنے کی قوتیں دیں اور صبح شام ان کو انواع و اقسام کے کھانے کھلا رہا ہے۔ انہیں بیماری سے بچا رہا ہے یہ اسی عظیم ہستی کی عظمت کا انکار کیے بیٹھے ہیں۔ اس ہستی کو مانتے ہی نہیں اور مذاق آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا اڑاتے ہیں۔

انسانی فطرت میں جلد بازی ہے:

فرمایا: خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ۔۔۔ انسان (ایسا جلد باز ہے گویا) جلد بازی سے بنایا گیا ہے۔ انسان کے مزاج میں تخلیقی طور پر جلد بازی ہے اور اس کی ایک عجیب فطرت ہے کہ وہ جلدی نتائج پانا چاہتا ہے۔ ہر کام کے کرنے کا ایک طریقہ، سلیقہ اور معین وقت ہے ایک خاص مدت ہے جس عرصے میں وہ کام ہوتا ہے، اس طریقے کے مطابق کیا جائے تو کام ہوتا ہے۔ آج کے موجودہ معاشرے میں ہماری سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہر کوئی باقاعدہ کام کیے بغیر نتیجے تک پہنچنا چاہتا ہے۔ ہر بندہ اسی کوشش میں ہے کہ وہ مدت بھی نہ لگے، طریقہ بھی اختیار نہ کرنا پڑے اور کام ہو جائے۔ پھر اس کے لیے عاملوں اور جادوگروں کے دروازوں پر دھکے کھاتے پھرتے ہیں کہ کوئی اُن کا سرمایہ دُگنا کر دے۔ سب Short Cut تلاش کرتے ہیں۔ اس جلد بازی

سے حاصل یہ ہوتا ہے کہ جو اپنا سرمایہ ہوتا ہے وہ بھی عامل اور جادوگر کھا جاتے ہیں۔ فرمایا، انسان کے مزاج میں فطری طور پر جلد بازی ہے اور وہ فوری نتائج چاہتا ہے۔ اب تو ہماری مسلمانی بھی برائے نام ہی رہ گئی ہے اور ہماری تہذیب بھی غالباً ہندوؤں جیسی ہوگئی ہے۔ ہندوؤں کا چونکہ اللہ پر ایمان نہیں ہے ان کا ایمان ہی فرضی دیوی دیوتاؤں کے ساتھ ستاروں اور ستاروں کی چالوں کے ساتھ ہے تو اُن کا طریقہ کار تو سمجھ میں آتا ہے لیکن مسلمانوں کو کیا ہوگیا ہے، یہ کیوں اللہ پر بھروسہ نہیں کرتے؟ اب ٹیلی وژن پر ایسے پروگرام نشر ہوتے ہیں جن میں عجیب باتیں ہوتی ہیں۔ ایک پروگرام دیکھنے کا اتفاق ہوا جس میں ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے اور لوگ فون کر کے اُسے اپنے مسائل بتا رہے تھے۔ فون کرنے والوں میں زیادہ تو جوان بچیاں اور خواتین تھیں جو اپنے اپنے مسائل بتا رہی تھیں اور وہ شخص مزے سے جواب دے رہا تھا کہ اُن کو کیا کرنا چاہیے۔ وہ انہیں وظیفے بتا رہا تھا کہ سورۃ یٰسین، سورۃ رحمٰن اور ایک اور سورت ملا کر روزانہ پڑھو۔ یوں لگتا تھا کہ اُسے خود اندازہ نہیں کہ یہ سورتیں کتنی طویل ہیں وہ غالباً انہیں آخری سورتوں کی طرح سمجھ رہا تھا ورنہ انہیں اکٹھا پڑھنے کے لیے نہ بتاتا۔ یہ تین سورتیں تو ایک پارہ، ایک منزل بن جاتیں ہیں جبکہ لوگ تو چند آیتیں نہیں پڑھتے۔ اس سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ بتانے ولا شخص خود نہیں جانتا کہ یہ سورتیں کتنی طویل ہیں اور جو کچھ اس کے منہ میں آتا تھا وہ بتائے جا رہا تھا۔ اس سارے معاملے میں پوچھنے والوں کی یہی آرزو کارفرما ہے کہ کوئی کام اس کے طریقے سے نہ کرنا پڑے، اس کے لیے محنت نہ کرنی پڑے بس یہ بتا دے اور وہ کام ہو جائے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو جلدی نتیجہ پانا چاہتے ہیں۔

علمِ نجوم، دست شناسی، چہرہ شناسی:

ضمناً یہ بات آ گئی تو یہ عرض کرتا چلوں کہ علمِ نجوم اور یہ ستارہ شناسی، دست شناسی اور چہرہ شناسی کیا ہیں؟ یہ سب محض اندازے ہیں اور اس کو یوں سمجھ لیں کہ اگر ابھی بادل اُمڈ کر آتے ہیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ بارش ہوگی۔ یہ ہمارا اندازہ ہے لیکن ضروری نہیں کہ بارش ہو۔ عین ممکن ہے کہ بارش نہ ہو یا ہو سکتا ہے کہ ہمارا اندازہ ہو کہ تھوڑی سی بارش ہوگی لیکن بارش زیادہ ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم بارش کا اندازہ لگائے بیٹھے ہوں اور ژالہ باری ہو جائے تو یہ اندازے ہیں۔ جب بادل آتے ہیں تو ہر کوئی اندازہ لگا لیتا ہے کہ بارش آنے والی ہے لہٰذا اگر کوئی بازار میں ہے تو وہ سوچتا ہے سواری میں بیٹھ جاؤں، سائے میں چلا جاؤں لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ بارش ہوتی ہی نہیں۔ اسی طرح علم نجوم اور دست شناسی وغیرہ یہ سب اندازے ہیں اور جو شخص ان اندازوں کو صحیح مانتا ہے اور نجومی کی بات پر یقین کر لیتا ہے تو یہ کفر ہے۔ البتہ کوئی اس انداز میں سنتا ہے کہ اُسے اندازہ سمجھتا ہے جو صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی تو اس میں گناہ ہے، کفر

نہیں ہے۔ لیکن ان پر یقین کرنا کفر ہے۔ افسوس کہ ساری قوم اس میں مبتلا نظر آتی ہے حالانکہ یہ ہندوؤں کا طریقہ اور رویہ تھا۔ یہ عظمتِ باری سے نا امیدی کا راستہ ہے۔ ہم اللہ کی مخلوق ہیں اور وہ رحمٰن اور رحیم سر پر موجود ہے ہمارا ہر لحظہ اس سے رابطہ ہے تو پھر ہم کیوں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ علامہ مرحوم نے بہت خوب کہا تھا:

ستارہ کیا میری تقدیر کی خبر دے گا

وہ خود فراخئ افلاک میں ہے صید و زبوں

آسمان کی وسعتوں میں جو ستارہ اپنی مرضی سے چل بھی نہیں سکتا، کسی جگہ رک بھی نہیں سکتا جو خود تقدیر الٰہی کے تحت محوِ گردش ہے۔ اس میں مجال دم زدن نہیں ہے تو وہ میری تقدیر کی کیا خبر دے گا جو اپنی تقدیر سے واقف نہیں۔ یہ سب کیا ہے؟ یہ سب اللہ سے دوری اور نا امیدی کی باتیں ہیں اور انسانی مزاج کی جلد بازیاں ہیں کہ یہ اللہ پر بھروسہ نہیں کرتے۔ اللہ کے بتائے ہوئے طریقوں اور سلیقوں سے کام نہیں کرنا چاہتے، محنت نہیں کرتے نتائج جلدی پانا چاہتے ہیں۔

مہلت کو غنیمت جانو:

فرمایا: سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ ﴿۳۷﴾ ہم عنقریب تم لوگوں کو اپنی نشانیاں دکھا دیں گے۔ فرمایا لوگو! جلدی نہ کرو میرے دلائل اور میری نشانیاں تمہارے سامنے آجائیں گی۔ ملک الموت کو آنے دو، برزخ بھی سامنے آجائے گا اور فرشتے بھی نظر آنے لگیں گے۔ دوزخ اور جنت بھی نظر آنے لگے گی تو گھبراتے کیوں ہو تمہیں جلدی کیا ہے؟ اگر چندے مہلت نصیب ہے تو شکر کرو اور وقت کو غنیمت جانو، توبہ کر لو رجوع الی اللہ کرو ورنہ اگر اسی گمراہی میں رہے تو مارے جاؤ گے۔

جہالت کے کرشمے:

ان کی جہالت کا یہ عالم ہے کہتے ہیں: وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾ کہتے ہیں یہ وعدہ (جس عذاب کی آپ خبر دیتے ہیں) کب تک آئے گا اگر آپ سچے ہیں تو؟ کفار کہتے ہیں کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلّم اللہ کے سچے نبیؑ ہیں اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کہتے ہیں کہ قیامت آئے گی، حساب کتاب ہوگا اور جنت دوزخ ہوگی، تو پھر وہ کہاں ہے؟ وہ قیامت کیوں نہیں آتی؟ اگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) سچے ہیں تو قیامت لے آیئے ہمیں قیامت دکھایئے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کے وعدے کیا ہوئے؟ اگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) سچے ہیں تو قیامت کو قائم کر کے دکھائیں تاکہ پتا چل جائے کہ کون کامیاب ہوتا ہے

اور کون ناکام ہوتا ہے۔ کون اچھا ہے، کون برا ہے یہ سامنے آجائے۔ اللہ کریم فرماتے ہیں یہ ان کی جہالت ہے اور کفرو شرک تو خود سب سے بڑی جہالت ہے۔ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنے سے بڑی جہالت کیا ہوگی؟ اللہ کی عظمت کے انکار سے بڑی حماقت کیا ہوگی؟ اس سے بڑی حماقت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ فرمایا یہ سب ان کی حماقتیں ہیں، اللہ نے انہیں فرصت دی ہوئی ہے، مہلت دے رکھی ہے اور ان کو قیامت کی جلدی ہے۔ کاش انہیں اندازہ ہو کہ وہ وقت بہت ہی مشکل ہوگا۔

کاش کافر آج سمجھ لیں!:

اللہ کریم فرماتے ہیں: لَوْ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا حِيْنَ لَا يَكُفُّوْنَ عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَنْ ظُهُوْرِهِمْ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۳۹﴾ اے کاش! کافر اس وقت کو جانیں جب وہ اپنے چہروں پر سے آگ کو روک نہ سکیں گے اور نہ اپنی پیٹھوں پر سے اور نہ ان کی کوئی مدد کی جائے گی۔ کاش یہ جان سکتے، انہیں اس بات کا ادراک ہو جاتا کہ وہ وقت بڑا مشکل ہے کہ دوزخ کی آگ بدن سے لباس کی طرح لپٹ جائے گی اور یہ اپنے چہرے تک سے آگ ہٹا نہیں سکیں گے۔ چہروں کے گرد آگ لپٹی ہوئی ہوگی، بات کریں گے تو شعلے نکلیں گے سانس لیں گے تو شعلے نکلیں گے، اندر باہر آگ ہوگی اور یہ اُسے کسی طرح بھی بُجھا نہ سکیں گے۔ آگ لباس کی طرح ان سے لپٹ جائے گی اور یہ اُسے اپنے وجودوں سے دور نہ کر سکیں گے، بُجھا نہ سکیں گے۔ ایسی حالت میں ان کا کوئی معاون و مددگار بھی نہ ہوگا۔ خود بھی کچھ نہ کر سکیں گے اور نہ ہی کوئی دوسرا ان کی آگ بجھانے والا ہوگا۔ سارے کفار خود آگ میں لپٹے ہوں گے تو ایک دوسرے کی کیا آگ بجھائیں گے!

دنیا آخرت کا پرتو ہے:

یہ بات قابلِ غور ہے کہ بندے کا ربط اس کے اعمال کے مطابق آخرت سے ہر لحظہ رہتا ہے اور بڑا مضبوطی سے رہتا ہے۔ آخرت چونکہ دائمی اور ابدی ہے لہٰذا آخرت مضبوط ہے۔ دنیا فانی ہے اور فانی کمزور ہوتا ہے چنانچہ مضبوط کا اثر کمزور پر پڑتا رہتا ہے۔

مومن جب نیکی کرتا ہے تو جنت کی نعمتیں اس کے دل میں آتی رہتی ہیں جس سے اس کے دل میں سکون رہتا ہے، خوشی ہوتی ہے، مسرت اور تسلی ہوتی ہے کہ یہ جنت کی نعمتیں ہیں۔ جو کفر اور کفر کے ساتھ برائی کرتا چلا جاتا ہے اس کو دوزخ سے اتنی نسبت ہو جاتی ہے کہ وہاں کی کیفیات اس کے دل میں آجاتی ہیں۔ موجودہ عہد کی فلمیں اس بات کی گواہ ہیں کہ اُن میں ایسے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں کہ بندہ آگ سے نکل رہا ہے، اس کے منہ کے

گرد آگ لپٹی ہوئی ہے چہرہ جل گیا ہے اور اندر سے شعلے نکل رہے ہیں۔ ایسے ہی ایک منظر تھا کہ بڑے سے کمرے میں ایک بہت ہی بڑا بچھو تھا۔ اب یہ خبر تو حدیث شریف میں دی گئی ہے کہ جہنم میں بڑے بڑے بچھو ہوں گے۔ یہ کافر قرآن اور حدیث تو نہیں پڑھتے پھر یہ کیسے جانتے ہیں کہ اتنے بچھو ہوں گے؟ یہ آگ کی منظر کشی کیسے کرتے ہیں؟ دراصل ان کے دل کا ربط دوزخ سے اتنا مضبوط ہو گیا ہے کہ دوزخ کی چیزیں منعکس ہو کر ان کے دل میں آتی ہیں پھر ویسا سوچتے ہیں اور فلمیں بناتے ہیں۔ آج تو سائنس بھی مانتی ہے کہ دل کا اپنا دماغ ہے اور دل جو سوچتا ہے وہ مادّی دماغ کو قبول کرنا پڑتا ہے جبکہ جو دماغ سوچتا ہے وہ دل کی مرضی ہے کہ اسے مانے یا نہ مانے۔ اس کا مطلب ہے کہ جہنم کی وہ تصویریں ان کے دلوں میں منعکس ہوتی ہیں اور ان کو جہنم سے اتنا ربط ہو گیا ہے کہ وہاں کی تصویریں ان کے ذہن میں آ گئی ہیں۔

قیامت اچانک آئے گی:

ابھی تو کفار کہتے ہیں کہ کہاں ہے قیامت، حساب کتاب کہاں ہے اور اگر سچے ہو تو اُسے لاؤ لیکن یہ نہیں جانتے، فرمایا: بَلْ تَأْتِيهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ ۔۔۔ بلکہ ان پر (قیامت) ناگہاں واقع ہو گی اور انہیں مبہوت کر کے رکھ دے گی بدحواس کر دے گی۔ قیامت تو بہت بڑا حادثہ ہے جو اچانک واقعہ ہو گی اور بدحواس کر دے گی جبکہ عندالموت ہی کفار کا حال برا ہو جاتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ عالی ہے کہ إِذَا مَاتَ أَحَدُكُمْ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهُ (الحلیہ الاولیاء) اوکما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اس کا مفہوم یہ ہے کہ جو مرتا ہے اس کی ایک طرح سے ذاتی قیامت تو قائم ہو جاتی ہے۔ ایک قیامت وہ ہے جس میں ساری مخلوق جمع ہو گی لیکن مرنے والے کی اپنی ذاتی قیامت تو موت کے وقت بھی قائم ہو جاتی ہے۔ کاش کوئی دیکھے کہ عندالموت بھی اللہ کے نیک بندوں اور کفار کی موت میں کتنا فاصلہ ہے۔ قیامت تو بہت بڑی بات ہے موت پر ہی جو چھوٹی قیامت ہے چہرے بگڑ جاتے ہیں، آنکھیں ابل پڑتی ہیں، گھبرا اٹھتے ہیں، زبانیں باہر آ جاتی ہیں۔

قیامت آئے گی تو کوئی روک نہیں سکے گا:

فرمایا: فَلَا يَسْتَطِيعُونَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ۝ پھر وہ نہ اس کو ہٹا سکیں گے اور نہ اُن کو مہلت دی جائے گی۔ ایک تو قیامت اچانک آئے گی اور بدحواس کر دے گی دوسری مصیبت یہ ہو گی کہ کوئی اسے روک نہیں سکے گا۔ کوئی ایسی تدبیر نہیں ہے کہ اسے دور کیا جائے یا ایسی فرصت نہیں ہو گی کہ بندہ توبہ ہی کر سکے کہ اسے اتنی مہلت مل جائے کہ وہ رجوع الی اللہ ہی کر لے۔ فرمایا، نہ روک سکیں گے اور نہ مہلت پائیں گے۔

کفر کا وطیرہ:

فرمایا: وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿٤١﴾ اور بے شک آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) سے پہلے پیغمبروںؑ کا بھی مذاق اڑایا گیا تو ان میں سے جن لوگوں نے مذاق اڑایا تھا سو اُن پر وہ (عذاب) واقع ہو گیا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ فرمایا، یہ کوئی پہلی دفعہ نہیں ہے بلکہ انبیاؑ کا مذاق اڑانا کفر کا وطیرہ رہا ہے۔ کفار خود کو حق پر سمجھتے تھے اور ساری امیدیں بتوں سے اور فرضی دیوی، دیوتاؤں سے وابستہ کیے ہوئے تھے۔ ان کے نزدیک یہ تصور بھی محال تھا کہ ان بتوں سے ہٹ کر بھی کچھ ہو سکتا ہے کیونکہ ان کے زعمِ باطل میں نظامِ کائنات اُن کے معبودانِ باطلہ چلا رہے تھے۔ انبیاؑ نے ہمیشہ انسانوں کو اللہ کی طرف دعوت دی، انہیں توحید کا سبق دیا اور کفر و شرک سے منع فرمایا لیکن اُن کی نصیحت کے جواب میں کفار نے انبیاؑ کا مذاق اڑایا۔ کفار کا ہمیشہ سے یہی کردار رہا۔ جس چیز کا وہ مذاق اڑاتے تھے وہ عذاب پھر اُن کے گلے پڑ گیا۔ دنیا میں بھی انہیں عذابِ الٰہی بھگتنے پڑے کیونکہ جن حقائق کا مذاق اڑاتے رہے وہ چیزیں سامنے آ گئیں کہ وہ تو حقائق تھے جن کی خبر اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم نے دی تھی چنانچہ وہ حقیقتیں سامنے آ گئیں اور انہیں بھگتنی پڑیں جس چیز کا مذاق اڑاتے تھے وہ اُن کے گلے پڑ گیا۔

سورۃ الانبیآء رکوع 4 آیات 42 تا 50

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ ؕ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ
مُّعْرِضُوْنَ ﴿۴۲﴾ اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا ؕ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ
اَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ ﴿۴۳﴾ بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ
عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ؕ اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِى الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ
اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾ قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ۖ وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ
اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ يٰوَيْلَنَآ
اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۴۶﴾ وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ
نَفْسٌ شَيْـًٔا ؕ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ؕ وَكَفٰى بِنَا
حٰسِبِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا
لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۸﴾ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ
مُشْفِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ؕ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۰﴾

فرما دیجیے کہ کون ہے جو رات اور دن رحمٰن (کے عذاب) سے تمہاری حفاظت فرماتا
ہے بلکہ یہ لوگ اپنے پروردگار کے ذکر سے منہ پھیرے ہوئے ہیں ﴿۴۲﴾ کیا اُن
کے پاس ہمارے علاوہ اور معبود ہیں جو اُن کو (عذاب سے) بچا سکیں وہ اپنی مدد تو کر
نہیں سکتے اور نہ ہم سے پناہ دیے جائیں گے ﴿۴۳﴾ بلکہ ہم نے اُن کو اور ان کے
باپ دادا کو فائدہ حاصل کرنے دیا یہاں تک کہ (اسی حال میں) ان کی عمریں بسر ہو

گئیں پھر کیا یہ نہیں دیکھتے کہ ہم زمین کو اس کے کناروں سے گھٹاتے چلے آتے ہیں تو کیا یہ لوگ غلبہ پالیں گے؟﴿۴۴﴾ فرمادیجیے کہ بے شک میں تم کو اللہ کے حکم کے مطابق (عذاب سے) ڈراتا ہوں اور یہ بہرے جس وقت (عذاب سے) ڈرائے جاتے ہیں تو پکار کو سنتے ہی نہیں﴿۴۵﴾ اور اگر ان کو آپ کے پروردگار کا تھوڑا سا عذاب بھی پہنچے تو ضرور کہنے لگیں گے وائے ہماری کم بختی! یقیناً ہم ہی ظلم کرنے والے تھے﴿۴۶﴾ اور ہم قیامت کے دن انصاف کا ترازو کھڑا کریں گے اور کسی شخص کی (ذرا بھی) حق تلفی نہ کی جائے گی اور اگر رائی کے دانے کے برابر بھی (کسی کا عمل) ہوگا تو ہم اس کو لا موجود کریں گے اور ہم حساب کرنے کو کافی ہیں﴿۴۷﴾ اور یقیناً ہم نے موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کو ایک فیصلہ کی اور روشنی کی اور پرہیزگاروں کے لیے نصیحت کی کتاب عطا فرمائی﴿۴۸﴾ جو لوگ بن دیکھے اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں اور وہ قیامت کا بھی خوف رکھتے ہیں﴿۴۹﴾ اور یہ مبارک ذکر (قرآن) ہے جسے ہم نے نازل فرمایا ہے تو کیا تم اس سے انکار کرتے ہو؟﴿۵۰﴾

تفسیر و معارف

اللہ کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں:

فرمایا: قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ۔۔۔ ”فرمادیجیے کہ کون ہے جو رات اور دن رحمٰن (کے عذاب) سے تمہاری حفاظت فرماتا ہے؟“ فرمایا، ان کفار سے سوال تو کیجیے کہ شب و روز میں ایسا کون ہے جو تمہیں اللہ کے عذاب سے بچا سکتا ہے؟ اللہ رحمٰن ہے۔ اس کی رحمانیت کے صدقے تمہیں زندگی ملی۔ لحہ بہ لحہ تمہیں فرصت مل رہی ہے۔ لمحے دنوں میں، دن ہفتوں، مہینوں سالوں میں بدل رہے ہیں اور تم جیے جا رہے ہو۔ تمہیں رزق مل رہا ہے آرام میسر ہے لیکن اگر اس مہربان اللہ کی نافرمانی کرو گے تو عذاب میں پکڑے جاؤ گے۔ کیا اس سے بچانے کے لیے کسی کا انتظام کیا ہے؟ کوئی ایسا ہے جو تمہیں اللہ کے عذاب سے بچالے؟

اگر اللہ تمہاری روزی بند کر دے تو کوئی ایسا ہے جو تمہیں دِلا سکے؟ اگر وہ تم پر کوئی بیماری مسلط کر دے تو کوئی ہے جو تمہیں بچا سکے؟ اگر وہ تمہاری زندگی چھین لے تو کوئی ہے جو تمہیں زندگی دے سکے؟ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ۔۔۔ تمہیں

کون تحفظ دے گا؟ شب و روز کا ہر لمحہ تم دستِ قدرت میں ہو۔ تم مجبور و بے بس ہو، وہ قادر ہے، جو چاہے، جب چاہے کرے، جب چاہے گرفت کرے، عذاب نازل کر دے تمہیں تباہ کر دے۔ کوئی ایسی ہستی اللہ کے سوا ہے جو ہر لحظہ ہر آن تمہاری حفاظت کر رہی ہو؟ اس کے باوجود کہ دن رات اللہ سے اتنی نعمتیں پا رہے ہیں پھر بھی: بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۴۲﴾ بلکہ یہ لوگ اپنے پروردگار کے ذکر سے منہ پھیرے ہوئے ہیں۔

یہ ایسے بدنصیب ہیں کہ اللہ کو یاد ہی نہیں کرتے۔ انہیں اللہ کی عظمت کا احساس ہی نہیں ہے، کسی لمحے انہیں عظمتِ الٰہی کا خیال ہی نہیں آتا۔ اللہ کریم نے انبیاؑ بھیجے اپنی کتابیں بھیجیں لیکن یہ ایسے بدنصیب ہیں کہ انبیاؑ کا انکار کیے ہوئے ہیں، اُن کی تعلیمات کا رڈ کیے بیٹھے ہیں۔ ان کے دل میں یہ خیال ہی نہیں گزرتا کہ اللہ کی ذات کتنی عظیم ہے، اس نے انہیں کتنی نعمتیں دے رکھی ہیں۔ یہ بات انہیں کبھی یاد ہی نہیں آتی۔

اللہ کریم فرماتے ہیں: اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا ؕ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ ﴿۴۳﴾ کیا اُن کے پاس ہمارے علاوہ اور معبود ہیں جو اُن کو (عذاب سے) بچا سکیں وہ اپنی مدد تو کر نہیں سکتے اور نہ ہم سے پناہ دیے جائیں گے۔

فرمایا، کیا انہوں نے اپنے معبودانِ باطلہ اور بُتوں سے یہ امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں کہ وہ انہیں ہماری گرفت سے بچا لیں گے؟ یہ بت تو اپنی مدد نہیں کر سکتے کسی اور کی کیا مدد کریں گے، اگر کوئی انہیں توڑ دے تو یہ اپنے آپ کو نہیں بچا سکتے، کسی اور کی کیا حفاظت کریں گے؟

زمانہء جاہلیت میں جزیرہ نمائے عرب میں بت پرستی اتنے عروج پر تھی کہ ہر قبیلے کا اپنا ایک بت تھا۔ ہر قبیلے میں جتنے خاندان ہوتے ان سب کا اپنا اپنا بت ہوتا تھا۔ خاندان میں جتنے گھر ہوتے، ہر گھر کا ایک بت ہوتا۔ ہر گھر میں جتنے افراد ہوتے تو ہر فرد نے اپنا ایک بت بنا رکھا تھا جسے وہ اپنی اپنی جیبوں میں لیے پھرتے تھے۔ ایک صحابیؓ اپنے قبول اسلام سے پہلے کی زندگی کے بارے میں بتاتے تھے کہ عہد جاہلیت میں وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیمات سننے سے بہت گریز کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم بتوں کی برائی کرتے ہیں چنانچہ ان کی باتیں سننی بھی نہیں چاہیں مبادا کہ بت ناراض ہو جائیں اور ان کا کچھ بھی نہ بچے۔ وہ چرواہے تھے اپنی مزدوری کرتے تھے۔ انہوں نے ایک کتا بھی پال رکھا تھا۔ ایک مرتبہ کہیں شہر سے باہر گئے ہوئے تھے اور کتا بھی ساتھ تھا تو ویرانے میں رفع ءحاجت کی ضرورت محسوس کی۔ انہوں نے ازراہ ادب اپنی جیب سے بت کو نکال کر بڑے احترام سے ایک پتھر پر رکھا اور خود اس سے اوجھل ہو کر فارغ ہونے کے لیے چلے گئے۔ کتے کی عادت ہوتی ہے کہ کوئی چیز رکھو اُسے سونگھنے لگ جاتا ہے تو اس نے پہلے تو اس بت کو سونگھا پھر اس پر پیشاب کر دیا۔ جب وہ واپس آئے تو یہ منظر

دیکھ کر بت سے مخاطب ہوئے کہ میں تو تجھے ساتھ لیے لیے پھرتا تھا کہ تُو میرا محافظ ہے لیکن تو اس کتے تک سے اپنی حفاظت نہیں کر سکا، میرے لیے کیا کرے گا؟ میں تو خوامخواہ تجھے لیے پھرتا ہوں۔ یہ کہہ کر بت کو زمین پر دے مارا اور کلمہ پڑھ لیا۔ یہی بات قرآنِ کریم دہرا رہا ہے کہ یہ بت ان کو عذابِ الٰہی سے کیا بچائیں گے یہ تو اپنا بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ ان کو کوئی سر پر اٹھائے یا پاؤں کے نیچے رکھ دے یہ نہ تو روسکتے ہیں نہ چیخ سکتے ہیں، نہ سُن سکتے ہیں نہ بتا سکتے ہیں اور نہ ہی حرکت کر سکتے ہیں کہ کسی کو روک سکیں۔ اللہ کریم فرماتے ہیں جو لوگ زندگی بھر ہمیں یاد نہیں کرتے، ہم بھی ان کی کوئی مدد نہیں کرتے۔ وہ بتوں کے پیچھے ہی لگے رہتے ہیں۔ یہ بت صرف پتھر کے ہی نہیں ہوتے، تصورات، خواہشات، آرزوؤں اور امیدوں کے بت بھی بن جاتے ہیں۔ اللہ کی نافرمانی کر کے کسی کو راضی کرنا اس امید پر کہ اس سے کوئی کام نکل آئے گا، یہ شرک ہے۔ جس کسی سے بھی ایسی اُمید وابستہ کر لی جائے، وہ بت ہے اور اللہ کی نافرمانی میں اس کی اطاعت کرنے والا دراصل اس کی عبادت کر رہا ہے۔ پتھر کے بتوں کا توڑنا تو آسان ہے ان کی بے بسی ظاہر کرنا آسان ہے لیکن یہ نظر نہ آنے والے بت زیادہ خطرناک ہیں۔

اللہ کی کرم نوازی:

فرمایا: بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ۔۔۔ بلکہ ہم نے اُن کو اور اُن کے باپ دادا کو فائدہ حاصل کرنے دیا یہاں تک کہ (اسی حال میں) ان کی عمریں بسر ہو گئیں۔

یہ لوگ بتوں اور معبودانِ باطلہ کے سامنے سجدہ ریز ہیں لیکن ہمارا احسان نہیں مانیں گے حالانکہ نہ صرف ان کو بلکہ ان کے باپ دادا کو، ان کے خاندانوں اور اولاد کو بھی ہم نے زندگی دی اور بے پناہ نعمتیں دیں۔ اُن کو بے شمار صلاحیتیں دیں اور اُن کی عمریں بیت گئیں ہماری نعمتوں سے مستفید ہوتے۔ ہم تو انہیں دینے میں تھکے نہیں ہم نے ان کا رزق بند نہیں کیا، ان کے سانس کی آمد و شد بند نہیں کی، ان کے دل کی دھڑکن بند نہیں کی بلکہ انہیں بے پناہ نعمتیں دیتے چلے جا رہے ہیں۔

اسلام پھیلتا ہے رکتا نہیں:

فرمایا: اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۴۴﴾ پھر کیا یہ نہیں دیکھتے کہ ہم زمین کو اس کے کناروں سے گھٹاتے چلے آتے ہیں تو کیا یہ لوگ غلبہ پالیں گے؟

کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلانِ نبوت فرمایا تو انہوں نے روکنے کی کتنی کوشش کی لیکن روک نہ سکے۔ ایک وقت ایسا بھی تھا کہ روئے زمین پر صرف ایک ہستی تھی جو اللہ کا نام لیتی تھی۔ ایک سے دو ہوئے پھر دو سے چار، چار سے دس یوں اللہ کے نام لیوا بڑھتے گئے۔ کفر نے روکنے کی پوری کوشش کی لیکن بالآخر قوتِ اسلامی وہاں تک پہنچی کہ کفر پر زمین تنگ ہونا شروع ہو گئی اور اب دیکھیں کہ کفر پر عرصہءحیات تنگ ہو رہا ہے۔

اسلامی افواج کی فتوحات کو دیکھیں، ریاستِ اسلامی کے کمالات اور ترقی کو دیکھیں تو کفر کے لیے تو زمین تنگ ہو رہی ہے۔

قرآن کریم اسلام کا یہ کمال بیان فرما رہا ہے کہ اسلام پھیلتا ہے، رکتا نہیں ہے، کوئی بھی طاغوتی طاقت اُسے روک نہیں سکتی۔ کیا کفار کو یہ خیال نہیں آتا کہ وسائل، طاقت، دولت اور لاؤ لشکر تو اُن کے پاس ہیں لیکن مسلمانوں نے، جو بظاہر اسبابِ دنیا سے خالی ہیں، محض نصرتِ الٰہی، قوتِ ایمانی سے ان کی بڑی بڑی ریاستوں کو الٹا کے رکھ دیا ہے۔ مسلمانوں نے ان سے وسائل چھین لیے ہیں اور ان پر عرصہء حیات تنگ کر دیا ہے۔ کیا یہ نہیں دیکھ رہے کہ قیصر و کسریٰ جیسی عظیم سلطنتیں مسلمانوں کے زیر نگیں آ گئی ہیں اور یمن کے خزانے مدینہ منورہ میں تقسیم ہونے لگے تو کیا یہ کفار آخرت میں غالب آ جائیں گے؟ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ﴿۴۴﴾ کیا یہ قیامت کو مقابلہ کر لیں گے؟ دنیا میں تو کر کے دیکھ لیا۔ یہاں تو مسلمانوں کا ہاتھ نہیں روک سکے۔ کیا یہ آخرت کے عذابوں کو روک لیں گے؟

فنا فی اللہ:

مسلمان تو وہ ہے جس پر قرآن فخر کر رہا ہے۔ اللہ کریم فخر کر رہے ہیں۔ کام مسلمان کر رہے ہیں لیکن اس کی نسبت اللہ کریم اپنی طرف کر رہے ہیں۔ اسی کو فنا فی اللہ کہا جاتا ہے۔

مسلمانوں کا حقیقی سرمایہ:

چھٹی صدی عیسوی کا آخری دور جو بعثتِ عالی کا زمانہ ہے اگر اُسے دیکھا جائے تو تمام مادی وسائل پر کفار کا قبضہ نظر آتا ہے۔ بعثتِ عالی کے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس مادّی وسائل میں سے کچھ بھی نہیں تھا۔ ''حملہء حیدری'' میں کیا خوب کہا گیا ہے:

'کجا بود دنیا با مصطفٰی'

کہ دنیوی اعتبار سے، وسائل کے اعتبار سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس کچھ نہ تھا۔ عالمِ کفر میں قیصر و کسریٰ جیسی سپر پاورز تھیں جن کے غلاموں نے بھی سونے کے کنگن پہن رکھے ہوتے تھے اور لاکھوں کے لشکر ان کے پاس تھے۔ دنیا پر انہی غیر اسلامی ریاستوں کا راج تھا اور مادّی اور افرادی قوت انہی کے پاس تھی۔ مسلمان اگرچہ بے ساز و سامان تھے لیکن اللہ کی طاقت ان کے ساتھ تھی، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کا دامن ان کے ساتھ تھا اور دین کی طاقت ساتھ تھی چنانچہ انہوں نے کفر پر زمین تنگ کر دی۔ قیصر و کسریٰ کی سلطنتیں فتح کر لیں، اُن کے خزانے مدینہ منورہ کی گلیوں میں غریب غربا میں تقسیم ہوئے، مجاہدین و مساکین میں تقسیم ہوئے۔ مادّی وسائل کفار کے قبضے سے نکل کر مسلمانوں کے قدموں میں آ گئے۔ یہ اسلام کی شان ہے۔

عہدِ حاضر کا عالمِ اسلام:

آج دنیا میں چھپن مسلمان ریاستیں ہیں کہ یہاں مسلمانوں کی حکومت ہے۔ انہیں اسلامی ریاستیں نہیں کہا جاسکتا کہ اسلامی ریاست وہ کہلائے گی جہاں اسلام کی حکومت ہو۔ مزے کی بات یہ ہے کہ دنیا بھر کے وسائل مسلمان ریاستوں کے پاس ہیں۔ اہل مغرب کی تحقیق کے مطابق وسائلِ زندگی کا ساٹھ فیصد حصّہ مسلمانوں کے پاس ہے لیکن وہ جھوٹ کہتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے پاس کم ازکم اسّی فیصد وسائل زندگی ہیں۔ گرم پانیوں کی بندرگاہیں مسلمان ریاستوں کے پاس ہیں، سونے اور قیمتی دھاتوں کے زیرزمین خزانے ان کے پہاڑوں میں ہیں۔ قدرتی گیس اور تیل کے ذخائر ان کے پاس ہیں اور زمین سے اُگنے والی اجناس، سبزیاں اور پھل وغیرہ کا اسّی فیصد سے زیادہ حصّہ ان مسلمان ریاستوں میں کاشت کیا جاتا ہے۔ اگر صرف پاکستان کو دیکھیں تو روئے زمین پر پاکستان واحد ملک ہے جس میں زمین سے اُگنے والی ہر فصل اُگتی ہے، ہر پھل اور پھول اُگتا ہے۔ اس کے پہاڑوں میں سونے، چاندی اور پیتل کے ذخائر ہیں۔ زیرزمین قدرتی گیس اور تیل کے ذخائر کے علاوہ کوئلہ، بے شمار معدنیات اور قیمتی پتھروں کے بھی بے حساب ذخائر موجود ہیں۔ اس ملک کی سرزمین پر دنیا کی ہر جڑی بوٹی موجود ہے، ہر دوا موجود ہے۔ اس کے کھیتوں میں بے پناہ غلّہ بھی ہوتا ہے، دنیا کی ہر سبزی، ہر پھل یہاں پایا جاتا ہے۔

افسوس کہ اتنے وسائل کے باوجود اس ملک کے مکین بلکہ آنے والی نسلیں مقروض ہوچکی ہیں کہ اس قدر قرض میں دھنسا دیے گئے ہیں۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ ہر حکومت اپنی سب سے بڑی کامیابی اسی بات کو گردانتی ہے کہ ہم نے کتنا قرضہ مزید حاصل کرلیا ہے۔ جب مسلمانوں کے پاس وسائل نہیں تھے تو اللہ کریم فرماتے ہیں کہ اے کافرو! دیکھ لو تم پر عرصہ حیات تنگ ہورہا ہے۔ تم اسلام کو دبانا چاہتے تھے، مسلمان تم پر گھیرا تنگ کررہے ہیں۔ اللہ نے مسلمان مجاہدین کی نسبت اپنی طرف کی ہے کہ یہ میرے بندے میرا کام کررہے ہیں، جن کی فتوحات سے تم پر زمین تنگ کررہا ہوں۔ آج تمام وسائل کے ہوتے ہوئے آخر مسلمان مقروض کیوں ہیں؟ آج دنیا کے وسائلِ زندگی میں اسّی فیصد سے زیادہ وسائل رکھنے والے مسلمان گداگر ہیں کفار سے خیرات مانگ کر کھارہے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

ببیں تفاوتِ رہ از کجا است تابہ کجا

یہ کہاں سے گرے، کہاں جا پہنچے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان کو نہ خود پر اعتماد رہا، نہ اللہ پر اور نہ ہی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم پر بلکہ یہ کافر کی طرح بننے میں عزت تلاش کرتا ہے، ان جیسا نظر آنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ ایک وہ مسلمان تھے جو فنا فی اللہ تھے اور ایک آج ہیں کہ کافروں سے خیرات مانگ کر کھارہے ہیں۔ کافروں کی اُترن پہن کر فخر کرتے ہیں۔ ہم شکل بھی کافر جیسی بنانا چاہتے ہیں، کھانے پینے کے طور طریقے بھی انہی کے اپناتے ہیں۔ کافر

چھری کانٹے سے کھاتا ہے تو ہمارا کھانا بھی چھری کانٹے کے بغیر حلق سے نہیں اترتا تو جب ہمارا نہ کوئی قبلہ رہا نہ کسی بات پر فخر رہا۔ ہمیں نہ اللہ پر بھروسہ رہا نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر فخر رہا تو اس کا انجام یہی تھا۔

جن مسلمانوں پر اللہ کریم فخر فرمارہے ہیں ہم انہیں قدامت پسند کہتے ہیں۔ اگر ان جیسا بننے کا کہا جائے تو آج کے لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں قدیم دور میں لے کر جانا چاہتے ہیں ہمیں ترقی سے روکتے ہیں۔ ان سے پوچھا جائے کہ کیا ترقی کررہے ہو تم؟ گداگری میں ترقی کررہے ہو، مانگنے میں ترقی کررہے ہو؟ تمہاری تہذیب بھی مانگی ہوئی زبان بھی مانگی ہوئی، لباس بھی مانگا ہوا، غذا بھی مانگی ہوئی ہے اسی لیے تو تمہاری آبروٹی وی پر اچھلتی کودتی نظر آتی ہے۔ تمہاری تو قومی آبرو ہی نہیں ہے، آبرو بھی مانگی ہوئی ہے۔ آج ہم ٹی وی پر نوجوان لڑکیوں کی اچھل کود دیکھ کر بڑے محظوظ ہوتے ہیں۔ ہم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ یہ ہماری بیٹیاں ہیں۔ کیا کوئی شریف آدمی اپنی بہو بیٹی کو اس طرح دیکھنا پسند کرتا ہے؟ یہ بھی ہماری قوم کی بیٹیاں ہیں، کلمہ گو مسلمان ہیں تو پھر انہیں کیا ہوگیا ہے یہ کیوں ایسا کررہی ہیں؟ انہیں اس تہذیب کا ٹیکہ لگ گیا۔ ملک میں ایک چپڑاسی سے لے کر اعلیٰ ترین عہدیدار تک سب کی گردن میں انگریز کی غلامی کا پٹہ پڑا ہوا ہے۔ ہماری تو کوئی اپنی زبان بھی نہیں۔ دنیا بھر کے حکمران اپنی قومی زبان میں بات کرتے ہیں، مترجم ساتھ رکھ لیتے ہیں لیکن ہم نے ہر موقع انگریزی ہی بولنی ہے۔ (جبکہ مخاطب 18 کروڑ عوام انگریزی سمجھتے ہی نہ ہوں) انگریزی زبان ایک عجیب سی زبان ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں انگریزوں سے زیادہ انگریزی کے غمخوار بیٹھے ہیں۔ یورپ، امریکہ میں اگر کوئی غلط جملہ بول دے یا Spelling غلط کردے لیکن بات سمجھ میں آجائے تو وہ لوگ درگزر کرتے ہیں لیکن یہاں اگر ایک حرف غلط لکھ دو تو دس نکتہ چیں پیدا ہوجاتے ہیں۔ ہم انگریزوں کی نسبت زیادہ انگریزی کے غلام ہیں۔ افسوس کہ آج مسلمان کافر سے مانگ کر کھانے پر فخر کرتا ہے، کافر جیسا نظر آنے پر فخر کرتا ہے۔ کسی نے کہا ہے 'مسلمانی در کتاب و مسلمانان در گور' کہ مسلمان قبروں میں ہیں اور اسلام کتابوں میں۔ آج مسلمان کافر جیسا بننے پر اتراتا ہے تو ویسے ہی پھر نتائج بھی سامنے آرہے ہیں۔

وحی کو سنی سنائی بات نہ سمجھو:

فرمایا: قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ۔۔۔ فرمادیجیے کہ بے شک میں تم کو اللہ کے حکم کے مطابق (عذاب سے) ڈراتا ہوں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے فرمادیں کہ نادانو! میں تمہیں کسی بندے کی بات، کوئی سنی سنائی بات سن کر پیغام نہیں پہنچارہا بلکہ اللہ کا پیغام پہنچارہا ہوں۔ میں تمہیں جن چیزوں سے ڈرارہا ہوں ان باتوں پر مجھے اللہ کی طرف سے وحی آتی ہے اور یہ معمولی بات نہیں ہے۔ میں تمہیں کسی انسان کی بات یا کسی انسان کے کہنے پر تم سے کچھ نہیں کہہ

رہا بلکہ یہ مجھ پر اللہ کی طرف سے وحی آتی ہے۔ اس وحی میں مجھے جو علوم عطا ہوئے ہیں اور تم تک پہنچانے کا جو حکم ملا ہے تو خوب سن لو اور آنے والے مشکل اور تکلیف دہ وقت سے بروقت بچنے کی تدبیر کرلو۔ یہ بات میں تمہیں وحی کے مطابق بتا رہا ہوں اور وحی کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ سن کر مذاق میں اڑا دو۔ وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ﴿۴۵﴾ اور یہ بہرے جس وقت (عذاب سے) ڈرائے جاتے ہیں تو پکار کو سنتے ہی نہیں۔

ان لوگوں کے مزاج میں بہرہ پن آ گیا ہے کہ جب انہیں عذاب سے ڈرایا جاتا ہے تو گویا سنتے ہی نہیں۔ بات کو سنی ان سنی کر دیتے ہیں، اس کی طرف خیال ہی نہیں کرتے۔ جب اُن کو اللہ کے عذاب سے بچنے کا کہا جاتا ہے تو بات اُن کے سر سے گزر جاتی ہے اور مذاق اڑاتے ہیں۔ کیا مذاق اڑانے سے وہ مصیبت ٹل سکے گی؟ اس مصیبت کو ٹالنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلّم اس عذاب سے بچنے کا جو طریقہ ارشاد فرماتا ہے، اس طریقے کو اختیار کرلو ورنہ مذاق اڑانے یا انکار کرنے سے تم بچ نہیں پاؤ گے۔ انسان غفلتوں میں پڑا رہتا ہے اور اللہ کی دی ہوئی بے پناہ نعمتیں استعمال کر رہا ہوتا ہے لیکن اسے ادراک نہیں ہوتا کہ اس کے وجود کا ہر ذرہ رحمتِ الٰہی کا محتاج ہے۔

عذابِ الٰہی کفار کو پچھتاوے اور حسرت میں مبتلا کر دے گا:

فرمایا: وَلَىِٕنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ يٰوَيْلَنَاۤ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ﴿۴۶﴾ اور اگر ان کو آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کے پروردگار کا تھوڑا سا عذاب بھی پہنچے تو ضرور کہنے لگیں گے وائے ہماری کم بختی! یقیناً ہم ہی ظلم کرنے والے تھے۔

ان کفار کو اگر عذابِ الٰہی کا ذرہ برابر حصہ بھی چُھو جائے تو چیخ اٹھیں گے کہ ہم سے بہت غلطی ہوئی اور ہم نے اللہ کی ناشکری اور نافرمانی کر کے اپنے آپ پر بہت زیادتی کی، بہت ظلم کیا۔ جب کفار کو عذاب کا یہ تجربہ ہوگا تو توبہ یا اصلاح کا موقع نہیں ہوگا۔ ہاں یہ حسرت مزید دکھی کرتی رہے گی کہ کیا کرتے رہے، کیوں کرتے رہے؟ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن تب واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہوگا۔

دنیا میں معمولی سی تکلیف انسان کو پریشان کر دیتی ہے ذرا سا دانت میں درد ہو جائے یا سر کو درد ہو جائے تو برداشت نہیں ہوتی چہ جائیکہ دوزخ کا کوئی ذرہ چھو جائے۔

قیامت کا دن، انصاف کا دن ہے:

فرمایا: وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْــٴًـا ؕ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ؕ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ﴿۴۷﴾ اور ہم قیامت کے دن انصاف کا ترازو کھڑا کریں گے اور کسی شخص کی (ذرا بھی) حق تلفی نہ کی جائے گی اور اگر رائی کے دانے کے برابر بھی (کسی کا عمل) ہوگا تو ہم

اس کو لاموجود کریں گے اور ہم حساب کو کافی ہیں۔

قیامت کے دن انصاف کا ترازو رکھا جائے گا اور کسی کے ساتھ ذرہ برابر بھی زیادتی نہیں کی جائے گی بلکہ اللہ کریم نیکیوں کا اجر بہت بڑھا کر دیں گے جبکہ جرم کی سزا جرم کے مطابق دی جائے گی۔ یہ الگ بات ہے کہ سزا کا نام ہی ہیبت ناک ہوتا ہے یہ بھی یاد رہے کہ کسی نے رائی کے دانے کے برابر بھی کوئی عمل کیا ہوگا تو اس کو بھی اس میدان میں حاضر کر دیا جائے گا۔ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ حساب کرنے کو ہم کافی ہیں۔ اس روز کوئی عمل بھی پوشیدہ نہیں رہے گا، سوائے اس کے کہ اللہ کسی کو توبہ کی توفیق دے دیں تو اللہ کریم کی بے پناہ اور رعایتیں بھی ہیں۔ قرآن میں ارشاد ہے:
اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ۔۔۔ (ھود: 114) نیکیاں گناہوں کو مٹا دیتی ہیں کہ سچی توبہ گزشتہ گناہوں کو صاف کر دیتی ہے اور گناہ باقی نہیں رہتے۔ یہ ضروری ہے کہ توبہ محض زبانی نہ ہو بلکہ عملاً عقیدے کی بھی اصلاح ہو اور عمل بھی صالح ہو جائیں۔ انسان کا عقیدہ اور کردار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع ہو جائے تو ایسی توبہ پہلے گناہوں کو مٹا دیتی ہے۔ یہ اللہ کریم کی طرف سے عطا کردہ رعایتیں ہیں اور کرم ہے۔ فارسی میں کسی نے کیا خوب کہا تھا

رحمتِ حق بہانہ می جوید

اللہ کی رحمت بہانے تلاش کرتی ہے۔ اللہ کی رحمت تو بہانہ ہوتا ہے چھوٹے چھوٹے بہانے ہوتے ہیں لوگوں کو بخشنے کے تاکہ انہیں انعامات نصیب ہوں۔

دنیا میں سب سے مشکل کام دل کو غیر اللہ سے پاک کرنا ہے اور یہ بہت بڑا کام ہے کہ دل میں اللہ کی محبت ہو، اللہ کی طلب ہو، اس کی اطاعت کا جذبہ ہو اور دل اس کی نافرمانی میں لذت نہ محسوس کرے بلکہ اُسے دکھ ہو۔ اگر غلطی ہو جائے تو توبہ کرے اور اپنی اصلاح کرے کیونکہ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ میدانِ حشر میں انسان کا ذرّہ برابر عمل بھی حاضر کیا جائے گا۔ ہر جملہ اور ہر سوچ، ہر حرکت سامنے لائی جائے گی۔ دنیا میں تو ایک پردہ ہے۔ ہم جو ظاہر کرتے ہیں، ظاہر ہو جاتا ہے اور گناہ چھپ جاتے ہیں حالانکہ دنیا میں بھی کسی نہ کسی طرح ظاہر ہو جاتے ہیں لیکن بہر حال انسان کوشش کرتا ہے کہ اس کے گناہوں پر پردہ پڑا رہے؟ انسان اپنے شب و روز پر نگاہ کرے تو یہ حقیقت کھلے گی کہ بظاہر ہم لوگوں کو کیا نظر آتے ہیں اور حقیت میں کیا ہوتے ہیں؟ بظاہر کیا باتیں کرتے ہیں اور سوچتے کیا ہیں، دل میں کیا ارادے ہوتے ہیں؟ ہر کوئی اسی کوشش میں ہے کہ دنیا میں اپنے آپ کو اچھا اور شریف ظاہر کرے لیکن روزِ محشر یہ انسانی کوشش کامیاب نہیں ہوگی۔ وہاں قادرِ مطلق ہر بات کو سامنے رکھ دیں گے۔ نیکی کو بھی اور برائی کو بھی، بھلی سوچ کو بھی اور بری سوچ کو بھی، اچھے ارادوں کو بھی اور برے ارادوں کو بھی، سب کچھ حاضر کر دیا جائے گا۔ یہاں تو ایک بند لفافہ ہے وہاں وہ کھل جائے گا اور اندر کی چیزیں باہر آ جائیں گی۔

کلامِ الٰہی کی عظمت:

فرمایا: وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۸﴾ اور یقیناً ہم نے موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کو ایک فیصلہ کی اور روشنی کی اور پرہیزگاروں کیلئے نصیحت کی کتاب عطا فرمائی۔

اللہ کریم فرماتے ہیں کہ ہمارا احسان ہے کہ ہم نے انبیاؑ بھیجے اور کتابیں بھیجیں۔ ہر کتاب اپنے وقت میں دلوں کو روشن کرنے والی، گناہوں کو مٹا دینے والی نیکیوں کی ترغیب دینے والی، واصل باللہ کرنے والی تھی۔ اللہ کریم نے موسیٰ علیہ السّلام اور ہارون علیہ السّلام کو بھی ایسی کتاب عطا کی جو فیصلہ کن تھی، 'فرقان' تھی یعنی حق اور باطل کو الگ الگ کرنے والی تھی۔ اللہ کی کتاب سے سچ اور جھوٹ، کھرا اور کھوٹ الگ ہوگیا، وَضِيَآءً۔۔۔ اور وہ روشنی تھی، نور تھا۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ تھی کہ جو صدقِ دل سے اس پر یقین کر لیتا اور عمل کی اپنی بھرپور سعی کرتا، اس کے دل کو روشن کر دیتی تھی۔ وہ روشنی تھی جو سینوں کو منور کر دیتی تھی۔

کتاب اللہ سے نصیحت اہلِ تقویٰ کو نصیب ہوتی ہے:

اللہ کی کتاب اوّل تا آخر سراپا نصیحت تھی، لوگوں کو برائی سے روکنے والی اور بھلائی کی ترغیب دینے والی لیکن نصیحت تو اچھے بندے ہی سمجھتے ہیں۔ برائی کے راستے پر گامزن بندے کو اس سے کیا غرض بلکہ اسے نصیحت کی جائے تو وہ چڑ جاتا ہے، خفا ہو کر جھگڑنے لگتا ہے۔ اُسے تو نصیحت کڑوی لگتی ہے۔ فرمایا: ذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۸﴾ نصیحت متقین کے لیے ہوتی ہے۔ وہ لوگ جو صاحبِ تقویٰ ہوں، جن کو اللہ کی عظمت پر یقین نصیب ہو جائے اور الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ۔۔۔ یہ وہ ہیں جو بن دیکھے اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں۔ متقی وہ لوگ ہیں جو غائبانہ اپنے پروردگار کی عظمت کا احساس رکھتے ہیں اس سے ڈرتے ہیں اور اس کی نافرمانی نہیں کرتے۔ یہاں پر يَخْشَوْنَ کا لفظ ہے، جو خشیت سے ہے۔ اصل میں اردو کا دامن اتنا تنگ ہے اور اردو کے پاس ایسا کوئی نہیں جو تقویٰ، جو خشیت کو سمو سکے چنانچہ 'ڈر' لکھ دیا جاتا ہے۔ جب ڈر کی نسبت اللہ کریم کی طرف کی جائے یعنی جیسے ابھی گزرا ہے کہ 'اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں، تو اسے عام ڈر نہیں سمجھنا چاہیے۔ ڈر تو موذی جانور کا بھی ہوتا ہے، چور ڈاکو کا بھی، جنات وشیاطین کا بھی ہوتا ہے۔ ہم تو حاکم وافسر سے بھی ڈرتے ہیں پولیس سے بھی ڈرتے ہیں، بدمعاشوں اور لفنگوں سے بھی ڈرتے ہیں۔ یہ سب عمومی ڈر ہیں۔ ایک ڈر ہوتا ہے کہ جب کسی کے ساتھ محبت کا تعلق ہو، وہ عزیز، رشتہ دار ہو یا کوئی محسن ہو تو انسان بات کرنے سے پہلے، کام کرنے سے پہلے احساس رکھے کہ میں کہیں کچھ ایسا نہ کہہ یا کر بیٹھوں کہ وہ مجھ سے ناراض ہو جائے۔ گویا یہ تعلق میں دراڑ آنے کا ڈر ہوتا ہے کہ کہیں وہ خفا نہ ہو جائیں۔ اگر وہ نسبت، وہ تعلق، اللہ کریم سے بن جائے اور انسان میں یہ احساس پیدا ہو جائے کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اور وہ میرا معبود ہے۔ میں کوئی ایسا کام نہ

کروں کوئی ایسی بات نہ کہوں جس سے میرا یہ رشتہءعبودیت بگڑ جائے۔ وہ میرا معبود ہے، میں اس کی عبادت کرتا ہوں، وہ میرے روبرو ہے، میں اس کے حضور اپنی گزارشات پیش کرتا ہوں، اس سے مدد چاہتا ہوں، اپنی مصیبتوں کا حل چاہتا ہوں۔ مجھے اس بات سے ڈر لگتا ہے کہ رب کریم سے جو میرا یہ رشتہ ہے اس میں بال نہ آجائے، دراڑ نہ آجائے۔ یہ ڈر خشیت کہلاتا ہے۔ فرمایا، اہلِ تقویٰ وہ لوگ ہیں جو غائبانہ اللہ کی عظمت سے لرزاں وترساں رہتے ہیں۔ اللہ کی ذات سب سے بڑا غیب ہے جو ہر وقت، ہر جگہ موجود ہے۔ حاضر وناظر ہے، دیکھتا سنتا ہے لیکن ہم نہیں دیکھ سکتے نہ ہی عقل سمجھ سکتی ہے۔ وہ خالق ہے، ہم مخلوق ہیں اور خالق مخلوق کے احاطہءادراک میں نہیں آسکتا۔ جو چیز عقل کے دائرے میں آجائے گی چونکہ عقل مخلوق ہے تو وہ بھی مخلوق ہوگی۔ خالق اس سے وراءالوراء ہے نہ اسے عقلاً سمجھا جا سکتا ہے نہ آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کلامِ باری کا شرف حاصل تھا۔ اپنی گزارشات براہِ راست پیش کرتے تھے، اللہ کریم سنتے تھے۔ کلامِ باری نے شوقِ دیدار بھڑکا دیا تو عرض کی: رَبِّ اَرِنِیۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَیۡكَ۔۔۔ اے میرے پروردگار! میں آپ کو دیکھنا چاہتا ہوں، مجھے اپنا آپ دکھا دیجیے۔ میرے سامنے آجائیے۔ فرمایا: لَنۡ تَرٰىنِیۡ۔۔۔ (الاعراف:143) اس دنیا میں اور اس دنیا کی آنکھوں سے آپؑ مجھے نہیں دیکھ سکتے۔ اللہ کریم کی ذات اتنا بڑا غیب ہے جسے دنیا میں انبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی نہیں دیکھ سکتے۔ اللہ کی موجودگی کا احساس ہونا عظمتِ انسانی ہے لیکن یہ حضوری کا احساس دل میں ہو سکتا ہے بندہ دیکھ نہیں سکتا اور یہی درجہءایمان مطلوب ہے۔ جب انسان یہ فکر کرے کہ میرے اللہ کے ساتھ میرا معاملہ کہیں بگڑ نہ جائے اور غائبانہ اللہ کی عظمت سے ڈرتا رہے تو اس کا مطلب ہے اس کا ایمان بالغیب ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی بات پر کلّی طور پر یقین کیا جائے، اعتماد کیا جائے۔ کہیں یقین میں یہ دراڑ نہ آجائے کہ (نعوذ باللہ) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم فرما تو رہے ہیں، پتا نہیں ایسا ہوگا کہ نہیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو سارا معاملہ ختم ہو جائے گا، اس لیے یہ ضروری ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے جو کچھ فرمایا ہے اس کی حقانیت پر قطعی یقین ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے قیامت کے بارے، آخرت کے بارے فرشتوں کے بارے اللہ کی عظمت کے بارے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس پر پختہ ایمان ہو کہ وہ کلّی سچ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم سے پہلے جو انبیاؑ تشریف لائے اُن کی نبوت مخصوص قوموں کے لیے تھی، مخصوص علاقوں کے لیے تھی اور بعض اوقات ایک وقت میں کئی نبیؑ موجود تھے۔ بنیادی عقائد اور اصول سب کے ایک تھے، فرق احکامات میں تھا۔ قوموں کی استعداد کے مطابق شرعی احکامات تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو کتاب دی گئی وہ بھی حق و باطل میں فیصلہ کرنے والی اور اللہ کی طرف سے ضیاء، روشنی اور بہت پراثر نصیحت تھی جس سے صرف صاحبِ تقویٰ ہی مستفید ہوتے تھے جو غائبانہ اللہ کی عظمت سے ڈرتے رہتے تھے۔

فرمایا: وَهُمۡ مِّنَ السَّاعَةِ مُشۡفِقُوۡنَ ﴿۴۹﴾ اور وہ قیامت کا بھی خوف رکھتے ہیں۔ متقین کا حال یہ ہے کہ بات کرتے وقت، کوئی بھی کام کرتے وقت انہیں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ قیامت کے روز یہ بات، یہ کام سامنے آئے گا، یہ بات سرِ میدان ہوگی۔ وہ اس خیال سے لرزاں وترساں رہتے ہیں کہ دنیا میں کوئی ایسی بات منہ سے نہ نکلے جو کل میدانِ حشر میں شرمندگی کا باعث بن جائے یا کوئی کام ایسا نہ ہوجائے جو حشر میں رسوائی کا سبب بن جائے۔ اللہ کریم کا یہ احسان ہے کہ جو اللہ کے نیک بندے ہیں، مومن ہیں، جو دنیا سے ایمان سلامت لے جائیں گے، اللہ کریم انہیں رسوائی کے عذاب سے بچالیں گے۔ اگر کسی مومن کا حساب ہوگا تو بھی اللہ اسے اپنے بندے اور اپنے درمیان رکھیں گے اس کے گناہ مخلوق پر افشا نہیں کریں گے۔ نورِ ایمان کی برکت وہاں بھی یہ ہوگی کہ اللہ کریم معاف فرمادیں گے، مومن کا اعمال نامہ دوسروں میں نشر نہیں فرمائیں گے۔ اللہ غفور رحیم ہے اس کی رحمت بہت وسیع ہے بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ عالی کا مفہوم ہے کہ زندگی میں کسی مومن کی ایک تسبیح قبول ہوگئی تو اس کی نجات کے لیے کافی ہے۔ ضرورت بس اس بات کی ہے کہ وہ تسبیح حضورِ قلب کے ساتھ دل کی گہرائی سے اٹھے اور اس پر یقینِ محکم ہو۔ جبکہ غیر مومن کو رسوائی کا عذاب بھی ہوگا اس کے سارے کردار کو سب کے سامنے رکھا جائے گا اور سخت محاسبہ ہوگا۔ سو متقی وہ لوگ ہیں جو اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بات پر یقین کرتے ہیں اور بن دیکھے اللہ کی عظمت پر ایسا یقینِ کامل رکھتے ہیں کہ ہر آن اسے اپنے پاس پاتے ہیں۔ ہمہ وقت اللہ کی اطاعت کرتے ہیں، ہمہ وقت اس کو یاد کرتے ہیں اور اس کی یاد کو دلوں میں بساتے ہیں۔ انہیں قیامت پر اتنا یقین ہے کہ قیامت کے معاملات سے ڈرتے رہتے ہیں۔ اس بات سے لرزاں وترساں رہتے ہیں کہ قیامت کو کیا ہوگا۔

قرآنِ کریم کی عظمت:

فرمایا: وَهٰذَا ذِكۡرٌ مُّبٰرَكٌ اَنۡزَلۡنٰهُ۔۔۔ اور یہ مبارک ذکر (قرآن) ہے جسے ہم نے نازل فرمایا ہے۔ یہ بہت بابرکت ذکر ہے جو پہلی تمام کتابوں کی جامع ہے۔ اس سے پہلے جتنے بھی انبیاؑ اور کتابیں آئیں یہ قرآن اُن سب کی تصدیق کرتا ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ اپنے وقت میں ہر نبیؑ نے جو تعلیم دی، اس پر جو کتاب نازل ہوئی وہ نبیؑ بھی سچا، برحق تھا اور اس کی کتاب بھی برحق تھی، اس وقت کی ضرورت کے لیے کافی تھی لیکن جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو تمام پہلی کتابوں پر عمل منسوخ ہوگیا گو ایمان اب بھی ہے۔ ایک مسلمان تمام انبیاؑ پر ایمان رکھتا ہے، تمام کتبِ سماوی کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے لیکن عمل صرف قرآن کریم پر کرے گا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ مغرب کو بڑا اعتراض ہے کہ اسلام نے سچائی پر اجارہ داری بنا رکھی ہے اور

مسلمان کہتے ہیں کہ صرف اسلام ہی سچا ہے جبکہ سب مذاہب اللہ کی طرف سے ہیں اور مختلف انبیاءؑ پر مختلف کتابیں بھی نازل ہوئیں۔ کہتے ہیں کہ مسلمان یہ زیادتی کرتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ صرف اسلام ہی سچا ہے۔ They say they have monopoly over truth حالانکہ اسلام کا یہ موقف ہرگز نہیں ہے اور وہ تمام انبیاءؑ اور کتابوں کی صداقت پر یقین رکھتا ہے اور ایمان لانے کا حکم دیتا ہے۔ جہاں تک اجارہ داری (Monopoly) کی بات ہے تو یہ لفظ اچھے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا جب کوئی وسائل پر یا کسی چیز بلاشرکتِ غیرے قبضہ کر لے تو اسے اجارہ داری قائم کرنا کہا جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اسلام کی سچائی پر اجارہ داری نہیں ہے بلکہ صرف اسلام ہی سچائی ہے۔ Islam is the only truth اسلام ہی سچائی ہے، اسلام سے باہر کوئی سچائی نہیں۔ یہ حقیقت ہے اجارہ داری نہیں۔ پہلی کتابیں بھی حقیقی صورت میں کسی کے پاس نہیں ہیں۔ کتابیں مسخ ہو گئیں، خلط ملط ہو گئیں مٹ گئیں۔ عیسائیوں نے مختلف اناجیل بنا رکھی ہیں ہر انجیل کسی بندے کے نام سے منسوب ہے اور اس میں اُسی کی باتیں ہیں۔ ایسی کوئی انجیل آج اُن کے پاس نہیں جو عیسیٰ علیہ السلام سے منسوب ہو۔ سب دوسروں کی باتیں ہیں۔ عیسیٰ علیہ السّلام کی کوئی بات نہیں ہے اور اگر منسوب کر بھی دیں تو اس کی تصدیق نہیں ہے۔ عیسائیوں نے رہی سہی کسر بھی نکال دی اور کلیسا کو اختیار دے دیا کہ اللہ کا جو حکم چاہے منسوخ کر دے، اس کی جگہ جو نیا حکم چاہے جاری کر دے۔ اسلام وہ سچائی ہے کہ آج سے ساڑھے چودہ سو سال پہلے جو قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے اُمت کو عطا فرمایا تھا وہ آج بھی بعینہٖ اَلْحَمْدُ سے وَالنَّاس تک وہی نورانی کتاب، اُنہی الفاظ، حروف اور معانی کے ساتھ موجود ہے۔ لوگوں کے سینوں میں محفوظ ہے، زبانوں پر جاری ہے، موجود ہے۔ اس میں کسی نقطے، زیر زبر کا بھی فرق نہیں آیا اور یہ کتنی عظیم بات ہے۔ اس سے پہلے جب کوئی نیا رسولؑ یعنی صاحب کتاب تشریف لایا تو نئی شریعت آ گئی اور اس پر عمل کرنا ضروری ٹھہرا جبکہ سابقہ کے ساتھ یہ اقرار کرنا باقی رہا کہ وہ حق تھی۔ احکامِ شریعت بھی بدلتے رہتے ایک شریعت میں کچھ امور منع ہوتے تو دوسری میں وہ حلال کر دیے جاتے۔ اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہا لیکن جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم مبعوث ہوئے تو تمام احکام کا بھی فیصلہ ہو گیا اور حلال حرام، جائز ناجائز کی حتمی تعیین کر دی گئی۔ اللہ کریم نے فرما دیا اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ ۔۔۔ (المآئدہ:3) آج کے دن تمہارا دین مکمل ہو گیا، اب قیامت تک تمام فیصلے اسی کے مطابق ہوں گے، اسی میں سے تلاش کیے جائیں گے۔ دنیا کے تمام امور میں فیصلے قرآن وسنت میں سے ہی تلاش کیے جائیں گے۔ اُمتِ مسلمہ میں جو کام سنتِ ابراہیمی کے نام سے رائج ہیں، وہ اس لیے رائج ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے انہیں اپنایا اور اُمت آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے واسطے سے اُن پر

عمل کرتی ہے۔ فرمایا قرآن کریم مبارک کتاب ہے، یہ بہت بابرکت کلام ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ، ایک ایک جملہ برکات کا خزانہ ہے۔ اسے دیکھنا عبادت، اسے پڑھنا سنت ہے اور اگر بلند آواز سے پڑھا جا رہا ہو تو سننا فرض ہے۔ قرآن کریم نے عمل کے معاملے میں تمام کتابوں سے مستغنی کر دیا اور صرف اس پر عمل ہو گا۔ یہ نہایت بابرکت ذکر ہے تو اَفَاَنۡتُمۡ لَهٗ مُنۡكِرُوۡنَ۝۵۰ کیا تم اس سے انکار کرتے ہو؟ اے لوگو! کیا تم اس کا انکار کردو گے؟ اتنی بڑی جسارت کرو گے؟ اس انکار کے بھی درجے ہیں۔ ایک اشد ترین اور آخری درجہ تو یہ ہے کہ بندہ قبول ہی نہیں کرتا، مانتا ہی نہیں۔ اللہ کریم ہمیں معاف فرمائیں ایک اس سے کمتر درجہ بھی ہے انکار کا، بندہ زبانی اقرار کرتا ہے لیکن اس پر عمل نہیں کرتا تو یہ بھی انکار کی یا نہ ماننے کی ایک صورت ہوتی ہے۔ کافر نے تو کتابِ الٰہی کا انکار کر دیا، کہہ دیا کہ میں نہیں مانتا لیکن ہم کہتے ہیں کہ ہم مانتے ہیں لیکن کام اپنی پسند سے کرتے ہیں، قرآن کی پسند کے نہیں تو ہمارا جرم شدید تر ہے۔ جہاں ہمارے مفادات پر ذرا سی زد آ جائے ہم قرآن کا حکم چھوڑ دیتے ہیں۔ قرآنِ کریم کے مطابق وراثت تقسیم کرنا نہایت مشکل معلوم ہوتا ہے، اس کے مطابق دوسروں کے حقوق ادا کرنا انتہائی گراں گزرتا ہے۔ اب تو قرآنِ کریم کے حکم کے باوجود لوگ سود نہیں ترک کرتے۔ قرآن کو بھی مانتے ہیں اور سود بھی کھا رہے ہیں۔ سود کا نام بدل کر منافع رکھ دیا ہے بھلا ان سے پوچھا جائے کہ کتے کا نام بکرا رکھ دو تو کیا وہ حلال ہو جائے گا؟ سود کا نام منافع رکھنے سے کیا وہ حلال ہو جاتا ہے؟

یہ بھی انکار کی ایک صورت ہے۔ قرآنِ کریم میں یہودیوں کے بارے ارشاد ہوا ہے: وَيَقُوۡلُوۡنَ سَمِعۡنَا وَعَصَيۡنَا ۔۔۔ (النسآء:46) وہ کہتے ہیں کہ ہم نے بات سن لی، سمجھ لی لیکن اس کی اطاعت نہیں کریں گے، اس پر عمل نہیں کریں گے بلکہ اپنی مرضی سے کام کریں گے۔ یہ یہودیوں کی روش بتائی گئی ہے۔ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ ہونا یہ چاہیے کہ کہتے: سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ۔۔۔ (النسآ:46) بات سن بھی لی اور عمل بھی اس کے مطابق کریں گے۔ اللہ کریم معاف فرمائیں یہودیوں کی روش آج مسلمانوں نے اپنا لی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کو مانتے ہیں، قیامت پر یقین ہے، قرآن کو کتاب اللہ مانتے ہیں لیکن عمل اپنی پسند سے کریں گے، تو یہ بھی تو نہ ماننے ہی کی صورت ہے۔ فرمایا: اَفَاَنۡتُمۡ لَهٗ مُنۡكِرُوۡنَ۝۵۰ تم میں اتنی جرات ہے کہ تم قرآن کو نہیں مانو گے یعنی کمال ہے کہ یہ اتنی بڑی جسارت کرنے کی مجال ہے تم میں! اللہ کریم معاف فرمائے اور توفیق عمل عطا فرمائے اور یقین محکم عطا فرمائے۔ دراصل یہ فیصلے دل کرتا ہے، جب دل پر غفلت آتی ہے تو وہ من مانیاں کرتا ہے۔ اسی لیے ساری محنت، سارا مجاہدہ دل پر کیا جاتا ہے کہ دل کو عظمتِ الٰہی پر یقین نصیب ہو صداقتِ نبوت پر اور صداقتِ قرآن پر کامل یقین نصیب ہو تاکہ اسے پڑھے، سمجھے اور اس کے مطابق عمل بھی کرے۔

سورۃ الانبیاء رکوع 5 آیات 51 تا 75

اَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَلَقَدۡ اٰتَيۡنَاۤ اِبۡرٰهِيۡمَ رُشۡدَهٗ مِنۡ قَبۡلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيۡنَ ﴿٥١﴾ اِذۡ قَالَ لِاَبِيۡهِ
وَقَوۡمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيۡلُ الَّتِىۡۤ اَنۡتُمۡ لَهَا عٰكِفُوۡنَ ﴿٥٢﴾ قَالُوۡا وَجَدۡنَاۤ
اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيۡنَ ﴿٥٣﴾ قَالَ لَقَدۡ كُنۡتُمۡ اَنۡتُمۡ وَاٰبَآؤُكُمۡ فِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ﴿٥٤﴾
قَالُوۡۤا اَجِئۡتَنَا بِالۡحَقِّ اَمۡ اَنۡتَ مِنَ اللّٰعِبِيۡنَ ﴿٥٥﴾ قَالَ بَلۡ رَّبُّكُمۡ رَبُّ
السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ الَّذِىۡ فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكُمۡ مِّنَ الشّٰهِدِيۡنَ ﴿٥٦﴾
وَتَاللّٰهِ لَاَكِيۡدَنَّ اَصۡنَامَكُمۡ بَعۡدَ اَنۡ تُوَلُّوۡا مُدۡبِرِيۡنَ ﴿٥٧﴾ فَجَعَلَهُمۡ جُذٰذًا
اِلَّا كَبِيۡرًا لَّهُمۡ لَعَلَّهُمۡ اِلَيۡهِ يَرۡجِعُوۡنَ ﴿٥٨﴾ قَالُوۡا مَنۡ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَاۤ
اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿٥٩﴾ قَالُوۡا سَمِعۡنَا فَتًى يَّذۡكُرُهُمۡ يُقَالُ لَهٗۤ اِبۡرٰهِيۡمُ ﴿٦٠﴾
قَالُوۡا فَاۡتُوۡا بِهٖ عَلٰٓى اَعۡيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمۡ يَشۡهَدُوۡنَ ﴿٦١﴾ قَالُوۡۤا ءَاَنۡتَ
فَعَلۡتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰۤاِبۡرٰهِيۡمُ ﴿٦٢﴾ قَالَ بَلۡ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيۡرُهُمۡ هٰذَا
فَسۡـَٔلُوۡهُمۡ اِنۡ كَانُوۡا يَنۡطِقُوۡنَ ﴿٦٣﴾ فَرَجَعُوۡۤا اِلٰٓى اَنۡفُسِهِمۡ فَقَالُوۡۤا اِنَّكُمۡ
اَنۡتُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿٦٤﴾ ثُمَّ نُكِسُوۡا عَلٰى رُءُوۡسِهِمۡ ۚ لَقَدۡ عَلِمۡتَ مَا هٰٓؤُلَاۤءِ
يَنۡطِقُوۡنَ ﴿٦٥﴾ قَالَ اَفَتَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنۡفَعُكُمۡ شَيۡـًٔا وَّلَا
يَضُرُّكُمۡ ﴿٦٦﴾ اُفٍّ لَّكُمۡ وَلِمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿٦٧﴾
قَالُوۡا حَرِّقُوۡهُ وَانۡصُرُوۡۤا اٰلِهَتَكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ فٰعِلِيۡنَ ﴿٦٨﴾ قُلۡنَا يٰنَارُ كُوۡنِىۡ
بَرۡدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبۡرٰهِيۡمَ ﴿٦٩﴾ وَاَرَادُوۡا بِهٖ كَيۡدًا فَجَعَلۡنٰهُمُ الۡاَخۡسَرِيۡنَ ﴿٧٠﴾

وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۱﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗ
اِسْحٰقَ ؕ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ؕ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ﴿۷۲﴾ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً
يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ
الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ﴿۷۳﴾ وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا وَّنَجَّيْنٰهُ مِنَ
الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ﴿۷۴﴾
وَاَدْخَلْنٰهُ فِيْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۷۵﴾

اور یقیناً ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو اس (زمانہ موسوی) سے پہلے (اُن کی شان کے مطابق) ہدایت دی تھی اور ہم اُن (کے حال) سے واقف تھے ﴿۵۱﴾ جب انہوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے فرمایا کہ یہ کیا مورتیں ہیں جن (کی عبادت) پر تم جمے بیٹھے ہو؟ ﴿۵۲﴾ وہ کہنے لگے ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی عبادت کرتے ہوئے پایا ﴿۵۳﴾ انہوں نے فرمایا یقیناً تم بھی اور تمہارے باپ دادا بھی صریح گمراہی میں پڑے رہے ﴿۵۴﴾ وہ بولے کیا آپ ہمارے پاس (واقعی) حق لائے ہیں یا آپ دل لگی کر رہے ہیں؟ ﴿۵۵﴾ انہوں (ابراہیم علیہ السلام) نے فرمایا بلکہ تمہارا پروردگار آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے جس نے ان کو پیدا فرمایا ہے اور میں اس بات کا گواہ ہوں ﴿۵۶﴾ اور اللہ کی قسم! میں تمہارے بتوں سے ضرور ایک تدبیر کروں گا جب تم پیٹھ پھیر کر چلے جاؤ گے۔ تو انہوں نے اُن (کے بتوں) کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا مگر ان کے ایک بڑے (بت) کو (نہ توڑا) تا کہ وہ اس کی طرف رجوع کریں ﴿۵۸﴾ کہنے لگے کہ ہمارے بتوں کے ساتھ یہ (حال) کس نے کیا ہے؟ یقیناً یہ تو کوئی ظالم شخص ہی ہے ﴿۵۹﴾ لوگوں نے کہا ہم نے ایک نوجوان کو ان کی باتیں کرتے سنا ہے اُسے ابراہیم (علیہ السلام) کہتے ہیں ﴿۶۰﴾ انہوں نے کہا کہ اس کو لوگوں کے سامنے لاؤ تا کہ وہ گواہ رہیں ﴿۶۱﴾ انہوں (بت پرستوں) نے کہا اے ابراہیم (علیہ السلام)! ہمارے بتوں کے ساتھ یہ کام تم

نے کیا ہے؟ ﴿۶۲﴾ انہوں نے فرمایا بلکہ یہ ان کے بڑے (بت) نے کیا ہوگا اگر یہ بات کر سکتے ہیں تو ان سے پوچھ لو ﴿۶۳﴾ سو انہوں نے اپنے دل میں سوچا پھر کہنے لگے درحقیقت تم لوگ ہی بے انصاف ہو ﴿۶۴﴾ پھر (شرمندگی سے) سروں کو جھکا لیا (اور بولے) یقیناً آپ جانتے ہیں یہ (بت) کچھ بولتے نہیں ﴿۶۵﴾ انہوں نے فرمایا پھر کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہو جو نہ تمہارا کچھ سنوار سکیں اور نہ تمہارا (کچھ) بگاڑ سکیں ﴿۶۶﴾ تف ہے تم پر اور جن کو تم اللہ کے علاوہ پوجتے ہو اُن پر بھی، سو کیا تم (اتنا بھی) نہیں سمجھتے؟ ﴿۶۷﴾ وہ لوگ (آپس میں) کہنے لگے کہ اگر تم کو (اپنے معبودوں کے بدلہ لینے کے لیے) کچھ کرنا ہے تو ان کو (آگ میں) جلا دو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو ﴿۶۸﴾ ہم نے (آگ کو) حکم دیا اے آگ! ٹھنڈی ہو جا اور ابراہیم (علیہ السلام) کے لیے سلامتی (کا سبب) بن جا ﴿۶۹﴾ اور ان لوگوں نے ان کے ساتھ مکر کرنا چاہا تھا پھر ہم نے ان ہی کو نقصان میں ڈال دیا ﴿۷۰﴾ اور ہم نے ان کو اور لُوط (علیہ السلام) کو ایسے ملک (شام) کی طرف بھیج کر بچا لیا جس میں ہم نے دنیا جہان والوں کے لیے خیر و برکت رکھی ہے ﴿۷۱﴾ اور ہم نے اُن کو اسحٰق (علیہ السلام، بیٹا) اور یعقوب (علیہ السلام، پوتا) انعام میں عطا فرمائے اور ہم نے سب کو (اعلیٰ درجہ کا) نیک بنایا ﴿۷۲﴾ اور ہم نے ان کو پیشوا بنایا کہ ہمارے حکم سے ہدایت کیا کرتے تھے اور ہم نے ان کے پاس نیک کاموں کے کرنے کا اور (خصوصاً) نماز کی پابندی اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم بھیجا اور وہ ہماری عبادت کیا کرتے تھے ﴿۷۳﴾ اور لُوط (علیہ السلام) کو ہم نے حکم اور علم (نبوت و حکمت) بخشا اور اس بستی سے جہاں کے لوگ گندے کام کرتے تھے ان کو بچا نکالا۔ بے شک وہ (بستی والے) بُرے (اور) بدکردار لوگ تھے ﴿۷۴﴾ اور ہم نے اُنہیں اپنی رحمت میں داخل فرمایا بے شک وہ بڑے نیکوں میں سے تھے ﴿۷۵﴾

تفسیر و معارف

گزشتہ آیات سے اللہ کے نیک بندوں کا ذکر چل رہا تھا جو اللہ پر غائبانہ ایمان رکھتے ہیں، جنہیں اللہ کے روبرو پیش ہونے کا خیال رہتا ہے، حساب سے ڈرتے ہیں، حشر کی تیاری کرتے ہیں۔ جرائم اور گناہوں سے پرہیز کرتے ہیں اور قیامت کی گھڑی سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔ ان آیاتِ مبارکہ میں اللہ کریم نے بہت اعلیٰ مثال ارشاد فرمائی اور کیا خوب مثال ارشاد فرمادی: وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَ كُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ﴿٥١﴾ اور یقیناً ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو ان کی عظمت کے مطابق ہدایت فرمائی جو ان کے شایان شان تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شان یہ ہے کہ آپؑ نے اپنے اسوۂ حسنہ سے واضح کر دیا کہ اہلِ حق کا شعار سب کے ساتھ رہنا نہیں بلکہ حق کے ساتھ رہنا ہے۔ سب حق پر آجائیں تو اللہ کا احسان ہے لیکن ساری آبادی اگر حق کا ساتھ چھوڑ دے تو اہلِ حق، حق پر رہتے ہیں یعنی ساری آبادی کے ساتھ رہنا ان کی مجبوری نہیں ہوتی حق پر رہنا ان کا شیوہ ہوتا ہے۔

دینے والی ذات اللہ کریم کی ہے لینے کے لیے خلوص شرط ہے:

فرمایا: وَ كُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ﴿٥١﴾ اور ہم ان کے حال سے واقف تھے۔ کس کی شان کے لائق کیا ہے، کون کس چیز کا مستحق ہے، کون کس چیز کا اہل ہے اور کس کو کون سی نعمت ملنی چاہیے؟ ان سب باتوں کو ہم جانتے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کو ہم نے سیدھا راستہ دکھایا جو ان کی شان کے لائق تھا۔ فرمایا، ہم نے اپنے علم پر یہ فیصلہ کیا، کسی کی سفارش نہیں تھی، کسی کی درخواست نہیں تھی۔ ہم تو ہر چیز کو خود جانتے ہیں۔

خلوص انسان کا فیصلہ ہے:

یہاں تصوف کا ایک مسئلہ بھی حل ہوتا ہے کہ بندہ کسی کو کچھ نہیں دے سکتا۔ اللہ دینے والا ہے۔ اللہ عالم الغیب ہے، وہ پوشیدہ باتوں کو بھی جانتا ہے۔ وہ طالب کی استعداد اور خلوص کو بھی جانتا ہے۔ جس طالب میں جتنی استعداد ہوتی ہے، جتنا اس کا خلوص ہوتا ہے اللہ اسے بڑھ کر عطا فرماتے ہیں بلکہ خلوص ایسی چیز ہے جو استعداد کو بھی بڑھا دیتا ہے، استعداد خلوص کو نہیں بڑھاتی۔ خلوص انسان کا اپنا فیصلہ ہے۔ جب وہ طے کر لیتا ہے کہ اسے حق کے ساتھ رہنا ہے تو اللہ کریم خود اس کی استعداد بھی بڑھا دیتے ہیں۔

کسی نے کیا خوب کہا:

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

یعنی اگر کسی کی استعداد کم ہے، دامن تنگ ہے لیکن خلوص ہے تو اللہ کریم دامن بھی بڑا کر دیتے ہیں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ بعض لوگوں سے ایسی اُنسیت ہوتی ہے، دل چاہتا ہے کہ اُن کے مراقبات ہو جائیں اور بعض کو میں جانتا بھی نہیں، وہ آتے ہیں اور اُن کے مراقبات ایک ہفتے میں ہو جاتے ہیں۔ وہ لے کر چلے جاتے ہیں اور یہ بیٹھے رہ جاتے ہیں۔ یہ فیصلے انسان کی اپنی طلب پر ہوتے ہیں۔ اس میں اللہ کریم کے بہت سے راز ہیں۔ ایک شخص برسوں محنت کرتا رہتا ہے لیکن جب نتائج نکلتے ہیں تو وہ جلدی پا جانے والوں سے کروڑوں گنا زیادہ پا جاتا ہے۔ یہ فیصلے اللہ کے ہیں۔

خلوص کی نشانی:

جہاں خلوص ہوتا ہے وہاں طے شدہ بات ہے کہ بندہ حق پر قائم رہتا ہے۔ حق پر ڈٹ جاتا ہے۔ فیصلے تو بہر حال اللہ کے اپنے ہیں کہ کس کو کیا عطا کرنا ہے لیکن طالب کے لیے خلوص شرط ہے۔ خلوص کی نشانی بندے کے فیصلے کی مضبوطی ہے۔ یہ فیصلہ اس کا اپنا ہوتا ہے۔

جہاں بندے کے فیصلے میں کمزوری ہو۔ وہ سوچے کہ محنت کروں، نہ کروں، یہ ہو سکتا ہے، یہ نہیں بھی ہو سکتا یہ سب باتیں خلوص میں کمی کی علامت ہیں۔ جہاں خلوص ہوتا ہے وہاں پکی بات یہ ہوتی ہے کہ یہ کام کرنا ہے۔ جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام نے کیا۔

تذکرہ ابراہیم علیہ السلام:

فرمایا: اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَ قَوْمِهٖ۔۔۔ جب آپؑ نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے فرمایا۔۔۔ یعنی حق بیان کرنے میں آپؑ کو کوئی شئے آڑے نہ آئی حتیٰ کہ والد بھی نہیں۔

انسان جب دنیا میں آنکھ کھولتا ہے، ہوش سنبھالتا ہے، نیکی بدی، اچھے برے کی تمیز ہوتی ہے تو بچے کے لیے دنیا کا بہترین مرد اس کا باپ ہوتا ہے۔ بہترین عورت اس کی والدہ ہوتی ہے۔ ماں کی گود اور باپ کی شفقت اس کے استاد ہوتے ہیں۔ ماں کی گود اس کا مدرسہ ہوتی ہے۔ وہ سارے سبق وہیں سے لے کر اٹھتا ہے۔ بچے کو پالنا، خیال کرنا، سنبھالنا سب ماں کرتی ہے، باپ کما کر لاتا ہے، غذا، دوا، علاج کا اہتمام باپ کرتا ہے۔ ماں باپ اسے مل جل کر

پرورش کرتے ہیں۔ اس کے سامنے دنیا میں اللہ کے بعد مخلوق میں سب سے بڑا سہارا ماں باپ ہوتے ہیں لیکن ابراہیم علیہ السلام کے روشن دل نے جب والدین کو غلطی پر پایا تو حق کہنے میں کوئی رشتہ آپؑ کے آڑے نہ آیا۔

آپؑ کے والد ریاست کے کوئی عام آدمی نہ تھے۔ نمرود کے بت خانے کے انچارج، بت تراشی کے ماہر اور مذہبی سربراہ تھے۔ ایسے بااثر شخص کو جو والد بھی تھا یہ کہنا کہ جس کام کو آپ مذہبی عبادت کہتے ہیں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ خلوص کی اعلیٰ مثال ہے۔

کفر ہمیشہ تضادات کا مجموعہ ہوتا ہے:

انسانی عقل جب اندھی ہو جائے تو کوئی دلیل نہیں مانتی۔ ابراہیم علیہ السلام نے گھر میں والد کو دیکھا، باہر قوم کو دیکھا کہ سب بتوں کی پوجا میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کا دین ایک عجیب سا ملغوبہ تھا۔ نمرود نے بت بھی بنوا رکھے تھے اور خود خدائی کا دعویدار بھی تھا۔ بادشاہ خود کو خدا بھی کہلواتا تھا، قوم سے سجدے کرواتا تھا اور خود بتوں کی پوجا بھی کرتا تھا اس لیے کہ کفر ہمیشہ تضادات کا مجموعہ ہوتا ہے۔

حق ہمیشہ واضح ہوتا ہے:

ابراہیم علیہ السلام نے جب یہ حال دیکھا تو اُن کے اس عمل پر ان سے دلیل مانگی: اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴿۵۲﴾ کہ یہ جو مورتیاں تم گھڑ کر ان کے آگے سربسجود ہو، ان کی حیثیت کیا ہے، ان میں کیا کمال ہے؟ ان کی حقیقت تو یہ ہے کہ یہ لکڑی اور پتھر سے بنائی گئی ہیں۔ تم نے خود انہیں کاٹا، تراشا جس کی جو چاہا شکل بنا دی، جس کو جہاں چاہا وہاں رکھ دیا، کسی کو دیوار میں چُن دیا۔ یہ اپنی شکل بنا سکتے ہیں نہ فریاد کر سکتے ہیں اور تم ان بے بس پتھروں اور لکڑیوں کے آگے سجدے کرتے ہو۔ اس کی تمہارے پاس کیا دلیل ہے؟

گمراہ لوگوں کا جواب ایک ہی ہوتا ہے:

وہ کہنے لگے: قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ﴿۵۳﴾ ہمارے پاس ایک ہی دلیل ہے کہ ہم نے باپ دادا کو انہی کی پوجا کرتے دیکھا ہے۔ ہر گمراہ معاشرے کے پاس سب سے وزنی دلیل یہی ہوتی ہے۔

قرآن ہر فرد سے مخاطب ہے:

قرآن حکیم گزشتہ حالات بیان کر کے ہمارے لیے غور کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے تاکہ ہم گزشتہ اقوام کے

احوال پڑھ کر، سُن کر اپنی اصلاح کر سکیں لیکن ہماری یہ عجیب عادت ہے کہ جب ہم اس طرح کے واقعات پڑھتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ یہ تو مشرکین و کفار کے بارے ہیں لہٰذا ہمارا ان سے کیا تعلق؟ جب ہم وہ آیات پڑھتے ہیں جن میں صحابہ کرامؓ کی فضیلت آئی ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ تو صحابہ کرامؓ کے بارے ہیں۔ اس طرح ہم خود کو الگ کر لیتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ قرآن سب کے لیے ہے۔ قرآن ایک ایک فرد سے مخاطب ہے۔ ایک، ایک فرد کو مخاطب کر کے بتاتا ہے کہ مومن کون ہے، کیا صفات رکھتا ہے؟ کافر کون ہے، اس کے عقائد و اعمال کیسے ہیں؟ یہ آئینہ سامنے رکھ دیتا ہے کہ خود کو دیکھ لو، تم میں کیسی صفات ہیں، بتاتا ہے کہ آج مہلتِ عمل ہے، درست فیصلہ کر لو اور فلاح پا جاؤ۔ قرآن حکیم ہر پڑھنے والے سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ کفار کی دلیل یہ تھی کہ ان کے باپ دادا اس طرح کیا کرتے تھے، لہٰذا وہ بھی ایسا ہی کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے لیکن اے ماننے والو! تم ایسا نہ کرنا۔ ہمیں ان آیات کو خود پر لاگو کر کے دیکھنا چاہیے کہ ہم معاشرے کے غلط رواجوں کو کہیں دین پر فوقیت تو نہیں دے رہے؟

آج کے معاشرے میں شادی کی رسومات ہوں یا موت کی، دین کے احکام کی کسی کو پروا نہیں اور باپ دادا کے وقت سے جاری رسومات پر جمے بیٹھے ہیں۔ پوچھو کہ قرآن کیا بتاتا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے کیا تعلیم دی ہے، اس کے مطابق کیوں نہیں کرتے؟ ایک ہی جواب ہوتا ہے: ''باپ دادا ایسا کرتے تھے۔ ہم نے ایسا نہ کیا تو ہماری ناک کٹ جائے گی۔'' قرآن بتا رہا ہے کہ عزت اللہ کے دین پر عمل کرنے میں ہے۔ دین کے مخالف رسومات اپنانے میں نہیں۔ حشر میں نہ برادری نے کام آنا ہے نہ معاشرے نے، اپنا کردار، اپنے اعمال کام آئیں گے لہٰذا رسومات سے نکلیں اپنے کردار کو سنتِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سانچے میں ڈھال لیں پھر ہر کام عبادت ہو جائے گا۔ دین کے مطابق شادی کرنا، دعوتِ ولیمہ کرنا، دین کے مطابق کمانا، خرچ کرنا بھی عبادت ہے۔ حساب تو اللہ کریم کے سامنے دینا ہے، لوگوں کے سامنے نہیں۔

کفار نے اپنے عمل کی دلیل یہ دی کہ ان کے آباؤ اجداد کوئی معمولی لوگ نہیں تھے۔ وہ بڑے بہادر اور باکمال لوگ تھے۔ انہوں نے اپنے زورِ بازو سے علاقے فتح کیے، بادشاہتیں قائم کیں تو جو کام وہ کرتے تھے اچھا ہی کرتے تھے۔

ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴿۵۴﴾ تم بھی اور تمہارے باپ دادا بھی کھلی گمراہی میں رہے۔ معاشرے کی رسومات کے ردّ کا جو جواب ابراہیم علیہ السلام کی زبانِ مبارک سے ادا ہوا وہ اللہ کریم نے قرآن میں درج کر دیا کہ جب بات معاشرے کے دباؤ کی آ جائے۔ لوگ کہیں کہ

یہ ہمارے علاقے کی رسم ہے، ہمارے بزرگوں سے جاری رواج ہیں، ہماری برادری کا مطالبہ ہے کہ تو کہہ دو یہ سارا صریح غلط ہے۔ حق صرف وہ ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے بتایا۔ اگر معاشرہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی سُنّت کے خلاف کر رہا ہے تو غلط کر رہا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ سوچے بغیر کہ گھر والے ناراض ہوجائیں گے، خفا ہوجائیں گے بالکل سیدھی بات کہی کہ تمہارے بقول تمہارے آباؤ اجداد بہادر ہوں گے، انہوں نے فتوحات کی ہوں گی، ریاست بنائی ہوگی لیکن ان کا اور تمہارا عقیدہ اور طریقِ عبادت صریح گمراہی ہے اور یہ ایسی گمراہی ہے جسے تم خود بھی جانتے ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ تم راہ سے بھٹکے ہوئے ہو۔ یہ بات تمہارے علم میں بھی ہے، اندر سے تم بھی جانتے ہو کہ لکڑی اور پتھر سے تراشے ہوئے بُت کچھ نہیں کر سکتے۔ اس آیہ مبارکہ میں ہمارے لیے مقامِ فکر ہے کہ کیا ہم میں یہ جرأت ہے کہ ہم خلافِ دین رسومات کا اس طرح رد کر سکیں؟

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ﴿٥٥﴾ کہنے لگے کیا آپ (علیہ السلام) کے پاس حق ہے یا آپ (علیہ السلام) ہم سے مذاق کر رہے ہیں؟

آپ (علیہ السلام) کے نزدیک ہم گمراہ ہیں۔ ہماری نسلیں انہی رسومات کو اپنائے ہوئے گزر گئیں، وہ اتنے عظیم دانشور، شاعر، مؤرخ، فاتح اور سلطنت کے مالک لوگ تھے۔ آپ ان سب کو راہ گم کردہ بتاتے ہیں تو کیا آپ (علیہ السلام) کے پاس کوئی حق ہے یا آپ (علیہ السلام) ہمارے ساتھ محض ٹھٹھا کر رہے ہیں؟ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا:

قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿٥٦﴾

انہوں (ابراہیم علیہ السلام) نے فرمایا بلکہ تمہارا پروردگار آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے جس نے ان کو پیدا فرمایا ہے اور میں اس بات کا گواہ ہوں۔

حق کی بنیاد اس بات پر ہے کہ اپنے مالک اپنے خالق، اپنے رازق کو پہچانو۔ سوچو! کس نے تمہیں پیدا کیا، کس نے زمین بچھونا بنائی، کس نے اس میں رزق کے خزانے رکھ دیے، کس نے ہوائیں چلائیں، کس نے بارشیں برسائیں، کس نے آسمان کی چھت بنا دی، کس نے چاند سورج ستارے بنا دیے؟ وہ ہستی ربّ العالمین ہے۔ ربّ کا معنی ہے وہ جو ہر مخلوق کی ہر ضرورت، ہر جگہ، ہر وقت پوری کرنے والا ہے۔ ربّ وہ ہے جس نے ذرے سے لے کر آسمانوں تک ہر چیز کو پیدا کیا اور اس کی ہر ضرورت ہمہ وقت پوری کر رہا ہے۔ تمہارا پروردگار ہی عبادت کا مستحق ہے۔

اللہ کو کسی نہ کسی نام سے ہر کوئی مانتا ہے۔ نام مختلف رکھ لیں لیکن ایک آخری طاقت عقل کو ماننا پڑتی ہے جو سب کے لیے ہے جو سب کو دیتا ہے جسے کوئی نہیں دیتا۔ یہ سوال کبھی ختم نہیں ہوتا کہ فلاں کو یہ کس نے

دیا؟ فلاں نے دیا، اسے کس نے دیا؟ آخر میں ایک ہستی ماننا پڑتی ہے جو سب کو دیتی ہے اور وہ کسی کی محتاج نہیں۔ یوں عقل تھک جاتی ہے تو اقرار کر لیتی ہے۔ تھک ہار کر کسی ہستی کا اقرار کرنا دین نہیں۔ دین یہ ہے کہ اللہ کو ویسا مانو جیسا اللہ کے نبیؑ منواتے ہیں۔

ابراہیم علیہ السلام نے کفر کے مقابلے میں دلیل دیتے ہوئے فرمایا، یہ جو لکڑی کی مورتیاں تم بناتے ہو یہ تو درخت کی لکڑی کاٹ کر بنائی گئی۔ درخت مخلوق ہے۔ تم نے ربّ کی مخلوق کو استعمال کر کے مورتی بنالی۔ پتھر بھی اللہ کی تخلیق ہیں۔ تم نے زمین سے اٹھا کر انہیں تراشا اور مورتی بنالی۔ انہیں تو تم خود بنا رہے ہو، انہوں نے کیا بنایا؟ تو یہ بت تمہارے پروردگار نہیں ہیں۔ تمہارا پروردگار وہ ہے جس نے سارا نظامِ کائنات بنایا اور وہی اسے چلا رہا ہے۔

بندے کے ایمان کا پتا تب چلتا ہے جب وہ اللہ ہی کو ربّ مانتا ہے اور اسبابِ ظاہری کو پوری محنت سے اختیار کرتا ہے یا ضرورت پڑنے پر اپنے جیسی مخلوق کے دروازوں پر جبہ سائی کرتا ہے۔ رشوت اور ناجائز سفارش کرواتا ہے۔ فرمایا، تمہارا پروردگار وہ ہے جو ارض وسماء کا ربّ ہے، جس نے سارے نظام کو تخلیق فرمایا اور ہر چیز کو اس کی خصوصیت عطا کر کے پیدا فرمایا۔ کسی شئے کا کوئی ذاتی کمال نہیں۔ یہ ربّ العالمین کی عطا ہے۔ اور تم نے کہا کہ آپ کے پاس کیا دلیل ہے؟ تو سنو!

حق کے ثبوت کے لیے نبیؑ کی گواہی کافی ہے:

فرمایا: وَاَنَا عَلٰی ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۶﴾ میں اس بات کا گواہ ہوں۔ نبیؑ جو دین پیش کرتا ہے اس کی صداقت کا پہلا گواہ نبیؑ ہوتا ہے۔ نبیؑ جو ارشاد فرماتا ہے وہ حق ہوتا ہے اور اس کے حق ہونے پر اللہ کے نبیؑ کی گواہی کافی ہے کسی اور کی ضرورت باقی نہیں۔

ایک مثال:

شیخ سید عبد القادر جیلانیؒ کے واقعات میں ملتا ہے کہ ایک عالم ان کے ہمعصر تھے۔ صرف ونحو اور علم الکلام کے ماہر تھے۔ دلائل اور منطق میں اپنے دور کے ماہر شخص تھے۔ انہوں نے عرض کیا کہ مجھے بھی آپ اللہ، اللہ سکھائیں۔ شیخ نے فرمایا یہ کام بلا دلیل ہوتا ہے۔ یہ سارے کا سارا شیخ پر اعتماد سے چلتا ہے۔ آپ ہر کام کی عقلی دلیل مانگتے ہیں۔ دلائل سے تو نہیں چلے گا، شیخ پر اعتماد سے چلے گا۔ آپ یہ منطق اور دلائل کو چھوڑ دیں تو میں آپ کو اللہ اللہ سکھا دیتا ہوں۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ تھوڑے ہی عرصے بعد وہ بیمار ہو گئے، مرض الموت میں تھے تو

شیخ ان کی مزاج پرسی کے لیے تشریف لے گئے۔ شیخ سے کہنے لگے میں بہت پریشان ہوں، شیطان سے عاجز ہوں، موت قریب ہے اور یہ ظالم مجھ سے کہتا ہے کہ تمہارے پاس کیا دلیل ہے کہ اللہ ایک ہے۔ تم کس دلیل سے یہ کہتے ہو؟ میں اب تک اللہ کی توحید پر اسے ننانوے دلیلیں دے چکا ہوں اور یہ دلیل سے اسے ردّ کر دیتا ہے۔ شیخ نے فرمایا، مولانا! میں نے آپ سے کہا تھا کہ یہ منطق وغیرہ چھوڑ دیں۔ آپ کس جھمیلے میں پڑ گئے ہیں۔ آپ اُسے صرف ایک بات کہیں کہ مجھے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے بتایا ہے کہ اللہ واحد ہے۔ یہ وہ دلیل ہے جس کا ردّ شیطان کے پاس نہیں۔

ابراہیم علیہ السلام نے یہی دلیل فرمائی کہ تمہارا پروردگار ہی نظامِ کائنات کا خالق ہے۔ اس نے ہر شئے کو اس کی فطرت پر پیدا فرمایا ہے۔ جس سے جو کام لینا چاہتا ہے ویسی استعداد دے کر پیدا فرماتا ہے لہٰذا کسی مخلوق کا کوئی کمال اس کا اپنا نہیں۔ سب پروردگار کا ہے اور میں خود اس پر گواہ ہوں۔

ابراہیم علیہ السلام کی تدبیر:

اور تمہیں اب میں ایک اور طرح سے سمجھاتا ہوں: وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿۵۷﴾ میں اللہ کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں ایسی تدبیر کروں گا جس سے ثابت کر دوں گا کہ یہ بت کسی کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں نہ سنوار سکتے ہیں۔ آپؑ نے یہ فیصلہ کیا اور قوم کے بت پرستی کے تہوار کے دن جب سب لوگ چلے گئے تو آپؑ نے اپنی تدبیر آزمائی۔

قوم کا طریقہ یہ تھا کہ جب ان کا مذہبی تہوار آتا تو وہ طرح طرح کے کھانے تھال بھر کر بتوں کے سامنے رکھ دیتے خود رسومات ادا کرنے کے لیے شہر سے باہر چلے جاتے۔ رسومات کر کے واپس آتے تو وہی کھانے سب لوگوں میں تبرک کے طور پر تقسیم کر دیتے۔ ابراہیم علیہ السلام نے فرمادیا کہ جب تم سب شہر سے چلے جاؤ گے تو میں تمہارے بتوں سے حساب کتاب کروں گا اور دیکھوں گا کہ جوابًا وہ کیا کرتے ہیں۔ قوم جب بتوں کے آگے کھانے رکھ کر چلی گئی تو آپؑ بت خانے میں گئے۔ بتوں سے مخاطب ہوئے کہ اتنے انواع و اقسام کے کھانے تمہارے سامنے رکھے ہیں، کھڑے کیوں ہو، کھاتے کیوں نہیں؟ پھر کلہاڑا اٹھایا فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ﴿۵۸﴾ اور سب بتوں کے پرخچے اڑا دیے سوائے ایک بڑے بت کے۔ بعض روایات میں ملتا ہے کہ پھر وہ کلہاڑا بڑے بت کے کندھے پر رکھ دیا اور انتظار کرنے لگے کہ لوگ آئیں تو ان سے بات ہو۔ جب وہ لوگ واپس آئے اور بت خانے سے تبرک لینے لگے تو حیرت زدہ رہ گئے۔ قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۹﴾ کہنے لگے، یہ غضب کس نے

ڈھایا، ہمارے معبودوں کا یہ حشر کس نے کر دیا؟ قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗۤ اِبْرٰهِيْمُ ﴿٦٠﴾ لوگوں نے کہا کہ ایک جوان کو بتوں کے بارے یہ کہتے سنا ہے کہ لکڑی اور پتھر سے تراشے ہوئے بُت معبود اور پروردگار نہیں ہیں۔ یہ بتوں کا ذکر حقارت سے کرتا ہے۔ اسے لوگ ابراہیم (علیہ السلام) کے نام سے جانتے ہیں۔ قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰۤى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ﴿٦١﴾ قوم نے کہا اسے برادری کے سامنے لے آؤ۔ بڑا بُت بھی موجود ہے اور برادری بھی موجود ہے۔ سارے سنیں، دیکھیں اور سمجھیں کہ اس نے بتوں کی توہین کیوں کی ہے؟ اور اس توہین کا نتیجہ اسے سخت تکلیف کی صورت میں بھگتنا ہوگا چنانچہ ابراہیم علیہ السلام کو بلایا گیا۔ آپؑ تشریف لائے۔ قوم کے بڑوں نے سب کے سامنے سوال کیا: قَالُوْۤا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰۤاِبْرٰهِيْمُ ﴿٦٢﴾ اے ابراہیم! کیا آپ نے ہمارے معبودوں کا یہ حشر کیا؟ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ﴿٦٣﴾ آپؑ نے فرمایا، بلکہ یہ ان کے بڑے بت نے کیا ہوگا۔ اگر یہ بات کر سکتے ہیں تو ان سے پوچھ لو۔ یعنی یہ کہ کلہاڑا لے کر تو یہ بڑا کھڑا ہے۔ اسے تو خراش تک نہیں آئی اور سب کے ٹکڑے ہو گئے تو اسی نے مارا ہوگا، اسی سے پوچھ لو۔

ابراہیم علیہ السلام کا جواب ایک دلیل تھا:

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اللہ کے نبیؑ نے معاذ اللہ جھوٹ کہا۔ بعض لوگوں نے یہاں سے جھوٹ کو بھی جائز کرنے کی کوشش کی ہے۔ بعض نے یہاں تقیہ کا جواز نکالا ہے۔ حق یہ ہے کہ یہ نہ جھوٹ تھا نہ تقیہ۔ یہ ایک دلیل تھی۔ آپؑ اس دلیل سے بتوں کا عاجز ہونا ثابت کرنا چاہتے تھے۔ یہ بتانا چاہتے تھے کہ یہ خود مرتے رہے اور یہ جو کھڑا ہے یہ انہیں بچا بھی نہ سکا اور اب بتا بھی نہیں سکتا کہ ان سب کو کس نے مارا ہے تو تم لوگ ان کی پوجا کیوں کرتے ہو لہٰذا یہ نہ جھوٹ تھا نہ مذاق، یہ دلیل پیش کرنے کا ایک انداز تھا کہ تمہارے قول کے مطابق اگر یہ لوگوں کی تکلیفیں دور کرتے ہیں، صحت دیتے ہیں، رزق دیتے ہیں تو آج یہ تمہیں بتائیں کہ ان کا یہ حشر کیسے ہوا؟ اور یہ جو سب سے بڑا بُت ہے جسے تم رکھوالا کہتے ہو، یہ کیسا رکھوالا ہے کہ معبودوں کو بچا ہی نہ سکا نہ یہ بتا سکتا ہے کہ کس نے ان سب کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ تف ہے تم پر کہ تم ان کی پوجا کرتے ہو۔

ابراہیم علیہ السلام نے انہیں یہ فرما کر لاجواب کر دیا کہ ان سے پوچھ لو؟ اگر یہ بات کر سکتے ہیں۔ فَرَجَعُوْۤا اِلٰۤى اَنْفُسِهِمْ ۔۔۔ بتوں کے پجاری سوچ میں پڑ گئے کہ واقعی اتنا بڑا شاہی بت خانہ تھا۔ اس کے پرخچے اڑا دیے گئے اور کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا کہ اپنی جان بچا سکتا۔ یہ بڑا بت بھی بے بس کھڑا رہا تو ہم کس بات پر ان کی پوجا کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے دل میں سوچا یہ دلیل تو بڑی وزنی ہے اس کا کوئی ردّ ممکن نہیں ہے۔ فَقَالُوْۤا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ

الظّٰلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾ دل ہی دل میں کہنے لگے واقعی ہم غلطی پر ہیں، ہم ہی ظالم ہیں اس جوان کی بات ٹھیک ہے کہ جو اپنی جان نہیں بچا سکے وہ ہمیں کیا دیں گے اور یہ سب سے بڑا بت کچھ بھی نہیں کر سکا! کہنے لگے واقعی ہم زیادتی کر رہے ہیں۔ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۔۔۔ شرمندہ ہو کر سر جھکائے کہنے لگے: لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰۤؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ﴿۶۵﴾ آپ تو جانتے ہیں کہ یہ بول نہیں سکتے۔ قَالَ آپؑ نے فرمایا: اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ﴿۶۶﴾ یہی بات تو میں تمہیں کہہ رہا ہوں کہ تم اللہ کو چھوڑ کر ان کی پوجا کر رہے ہو جو تمہیں کوئی نفع دے سکتے ہیں اور نہ کوئی نقصان کر سکتے ہیں۔ میں نے ان کے ٹکڑے کر دیے اور یہ اپنا بچاؤ نہ کر سکے تو یہ تمہیں کیا فائدے دے سکتے ہیں۔ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾ تف ہو تم پر اور ان بتوں پر جنہیں اللہ کے سوا تم پوجتے ہو! کیا تم اتنا بھی نہیں سوچ سکتے؟ اللہ نے تمہیں عقل دی ہے اس سے کام لو، سوچو تو سہی جو چیز اپنی حفاظت نہیں کر سکتی وہ تمہاری محافظ کیسے ہو سکتی ہے۔ جسے میں نے توڑ پھوڑ دیا اور وہ میرا کچھ نہ بگاڑ سکے اس کی تم پوجا کر رہے ہو؟ کچھ عقل سے کام لو!

جب دل مردہ ہو جائیں تو عقل بھی حق پہچاننے سے عاری ہو جاتی ہے۔ انہوں نے عقل کا بھی الٹا استعمال کیا، آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ اب تو ہمارے بتوں کی بے آبروئی دنیا پر ظاہر ہو جائے گی۔ یہ بات اردگرد کی ریاستوں تک پھیل جائے گی تو اب اپنی عزت بچانے کا کوئی انتظام کرنا چاہیے۔ غلط کار لوگوں کے فریب کا پردہ جب بھی چاک ہوا، فریب دینے والوں نے نیک لوگوں پر ہی الزام لگایا تاکہ معاشرہ انہیں سزا دے اور غلط کار سچے ٹھہریں۔ جیسے زلیخا کا جرم ثابت ہو چکا تھا لیکن قید یوسف علیہ السلام کو کر دیا گیا تاکہ لوگ سمجھیں کہ قصور یوسف علیہ السلام کا ہی تھا۔

اپنی جھوٹی عزت قائم رکھنے کے لیے اس عہد کے بت پرست بھی اکٹھا ہو گئے اور آپس میں کہنے لگے کہ اس ایک بندے نے بت خانے کے سارے بت توڑ دیے۔ اب بتوں کی آبرو خاک میں مل جائے گی تو لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے ہمیں کچھ کرنا چاہیے تو سب نے فیصلہ کیا: قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْۤا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿۶۸﴾ بہت بڑی آگ جلا کر ابراہیم (علیہ السلام) کو اس میں پھینک دو، آگ میں جلا دو تاکہ لوگوں پر دہشت طاری ہو جائے اور ثابت ہو جائے کہ بتوں کا غضب ان پر نازل ہو گیا ہے۔ ہم لوگوں سے کہہ سکیں گے کہ اس نوجوان نے بتوں کو توڑا تھا تو بتوں نے اسے جلا کر خاک کر دیا ہے۔ اور بتوں کی مدد کرو کہ ان کی آبرو بچ جائے۔

کیسی عجیب بات ہے کہ پہلے یہ بتوں سے مدد مانگتے تھے اب اپنے معبودوں یعنی بتوں کی مدد کرنے کے لیے مشورے کر رہے تھے۔ یہ جانتے ہوئے کہ بت کسی قابل نہیں اپنی جھوٹی عزت بنانے کے لیے پھر بھی بتوں کی

پرستش کے جواز تلاش کر رہے تھے۔ اب (باطل) تو واضح ہو چکا تھا۔ ابراہیم علیہ السلام نے بتوں کو بے آبرو کر دیا تھا۔ حق واضح ہو گیا تھا لیکن اب بات حق کی نہیں اپنی ناک بچانے پر آ گئی۔

یہی روّیہ آج مسلمان کہلوانے والوں کا ہے۔ خلاف سنّت کام کرتے ہیں اور کہتے ہیں سنّت پر عمل کریں تو برادری میں ہماری ناک کٹ جائے گی یعنی اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت پر معاشرے کی غلط رسوم مقدم ہو چکی ہیں۔ اب بات حق کی نہیں لوگوں کی خوشنودی کی رہ گئی ہے۔

چنانچہ انہوں نے لکڑیوں کا ایک بہت بڑا الاؤ روشن کیا۔ میلوں پر پھیلی آگ کے شعلے ایسے بھڑکے کہ کوئی شخص قریب نہ جا سکتا تھا، اوپر بھی آگ کے شعلے اور لپٹیں اتنی بلند تھیں، آگ کی اتنی حدت تھی کہ کوئی پرندہ بھی اوپر سے گزر نہیں سکتا تھا۔ اب مسئلہ پیدا ہوا کہ ابراہیم (علیہ السلام) کو اتنی دہکتی آگ میں کون ڈالے؟ ابلیس نے انسانی شکل میں آ کر مشورہ دیا کہ ایک ایسا آلہ بناؤ جس میں بہت بلندی پر ایک جھولا، پنگوڑا سا بناؤ۔ اس میں ابراہیم (علیہ السلام) کو بٹھا دو۔ اس جھولے میں ایسی گرہیں لگاؤ جو چرخی کی مدد سے کھولی جا سکیں۔ ابراہیم (علیہ السلام) کو اس میں بٹھا کر خوب زور سے جھلاؤ۔ جب وہ بہت تیز رفتاری سے جھولنے لگے تو اس کی گرہیں کھول دو۔ یہ منجنیق کی ابتدائی شکل تھی۔ بعد میں مسلمانوں نے منجنیق کا استعمال جہاد میں کیا۔ پھر جب گرہیں کھل جائیں گی تو وہ جھولے سمیت آگ میں گر جائیں گے۔

مفسرین کرام نے لکھا ہے کہ اللہ کے جلیل القدر فرشتے نے دیکھا تو بارگاہِ الٰہی سے اجازت طلب کی کہ ابراہیم علیہ السلام کو بچا لیا جائے۔ بارگاہِ الٰہی سے ارشاد ہوا کہ میرے خلیل علیہ السلام سے پوچھ لو۔ حضرت جبرئیلؑ، ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سلام کے بعد عرض کیا کہ ہم سے آپ پر پیش آنے والا دکھ دیکھا نہیں جاتا۔ آپؑ اجازت دیں تو ہم آپ کو یہاں سے اٹھا لیں یا آگ بجھا دیں؟ آپؑ نے فرمایا، بتاؤ مجھے کس لیے آگ میں جھونکا جا رہا ہے؟ فرشتوں نے عرض کی آپؑ کو اللہ کے لیے پھینک رہے ہیں۔ آپؑ نے غیر اللہ کا رد کیا ہے بتوں کا رد کیا ہے تو یہ آپؑ کو اللہ کریم کے لیے آگ میں پھینک رہے ہیں۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا، مجھے اللہ کے لیے پھینک رہے ہیں تو اللہ کریم خود بھی ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ اللہ کریم بچانا چاہے تو وہ ہر چیز پر قادر رب ہے بچا سکتا ہے۔ اگر وہ جلا دینے میں راضی ہے تو میں جلنے کو تیار ہوں۔ بچانا چاہے گا تو بچ جائیں گے۔ آپ لوگ میرے اور میرے پروردگار کے درمیان کیوں آتے ہو؟

چنانچہ جھولا جھلایا گیا اور اس کی گرہیں کھول دی گئیں۔ تو اللہ قادرِ مطلق نے اپنی مخلوق آگ کو حکم دیا: قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِىْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ﴿٦٩﴾ ہم نے آگ کو حکم دیا کہ اے آگ! ٹھنڈی ہو جا اور ابراہیم علیہ السلام

کے لیے سلامتی کا سبب بن جا۔

اللہ کریم ہر شئے پر قدرت رکھتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا، اے آگ! تیرا کام تخلیقی طور پر یہ ہے کہ تو جلا ڈالتی ہے لیکن آج تو اپنی خُو بدل لے یعنی صرف (ابراہیم علیہ السلام) کے لیے اپنی فطری خصوصیت بدل لے۔ ابراہیم (علیہ السلام) کے لیے ٹھنڈی ہو جا اور تکلیف دہ ٹھنڈی نہیں بلکہ باد بہاری بن جا۔

اس آیت کی تشریح میں کہا گیا ہے کہ آگ بجھ گئی، جلتے ہوئے درخت سرسبز ہو گئے تو یہ بڑا معجزہ نہیں۔ بڑا معجزہ یہ ہے کہ آگ، آگ ہی رہی۔ دوسروں کے لیے شعلے اور دھوئیں اٹھتے رہے لیکن ابراہیم علیہ السلام کے لیے خوشگوار ہو گئی۔ یہاں خود آگ کو حکم دیا گیا کہ ابراہیم علیہ السلام کے لیے سلامتی والی ٹھنڈی ہو جا۔ اگر یہاں یہ مان لیا جائے کہ وہ بجھ گئی تھی تو جب آگ، آگ ہی نہ رہی تو حکم کی تعمیل کس نے کی؟ اور دوسری بات یہ کہ آگ کو یہ حکم نہیں دیا گیا کہ بجھ جا بلکہ حکم دیا گیا کہ ابراہیم (علیہ السلام) کے لیے پُرفضا بن جا۔ اگر آگ بجھ گئی تو حکم کی تعمیل کس نے کی؟ فلسفہ والوں کو یہ اعتراض ہوتا ہے کہ جس مخلوق کو اللہ نے جو صفات تخلیقاً دی ہیں انہیں بدلا نہیں جا سکتا۔ انہیں یہ سمجھ نہیں آتی کہ جس خالق نے اسے ایک خُو، فطرتاً دی ہے وہی خالق جب چاہے اسے بدل سکتا ہے۔ ہاں! یہ درست ہے کہ میں اور آپ نہیں بدل سکتے۔ ہر ایک کی فطری خصوصیت ہم نہیں بدل سکتے۔ ربّ العالمین جب چاہیں بدل سکتے ہیں۔

یہی ہوا، آگ نے تعمیلِ حکم کی۔ لکڑیوں کو جلاتی رہی، اس کے شعلے بھڑکتے رہے اور اس کے اندر ابراہیم علیہ السلام کو آگ نے کوئی گزند نہ پہنچایا بلکہ آپؑ کے لیے موسم کو خوشگوار رکھا۔ وہاں آپؑ نے چند دن قیام فرمایا پھر آگ سے باہر نکل آئے۔ اہلیہ کو ساتھ لیا، لوط علیہ السلام کو ہمراہ لیا اور شام کی طرف ہجرت کر گئے۔ بادشاہ اس آس پر انتظار کرتا رہا کہ آگ ختم ہو گی تو آپ (علیہ السلام) تو خاک ہو چکے ہوں گے لیکن آگ کے ختم ہونے تک آپ علیہ السلام شام پہنچ چکے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ ابراہیم علیہ السلام فرماتے تھے کہ جتنے دن اس آگ میں گزرے ویسا لطف پھر دنیا میں کبھی نہ پایا۔

وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ۝ ان لوگوں نے اپنی طرف سے بڑی تدبیر کی لیکن ہم نے ان ہی لوگوں کو نقصان میں ڈال دیا۔ ان کی تجویزیں اکارت گئیں۔ ان کے بتوں کی شان نہ بن سکی خود ان کی جھوٹی شان قائم نہ رہ سکی۔ اللہ کریم فرما رہے ہیں کہ لوگ مخالف تجویزیں کرتے ہیں، دشمنی کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے لیکن جو اللہ کے ساتھ رہے اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ان کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں اور ابراہیم علیہ السلام کے لیے آگ بھی سلامتی کا سبب بن گئی۔

وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ۝ اور ہم نے ابراہیم علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کو ان ظالم لوگوں کی زمین سے نکال کر نجات دی اور اس زمین کی طرف لے گئے جس میں ہم نے دنیا جہان والوں کیلیے خیر و برکت اور نعمتیں رکھی ہیں۔

ظاہری و باطنی نعمتیں:

آج کل جہاں عراق ہے یہاں نمرود کی سلطنت تھی اور موجودہ فلسطین اور ارد گرد کا علاقہ ملک شام میں شامل تھا۔ حضرت ابراہیمؑ ہجرت فرما کر لوط علیہ السلام کے ہمراہ ملک شام کو چلے گئے۔ فرمایا، یہ ایسی زمین ہے جس میں ہم نے جہانوں کے لیے برکت رکھی ہے۔ یہاں بہت سے انبیاؑ پیدا ہوئے، بہت سے انبیاؑ کا وصال وہیں ہوا۔ بیت المقدس جیسی عظیم مسجد وہاں ہے جو طویل عرصے تک اقوامِ عالم کا قبلہ رہی جس پر ہر لحہ اللہ کی رحمتوں کا نزول ہوتا ہے۔ دنیا بھر کو اس سے باطنی فوائد پہنچتے ہیں۔

ظاہری نعمتوں کی بھی کثرت ہے۔ زمین زرخیز ہے۔ انواع و اقسام کے پھل، سبزیاں، جڑی بوٹیاں اور میوہ جات بہتات سے دستیاب ہیں۔ طرح طرح کے قیمتی پتھر، زیرزمین تیل اور طرح طرح کی نعمتیں ہیں جن سے روئے زمین کے لوگ مستفید ہوتے ہیں۔

نیکوں کی صحبت نجات کا سبب:

حدیث مبارک ہے: عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَؓ وَ اَبِيْ سَعِيْدٍؓ اَنَّهُمَا شَهِدَا عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَالَ لَا يَقْعُدُ قَوْمٌ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا حَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ وَنَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِيْنَةُ وَذَكَرَهُمُ اللّٰهُ فِيْمَنْ عِنْدَهٗ (مسلم۔ترمذی)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابی سعیدؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو جماعت اللہ کے ذکر کے لیے بیٹھتی ہے فرشتے انہیں گھیر لیتے ہیں۔ اللہ کریم کی خصوصی رحمت ان پر سایہ کر لیتی ہے۔ ان کے دلوں میں سکون و اطمینان نازل ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ فرشتوں میں فخر و مباہات سے ان کا تذکرہ فرماتے ہیں۔

ابوہریرہؓ کی روایت کردہ دوسری حدیث مبارکہ کا ترجمہ ہے: "حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ملائکہ اہلِ ذکر کو تلاش کرتے پھرتے ہیں جہاں کہیں انہیں ذاکرین کی کوئی جماعت مل جاتی ہے وہ اپنے ساتھیوں کو بلاتے ہیں کہ یہ ہے وہ چیز جس کی تمہیں تلاش ہے چنانچہ وہ ملائکہ ذاکرین کو آسمانِ دنیا تک اپنے پروں سے ڈھانپ لیتے ہیں۔۔۔ یہاں تک فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں تم کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے ان لوگوں کو بخش دیا ہے۔ ان

میں سے ایک فرشتہ پھر کہتا ہے کہ فلاں آدمی تو اہلِ ذکر سے نہیں وہ تو اپنے کام کے لیے آیا تھا پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: هُمُ الْجُلَسَآءُ لَا يَشْقٰى جَلِيْسُهُمْ۔ یہ ایسی مجلس ہے جس میں بیٹھنے والا بد بخت نہیں رہ سکتا۔'' (بخاری)

یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے پاس بیٹھنے والا بھی محروم نہیں رہتا، بد بخت نہیں رہتا۔ اگر یہ حال اہل اللہ کی صحبت کا ہے تو انبیاء علیہم السلام کی عظمت کا کیا مقام ہوگا! صوفیا اور ولی اللہ تو نبی علیہ السلام کے قدموں کی خاک ہوتے ہیں۔ اگر یہ عظمت اہل اللہ کو اللہ اللہ کرنے والے ذاکرین کو حاصل ہے تو انبیاؑ کی عظمت کا کیا عالم ہوگا!

اللہ کے مقربین کی ناقدری، بہت بڑی بدنصیبی:

سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ مقربینِ بارگاہ کی قدر نہ کی جائے۔ ناقدری کرنے والوں کو اللہ نیکوں کی صحبت سے محروم کر دیتا ہے۔

اہلِ مکہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے خلاف بڑی تدبیریں کیں تو اللہ کریم نے مدینہ منورہ ہجرت کا حکم دے دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم مکہ چھوڑ گئے تو اہلِ مکہ محروم رہ گئے اور انصارِ مدینہ کا نصیب جاگ اُٹھا۔

صاحب ''جذب القلوب فی دیار المحبوب'' لکھتے ہیں کہ روئے زمین پر افضل ترین جگہ وہ ہے جہاں بیت اللہ شریف ہے۔ مکان کی عزت مکین سے ہوتی ہے۔ یہ اللہ کا گھر ہے اور ساری کائنات لیے قبلہ ہے۔ زمین کا وہ ٹکڑا جو بیت اللہ کی دیواروں کے اندر ہے اس کی عظمت روئے زمین سے زیادہ ہے۔ فرماتے ہیں، لیکن مدینہ منورہ کی وہ زمین جس پر آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلّم آرام فرما رہے ہیں اور جو وجودِ اطہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے مَس ہو رہی ہے وہ بیت اللہ سے افضل ہے۔ مکہ والے اگر ایمان نہیں لا رہے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کو ایذا دینے، قتل کرنے، شہر سے نکالنے کی سازشیں نہ کرتے تو جس شہر میں بیت اللہ تھا وہیں روضہء اطہر بھی ہوتا۔ اور مدینہ کے انصار نے مقامِ عظمتِ رسالت کو پہچان لیا تو یہ عظمت اللہ کریم نے مدینہ منورہ کو عطا کر دی۔

نمرود نے جب نبی علیہ السلام کی ناقدری کی تو نمرود کے زیرِ نگیں علاقہ ابراہیم علیہ السلام کی برکات سے محروم ہو گیا۔ آگ میں پھینکنے والوں کے ارادے بھی ناکام ہوئے اور سلطنت بھی نبیؑ کے فیوضات و برکات سے محروم ہو گئی۔ ابراہیم علیہ السلام کو اللہ نے ایسی جگہ پہنچا دیا جہاں ظاہری اور باطنی نعمتوں کی فراوانی تھی۔ اور بے شمار انعامات عطا فرمائے۔

انعاماتِ الٰہی:

فرمایا: وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ ۭ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ۔۔ اور ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو اسحٰق علیہ السلام جیسا

بیٹا عطا فرمایا جو نبیؑ تھے اور اس سے بڑھ کر انعام فرمایا کہ انہیں یعقوب علیہ السلام جیسے پوتے عطا فرمائے۔ پھر اللہ کے نبی یعقوب علیہ السلام کو یوسف علیہ السلام عطا ہوئے جو اللہ کے نبیؑ تھے۔ ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں نبوت کو جاری رکھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت تک نبوت ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں چلتی رہی۔

ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے اسحٰق سے جو اولاد ہوئی سارے نبی علیہ السلام ان ہی کی اولاد میں ہوئے۔ آپؑ کے دوسرے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے جو نسل چلی اس میں آقائے نامدار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم مبعوث ہوئے تو بھی نبوت ابراہیم علیہ السلام ہی کی اولاد میں رہی۔

بادشاہ نے ابراہیم علیہ السلام کو کیا نقصان پہنچایا؟ ابراہیم علیہ السلام تو قیامت تک کے لیے ہدایت کا سبب بن گئے۔ آپؑ کی نسل قیامت تک کے لیے نبوت سے نوازی گئی۔ آپؑ کائنات کے امام ٹھہرے، دنیا و آخرت میں سربلند ہو گئے۔ آپؑ کا دامن پکڑنے والے بھی عنداللہ مقبول ہو گئے تو نمرود آپؑ کا کیا بگاڑ سکا؟ فرمایا: **وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ﴿٧٢﴾** اور ہم نے سب کو اعلیٰ درجہ کا نیک بنایا۔

ایک لطیف نکتہ:

قرآن کریم میں یہاں ایک لطیف نکتہ ارشاد ہوا ہے وہ ہے **وَجَعَلْنَا**۔۔۔ ہم نے ان کو نیک بنا دیا۔ نیک بننا اور ہے اور نیک بنایا جانا اور ہے۔ انسان اپنی طرف سے نیکی کرتا ہے، نیک نظر آنے کی کوشش بھی کرتا ہے اور توقع بھی رکھتا ہے کہ لوگ اسے نیک سمجھیں۔ یہ اور شئے ہے۔ اس میں بڑے خطرات ہیں اور بڑے دھوکے بھی ہیں۔ اس میں یہ خیال ہوتا ہے کہ ہم نیک ہیں، ہوسکتا ہے کہ ہم پسِ دیوار نیک نہ ہوں۔ یہ خطرہ بھی رہتا ہے کہ ہوسکتا ہے، ہم ظاہر میں بھی نیک ہوں، پسِ دیوار بھی نیک ہوں، جلوت میں بھی نیک ہوں، خلوت میں بھی نیک ہوں لیکن اگر دل میں یہ خیال آجائے کہ میں بڑا نیک ہوں تو پھر سب اکارت ہو گیا۔ یہ خود کو نیک بنانے کا شعبہ ہے۔ اللہ کی عظمت کا احساس رہے، بندہ اللہ کریم سے عافیت طلب کرتا رہے۔

اپنی طرف سے نیک بننا اور شئے ہے اور اللہ کریم کی طرف سے نیک بنا دیا جانا اور شئے ہے۔ یہاں کوئی خطرہ نہیں۔ اس آیہء مبارکہ میں فرمایا: **وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ﴿٧٢﴾** اور ہم نے سب کو اعلیٰ درجہ کا نیک بنایا۔ جسے اللہ نیک بناتا ہے اسے توفیقِ عمل بھی ارزاں کر دیتا ہے، خلوص بھی عطا کر دیتا ہے اور انہیں اپنی مخلوق کا مقتداء بھی بنا دیتا ہے۔ لوگ انہیں دیکھ دیکھ کر جیتے ہیں، دیکھ دیکھ کر مرتے ہیں اور مر کر بھی زندگی پا جاتے ہیں۔ فنا تو خیر کوئی بھی نہیں ہوتا۔ ایک نہ ایک مقام پر ضرور جاتا ہے۔ ارشادِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام ہے: **اَلْقَبُرُ رَوْضَةٌ مِّنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ**

اَوْ حُفْرَۃٌ مِّنْ حُفَرِ النَّارِ۔ او کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم (مسند احمد) ترجمہ: قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا۔

فرمایا: وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَیْنَاۤ اِلَیْهِمْ فِعْلَ الْخَیْرٰتِ۔۔۔ ہم نے ان کو مقتداء بنا دیا، لوگوں کی ہدایت کا سبب بنا دیا۔ ہم نے انہیں ایسا بنایا کہ وہ صرف خود ہی نیک نہیں تھے بلکہ امام الہدیٰ تھے۔ خود بھی نیک تھے اور مخلوق میں نیکیاں تقسیم کرنے والے تھے۔ جن قوموں اور امتوں نے اُن کا دامن پکڑا وہ نیک ہوتے چلے گئے۔ وہ ہمارے حکم سے لوگوں کو ہدایت کرتے۔ درست عقیدے اور اچھے عمل کی راہنمائی کرتے تھے۔ ہم نے بذریعہ وحی انہیں اچھے اعمال، بارگاہ الٰہی میں شرفِ قبولیت پانے والے اعمال، بھلے اعمال بتا دیے تھے۔ وہ لوگوں کو ان اعمال کی تلقین فرماتے اور اللہ کی رضا پانے والے اعمال کے لیے راہنمائی فرماتے تھے۔ زندگی بسر کرنے کے خوبصورت انداز سکھائے، کاروبار، معاشرت، سیاست، عدالت، تعلیم و تعلم غرض زندگی کے سارے شعبوں میں ہم نے ان کو بھلائی اور نیکی کا راستہ بتایا۔ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ۔۔۔ ہم نے انہیں وحی کے ذریعے ادائیگی ءصلوٰۃ کا طریقہ سکھایا۔

اللہ کریم نے پہلے تمام نیک اعمال کو دو الفاظ یعنی فِعْلَ الْخَیْرٰتِ۔۔۔ میں سمو دیا پھر اقامتِ صلوٰۃ کو الگ سے انعام کے طور پر بیان فرمایا کہ ساری نیکیاں اللہ کی رضا کے لیے ہی کی جاتی ہیں لیکن براہِ راست اللہ کریم کی بارگاہ میں حاضر ہو کر شرفِ گفتگو حاصل کرنا یہ نعمت ہی الگ ہے۔ کوئی نیک عمل اس لیے کرنا کہ میرا ربّ اس سے راضی ہوگا، مجھ پر رحم فرمائے گا لیکن پروردگارِ عالم کے حضور خود حاضر ہو کر اپنی گزارشات پیش کرنا، یہ بات ہی اور ہے۔ فرمایا، ہم نے وحی کے ذریعے انہیں ملاقات کے اوقات بتا دیے۔ ملاقات میں باتیں کیا کرنی ہیں، ترتیب کیا ہے سب کچھ سکھا دیا۔ اللہ کی رحمت برس رہی ہے اپنا دامن دراز کرو سمیٹ لو جتنا سمیٹ سکتے ہو۔

وَاِیْتَآءَ الزَّكٰوةِ۔۔۔ اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم بھیجا۔ حضوری کا جتنا لطف صلوٰۃ میں ہے اسی طرح ایک الگ کیف زکوٰۃ میں ہے۔ اللہ کریم نے ہر ایک کا رزق مقدر کر دیا ہے۔ کسی کو کم کسی کو زیادہ۔ دونوں صورتوں میں آزمائش ہے۔ جن کے پاس زیادہ ہے انہیں حکم ہے کہ وہ اللہ کے حکم پر انہیں دیں جو مستحق ہیں۔ اس لیے کہ اللہ نے مال داروں کے مال میں غرباء کا حق رکھا ہے۔ ان کا حق سمجھ کر ادا کریں۔ جس کے پاس سال بھر مال رہا وہ اس کا اڑھائی فیصد اللہ کے حکم پر مستحقین کو پہنچائے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کا مطلب ہے اُسے اللہ کی رزّاقیت پر یقین نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس نے خود کمایا ہے، اس کی محنت کا کمایا ہوا پیسہ ہے وہ کسی دوسرے کو کیوں دے؟ پھر اس نے اللہ کو رزّاق مانا ہی نہیں اللہ سے تعلق تو ختم ہو گیا تو باقی زندگی میں کس کی اطاعت کرے گا۔ فرمایا، سو، ہم نے انہیں صلوٰۃ

قائم کرنے اور زکوۃ ادا کرنے کا طریقہ بھی بتادیا۔

وَ كَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ۝ وہ حقیقتاً میری عبادت کرنے والے تھے۔ یہ لوگ تھے ہی میری عبادت کرنے والے۔ وہ ہر کام میری اطاعت میں کرتے تھے۔ صرف صلوۃ ہی عبادت نہیں مومن کا وہ ہر کام جو وہ شریعت کے مطابق کرتا ہے وہ عبادت بن جاتا ہے۔ صلوٰۃ کا حکم، تمام عبادات کا حکم بھی تو اللہ کریم نے دیا تو حلال کمانے کا حکم کس کا ہے؟ اللہ کریم ہی کا ہے تو حلال کمانا عبادت ہوگیا۔ حلال اور طیب کھانے کا حکم اللہ کا ہے تو کھانا پینا بھی عبادت ہوگیا۔ اسی طرح اطاعتِ الٰہی میں سونا بھی عبادت شمار ہوتا ہے۔ ہر کام جو اللہ کے حکم پر کیا جائے، حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت میں کیا جائے وہ سب عبادت بن جاتا ہے۔ اسی لیے فرمایا: وَ كَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ۝ وہ ہماری عبادت کیا کرتے تھے۔

لوط علیہ السلام کا ذکرِ خیر:

فرمایا: وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا۔۔۔ ہم نے انہیں حکمت اور علوم کے خزانے عطا کردیے۔ انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دامن نہ چھوڑا۔ سارا خاندان، کنبہ، برادری حکومت، ساری سلطنت، پوری ریاست آپؑ کے خلاف تھی لیکن انہوں نے آپؑ کا ساتھ نہ چھوڑا ہم نے انہیں بھی نبوت سے سرفراز فرمایا، انہیں بھی علوم کے خزانے عطا کردیے۔ انہوں نے دامانِ پیغمبر نہیں چھوڑا۔ ہم نے انہیں پیغمبری دے دی۔ اللہ کی عطا کی کیا بات ہے! وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ۔۔۔ اور جب لوط علیہ السلام کو نبوت ملی تو جس قوم میں آپؑ رہتے تھے وہ لوگ بہت خبیث کام کرتے تھے۔ سب سے بڑی خباثت ہم جنس پرستی تھی۔ قبیح ترین کام تھا جس میں وہ ملوث تھے۔

بحوالہ تفسیر روح المعانی:

روح المعانی میں خبیث کاموں کی فہرست گنوائی گئی ہے۔ اس فہرست میں ہے کہ وہ اس فعل شنیع کے علاوہ شراب پیتے تھے۔ جواء کھیلتے تھے، کبوتر بازی کرتے تھے، تاش کی طرح کے کھیل کھیلتے تھے۔

آج کہا جاتا ہے کہ کبوتر بازی اور تاش بازی میں کیا حرج ہے کسی کا کوئی نقصان تو نہیں ہوتا لیکن اس میں سب سے بُری بات یہ ہے کہ وقت کا نقصان ہوتا ہے۔ جو وقت اللہ کی اطاعت میں لگنا ہے وہ فضولیات میں لگ جاتا ہے۔ اس طرح کی فضول کھیلوں کے بارے ایک حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ جو تاش کی طرح کی کھیلتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی خنزیر کو مار کر اس کا گوشت بانٹ رہا ہو۔

اب ایسی کھیلوں کی جدید شکلیں آ گئی ہیں۔اب ایسی ساری Games موبائل فون میں آ گئی ہیں۔ایسے تمام کھیل تماشے جن کا کچھ حاصل نہ ہواور اس میں وقت کا ضیاع ہووہ خبائث میں آتا ہے۔البتہ اگر موبائل یا کمپیوٹر پر اچھی Game ہے تو چوبیس گھنٹوں میں سے آدھا گھنٹہ، بیس منٹ، ایک گھنٹہ کھیل لیں تو کوئی حرج نہیں لیکن سارا سارا دن کھیلنا، کھاتے ہوئے بھی کھیل رہے ہیں۔دن رات اسی میں لگے ہوئے ہیں تو یہ پھر خباشت میں آ جاتا ہے۔

لوط علیہ السلام کی قوم تمام خباشت کے علاوہ ہم جنس پرستی جیسی خباشت میں ملوث تھی۔فرمایا:اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ﴿۷۴﴾ یقیناً یہ بہت ہی برے، بہت بدکردار لوگ تھے۔ان بدکاروں کی بستیوں میں، ان بدکاروں کے ساتھ رہتے ہوئے ہم نے لوط علیہ السلام کو وَاَدْخَلْنٰهُ فِيْ رَحْمَتِنَا۔۔۔اپنی رحمت میں داخل کر دیا یعنی جہنم کے باسیوں میں رہتے ہوئے آپؑ جنت میں بسا کرتے تھے۔بدکاروں میں رہتے ہوئے اللہ کی رحمت کے زیر سایہ تھے۔اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۷۵﴾ اس لیے کہ آپؑ اطاعت گزار تھے، صالح تھے۔

پریشانیاں دور کرنے کا قیمتی نسخہ:

آج ہم قومی اعتبار سے پریشان قوم ہیں۔پریشانیاں الگ الگ سہی لیکن جسے دیکھو پہلے سے زیادہ پریشان لگتا ہے۔کسی کو اپنی بیماری بتاؤ تو وہ اپنی دس بیماریاں گنوا دیتا ہے۔ہر شخص دکھ اور تکلیف میں ہے۔ایک دوسرے کو سنا دیتے ہیں لیکن کسی کے پاس کوئی علاج نہیں۔

اللہ کریم فرماتے ہیں کہ وہ ساری بستیاں بدکار تھیں۔ان پر ہمہ وقت نحوست برسا کرتی تھی۔اس میں میرا وہ بندہ جو صالح تھا، جس کا عقیدہ درست اور عمل صالح تھا، جسے میں نے نبوت سے سرفراز فرمایا تھا وہ ان بستیوں میں رہتے ہوئے میری رحمت میں بسا کرتا تھا۔جس نے نبیؑ کا دامن تھام لیا، ان کی پیروی کر لی وہ سکون پا گیا۔

قرآن حکیم نے ہمیں پریشانیوں کا علاج بتا دیا نسخہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں آ جاؤ۔ عقیدہ درست کرلو، کردار صالح کرلو۔صالحین کے ساتھ رہو۔صالح عمل کیا ہے، صالح کون ہے، صالحیت کیا شئے ہے؟ اس سوال کا جواب اگر انسانوں پر چھوڑا جائے تو ہر بندے کا جواب الگ ہوگا۔اس کی حقیقی اور حتمی تعریف یعنی Defination یہ ہے کہ ہر وہ بات صالح ہے جس کا حکم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا۔جو کام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں کیا جائے وہ کام صالح ہے۔پریشانیوں کا علاج یہ ہے کہ دامانِ رسالت تھام لو تو اردگرد حالات کتنے ہی خراب ہوں، کتنی نحوست برستی ہو، تم پرسکون رہو گے، تمہارے اردگرد آگ برستی ہو تم گلشن میں ہی رہو گے۔تمہاری پریشانیاں اور تمہارے دکھ ختم ہو جائیں گے۔

سورۃ الانبیآء رکوع 6 آیات 76 تا 93

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَنُوْحًا اِذْ نَادٰی مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ
الْعَظِيْمِ ﴿۷۶﴾ وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ
سَوْءٍ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۷۷﴾ وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ
نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ﴿۷۸﴾ فَفَهَّمْنٰهَا
سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ۫ وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ
وَالطَّيْرَ ؕ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۷۹﴾ وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ
بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖۤ
اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ﴿۸۱﴾ وَمِنَ
الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا لَهُمْ
حٰفِظِيْنَ ﴿۸۲﴾ وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰی رَبَّهٗۤ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ
الرّٰحِمِيْنَ ﴿۸۳﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ
وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰی لِلْعٰبِدِيْنَ ﴿۸۴﴾ وَاِسْمٰعِيْلَ
وَاِدْرِيْسَ وَذَا الْكِفْلِ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَاَدْخَلْنٰهُمْ فِيْ رَحْمَتِنَا ؕ
اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۶﴾ وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ
عَلَيْهِ فَنَادٰی فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۗ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ
الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۷﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ؕ وَكَذٰلِكَ نُـْۨجِي

الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٨٨﴾ وَزَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَيْرُ
الْوٰرِثِيْنَ ﴿٨٩﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۡ وَوَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ۭ اِنَّهُمْ
كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ۭ وَكَانُوْا لَنَا
خٰشِعِيْنَ ﴿٩٠﴾ وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا
وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿٩١﴾ اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ڮ وَّاَنَا رَبُّكُمْ
فَاعْبُدُوْنِ ﴿٩٢﴾ وَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ۭ كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ ﴿٩٣﴾

اورنوح (علیہ السلام) کو جب اس (زمانہ ابراہیمی) سے پہلے انہوں نے دعا کی تو ہم نے ان کی دعا قبول فرمائی تو انہیں اور ان کے تابعین کو بھاری غم سے نجات بخشی ﴿٧٦﴾ اور جولوگ ہماری آیتوں کا انکار (تکذیب) کرتے تھے ان پر انہیں (علیہ السلام کو) نصرت بخشی وہ یقیناً برے لوگ تھے سو ہم نے ان سب کو غرق کر دیا ﴿٧٧﴾ اور داؤد اور سلیمان (علیہما السلام) کو جب وہ ایک کھیتی کے بارے فیصلہ کرنے لگے جب اس میں کچھ لوگوں کی بکریاں (رات کو) چر گئی تھیں اور ہم ان کے فیصلے کے وقت موجود تھے ﴿٧٨﴾ پھر ہم نے اس (فیصلہ) کی سمجھ سلیمان (علیہ السلام) کو دے دی اور ہم نے دونوں کو حکم اور علم (نبوت وحکمت) بخشا تھا اور ہم نے داؤد (علیہ السلام) کے ساتھ پہاڑوں کو تابع کر دیا تھا کہ (اُن کے ساتھ) تسبیح کرتے تھے اور پرندوں کو بھی اور ان کاموں کے کرنے والے (حقیقتاً) ہم تھے ﴿٧٩﴾ اور ہم نے اُن کو تمہارے لیے زرہ (بنانے) کی صنعت سکھائی تاکہ (وہ زرہ) تمہیں لڑائی میں ایک دوسرے کی زد سے بچائے پس کیا تم اس (نعمت) کا شکر کرو گے ﴿٨٠﴾ اور (ہم نے) تیز ہوا سلیمان (علیہ السلام) کے تابع کر دی تھی جو ان کے حکم سے اس ملک (مُلک شام) میں چلتی تھی جس میں ہم نے برکت رکھ دی تھی اور ہم ہر چیز سے باخبر ہیں ﴿٨١﴾ اور بعضے شیطان (سرکش جن) ایسے تھے جو ان کے لیے (سمندر میں، موتی نکالنے کے لیے) غوطہ لگاتے تھے اور اس کے علاوہ

اور کام بھی کرتے تھے اور ہم ان کو سنبھالنے والے تھے ﴿۸۲﴾ اور ایوب (علیہ السلام) (کا تذکرہ فرمائیں) جب انہوں نے (شدید مبتلائے مرض ہونے کی وجہ سے) اپنے پروردگار کو پکارا کہ مجھے بہت تکلیف پہنچی ہے ﴿۸۳﴾ اور آپ سب سے بڑھ کر رحم کرنے والے ہیں۔ پس ہم نے ان کی دعا قبول فرمائی اور ان کی تکلیف کو دور کر دیا اور ہم نے ان کو ان کا کنبہ عطا فرمایا اور اپنی مہربانی سے ان کے ساتھ اتنے ہی اور (عطا فرمائے) اور عبادت کرنے والوں کے لیے (یہ) نصیحت ہے ﴿۸۴﴾ اور اسمٰعیل اور ادریس اور ذوالکفل (علیہم السلام) یہ سب صبر کرنے والے تھے ﴿۸۵﴾ اور ہم نے ان کو اپنی رحمت میں داخل فرمایا بے شک وہ نیک لوگوں میں سے تھے ﴿۸۶﴾ اور ذوالنون (مچھلی والے) جب وہ (اپنی قوم سے ناراض ہو کر) غصے کی حالت میں چل دیے پھر سوچا کہ ہم انؑ پر (چلے جانے کی وجہ سے) کوئی داروگیر نہ کریں گے پس انہوں نے اندھیروں (مچھلی کے پیٹ) میں پکارا کہ آپ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں آپ پاک ہیں بے شک میں قصور واروں میں سے ہوں ﴿۸۷﴾ پھر ہم نے ان کی دعا قبول فرمائی اور ان کو (اس) غم سے نجات بخشی اور ایمان والوں کو ہم اسی طرح بچایا کرتے ہیں ﴿۸۸﴾ اور زکریا (علیہ السلام) (کا ذکر کیجئے) جب انہوں نے اپنے پروردگار سے دعا کی کہ اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ رکھیو اور آپ سب سے بہتر وارث ہیں ﴿۸۹﴾ تو ہم نے ان کی دعا قبول فرمائی اور ان کو یحییٰ (علیہ السلام) بخشے اور ان کی اہلیہ کو (جو بانجھ تھیں، اولاد کے) قابل بنا دیا بے شک یہ سب لوگ نیک کاموں میں بہت جلدی کیا کرتے تھے اور ہمیں امید اور خوف سے پکارتے تھے اور ہمارے سامنے عاجزی کیا کرتے تھے ﴿۹۰﴾ اور اس خاتون کو (یاد کریں) جس نے اپنی عفت کو محفوظ رکھا پھر ہم نے ان میں اپنی روح پھونک دی اور ان کو اور ان کے بیٹے کو جہان بھر والوں کے لیے (اپنی قدرتِ کاملہ کی) نشانی بنا دیا ﴿۹۱﴾ یقیناً یہ آپ لوگوں کی جماعت ایک ہی جماعت ہے اور میں آپ سب کا پروردگار ہوں تو میری ہی عبادت کیا

کریں ﴿۹۲﴾ اور اُن لوگوں نے اپنے (دین کے) معاملہ میں آپس میں اختلاف کیا (تو) سب کو لوٹ کر ہمارے ہی پاس آنا ہے ﴿۹۳﴾

تفسیر و معارف

گروہِ انبیا علیہم السلام کا ذکرِ خیر:

اس پورے رکوع میں اللہ کریم نے اپنے نبیوں کا ذکرِ خیر فرمایا ہے۔ گزشتہ آیات سے ابراہیم علیہ السلام کا ذکر خیر چل رہا تھا۔ یہاں نوح علیہ السلام کے حالات بیان ہو رہے ہیں۔ فرمایا: وَنُوْحًا اِذْ نَادٰى مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۶﴾ اور نوح (علیہ السلام) کو جب اس (زمانہ ابراہیمی) سے پہلے انہوں نے دعا کی تو ہم نے ان کی دعا قبول فرمائی تو انہیں اور اُن کے تابعین کو بھاری غم سے نجات بخشی۔

نوح علیہ السلام نے انتہائی دلسوزی کے ساتھ ساڑھے نو سو سال تبلیغ فرمائی۔ اللہ کی طرف برابر بلاتے رہے۔ مخلوق کی بھلائی میں نو سو پچاس سال صرف کر دیے اور لوگ آپ کا مذاق اڑاتے رہے۔ آپ کے پیغام سے منہ موڑتے رہے۔ طنز کے تیر برساتے رہے کہ یہ بزرگ تو ایسی باتیں کرتے ہیں جو کسی نے نہ سنی نہ دیکھی۔ اگر موت کے بعد جی اٹھنا ہے تو جب مریں گے تو دیکھ لیں گے ابھی سے اپنے اوپر کیوں سوار کر لیں۔

یہ ایسے اعتراضات ہیں جو ہر دور کے منکرین کرتے چلے آئے ہیں۔ ایسے ہی اعتراضات ذاتِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ابوجہل اور ابولہب نے کیے تھے۔ حیرت کی بات ہے آج کے منکرین بھی یہی اعتراضات کرتے ہیں۔ عہد بہ عہد یہی اعتراض منکرین کی زبان پر ہوتا ہے۔ یہ بات ہو بہو ان تک کیسے پہنچ جاتی ہے؟ اس لیے کہ ایسی باتوں پر اللہ کا غضب بھڑکتا ہے۔ شیطان نے یہ نسخہ ازبر کر رکھا ہے۔ ہر عہد کے سرکشوں کی زبان سے وہی جملے نکلواتا ہے تاکہ یہ بھی اسی غضبِ الٰہی کا شکار ہوں۔ شیطان تو نسلِ انسانی کا دشمن ہے۔ اس نے تو دشمنی نبھانی ہے۔

نوح علیہ السلام کی بددعا آنے والی انسانیت کی بقاء کے لیے تھی:

ساڑھے نو سو سال کی محنتِ شاقہ کے بعد نوح علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کی: رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۝ (نوح: 26,27) اے میرے ربّ کسی کافر کو اب زمین پر زندہ نہ چھوڑ ان میں سے ایک بھی بچ گیا تو ان کی جو

نسل آگے چلے گی وہ لوگوں کو تیری راہ سے ہٹانے کا سبب بنے گی۔

نوح علیہ السلام نے ذاتی غصّے میں آ کر یہ التجا نہیں فرمائی تھی۔اس بات پر بددعا نہیں فرمائی تھی کہ میں نے صدیوں ان کو تیری راہ دکھائی اور صدیوں انہوں نے مجھے جھٹلایا میری بات نہیں مانی اور مجھے ایذائیں دے کر میری توہین کی۔آپؑ نے آنے والی انسانیت کو ان بدکرداروں کے شر سے بچانے کے لیے عرض کیا تھا کہ ان میں سے کسی ایک کو زندہ نہ چھوڑ کہ یہ لوگوں کو گمراہ کرنے کا سبب بنے گا۔

فَاسْتَجَبْنَا۔۔۔ہم نے نوح علیہ السلام کی عرض قبول کر لی۔نوح علیہ السلام اور ان کے ماننے والوں کے سوا ساری انسانیت غرقِ آب کر دی۔اللہ تعالیٰ کے ہاں بدکاروں کی کوئی حیثیت نہیں۔نبیؑ سے منہ پھیرنے والوں کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں۔اب جو غرق ہوئے ان میں بڑے بڑے سردار،امراء،عہدیدار، دانشور، ہر شعبہء زندگی کے سرکردہ افراد تھے اور ایک گاؤں، ایک شہر، ایک ملک ہی نہیں اس وقت روئے زمین پر جہاں جہاں انسانی آبادیاں تھیں سب غرق آب ہو گئیں۔سوائے کشتی والوں کے کوئی نہ بچا۔علمائے کرام نے لکھا ہے کہ کشتی میں سوار لوگوں کی تعداد اسّی یا بیاسی تھی۔نو سو پچاس سال کی تبلیغ کے بعد اتنے لوگ نوح علیہ السلام پر ایمان لائے۔پوری انسانیت کے غرق ہونے کے بعد کشتی میں سوار اہلِ ایمان میں سے کسی کی نسل آگے نہ چلی سوائے نوح علیہ السلام کے بیٹوں کے۔اسی لیے نوح علیہ السلام کو آدم ثانی کہتے ہیں۔

آل اور اہلِ بیت میں فرق:

لفظ 'آل' قرآنِ حکیم میں دو طرح سے آیا ہے۔ایک اہلِ بیت کے لیے دوسرا متبعین کے لیے۔اہل بیت کا معنی ہے گھر کے رہنے والے۔اہلِ بیت کا اطلاق ان افرادِ خانہ پر ہوتا ہے جن کا نان ونفقہ صاحبِ خانہ کے ذمہ ہو۔ اس میں بیویاں آجاتی ہیں۔وہ بیٹے، بہوئیں، پوتے پوتیاں آجاتے ہیں جو اس گھر کے رہنے والے ہوں۔جو دوسرے گھر میں رہتے ہوں اور جن کا نان ونفقہ کسی اور کے ذمہ ہو وہ اہل بیت میں نہیں آتے۔

اس بات کی وضاحت اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ جب ازواج مطہرات کی شان میں سورۃ احزاب کی یہ آیہء مبارکہ میں نازل ہوئی۔ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا (الاحزاب:33) جس کا ترجمہ ہے: بے شک اللہ چاہتے ہیں کہ اے (پیغمبر کے گھر والو! آپ سے آلودگی کو دور رکھیں اور آپ کو (ہر طرح ظاہراً باطنا) پاک وصاف رکھیں۔تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت علیؓ، بی بی فاطمہؓ اور حسنین کریمینؓ کو بلا کر اپنی چادر کے نیچے اپنے پہلوؤں میں بٹھا کر دعا فرمائی: اَللّٰهُمَّ هٰٓؤُلَآءِ اَهْلُ

بَیۡتِیۡ (رواہ ابن جریر) کہ اتنی بڑی نعمت جو میرے اہلِ بیت پر عطا ہوئی ہے اس میں ان کو بھی شامل کر دے۔

قرآنِ حکیم میں لفظ 'آل' جہاں اہلِ بیت کے معنوں میں استعمال ہوا ہے وہاں اس میں وہ افرادِ خانہ مراد ہیں جن کا نان ونفقہ اس ہستی کی ذمہ داری ہو۔ باقی ساری جگہ قرآنِ حکیم میں لفظ آل متبعین اور پیروی کرنے والوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ جیسے یہاں فرمایا گیا: فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۶﴾ ہم نے آپؑ کو بھی اور آپؑ کے متبعین کو بھی کربِ عظیم سے بچا لیا۔ یہاں بھی لفظ آل متبعین کے لیے استعمال ہوا ہے اہلِ بیت کے لیے نہیں۔ اسی طرح دوسری جگہ ارشادِ باری ہے: اَغْرَقْنَآ فِرْعَوْنَ وَاٰلَ فِرْعَوْنَ ۔۔۔ ہم نے فرعون کو اور آل فرعون کو غرق کر دیا یعنی جتنے لوگ فرعون کے پیروکار تھے، اس کو ماننے والے تھے ان سب کو غرق کر دیا۔ یہاں بھی لفظ آل متبعین کے لیے استعمال ہوا ہے۔

فرمایا: وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۷۷﴾ اور جو لوگ ہماری آیتوں کا انکار (تکذیب کرتے تھے، ان پر انہیں (نوح علیہ السلام کو) نصرت بخشی۔ وہ یقیناً برے لوگ تھے سو ہم نے ان سب کو غرق کر دیا۔ بظاہر تو لگتا تھا کہ وہ حکمران لوگ ہیں ان کے پاس فوجیں اور لشکر ہیں۔ امراء ووزراء ہیں، بے تحاشا وسائل ہیں، فرمایا، لیکن ہم نے ان نافرمانوں کے مقابلے میں اپنے نبی نوح علیہ السلام کی مدد کی۔ یہ قوم ہمارے احکام کا انکار کرتی تھی۔ یقیناً یہ بہت ہی بُرے لوگ تھے۔ دن رات برائی میں مصروف رہتے، بُرا سوچتے اور بُرا کرتے تھے۔ انہوں نے بڑی مضبوط پناہ گاہیں بنا رکھی تھیں لیکن وہ نافرمان تھے۔ اللہ کے عذاب سے بچ نہ سکے۔ ہم نے انہیں غرق کر دیا۔ آخرت تو ان کی پہلے ہی تباہ ہو چکی تھی۔ دنیا کا مال ودولت بھی تباہ ہو گیا۔

اللہ کریم کے انعامات کی کوئی حد نہیں۔ فرمایا: وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ﴿۷۸﴾ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ۡ وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ۭ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۷۹﴾ ہم نے دنیا میں اپنے بندوں کو کن کن نعمتوں سے نوازا ہے! داؤد علیہ السلام کے پاس سلطنت و ریاست تھی آپ بادشاہ بھی تھے اور میرے نبی علیہ السلام بھی۔ ہم نے انہیں بیٹا سلیمان عطا فرمایا جو میرے نبی اور عظیم الشان بادشاہ تھے۔ دنیا کے ایسے مانے ہوئے شہنشاہ تھے کہ جن کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے سامنے ایک مقدمہ پیش کیا گیا کہ ایک شخص کی بکریاں دوسرے شخص کے کھیت میں جا کر سارا کھیت چر گئیں جو کھیتی بکریوں نے چر لی اس کی قیمت اتنی ہی بنتی

تھی جتنے کی وہ بکریاں تھیں۔ داؤد علیہ السلام نے شہادتیں لے کر فیصلہ کر دیا کہ بکریاں کھیتی والے کو دے دی جائیں۔ یہ قانون کے عین مطابق انصاف کا فیصلہ تھا۔ اللہ کریم نے فرمایا، ان کا فیصلہ ٹھیک تھا اور ہمارے روبرو ہو رہا تھا۔ ہم ان کے فیصلے کے گواہ ہیں۔

حکمتِ الٰہی:

فرمایا: فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۔۔۔ ہم نے سلیمان علیہ السلام کو ایک اور بات، فیصلے کی بہتر صورت سمجھا دی۔ داؤد علیہ السلام کا فیصلہ قانون کے مطابق تھا، درست اور صحیح تھا۔ قانونی فیصلہ تھا۔ ہم نے ایک اور پہلو سے فیصلے میں انصاف کی راہ سمجھائی۔

سیدنا فاروقِ اعظمؓ جن کا عدل اللہ کی مہربانی سے مثالی ہے فرمایا کرتے تھے کہ قانون کا فیصلہ حق اور درست ہوتا ہے۔ اللہ اس پر اجر عطا فرماتے ہیں لیکن دونوں فریقوں میں سے ایک کا دل خوش نہیں ہوتا۔ قانون کا فیصلہ قبول کر لیتا ہے لیکن اس کا دل راضی نہیں ہوتا۔ اگر باہمی رضامندی سے فیصلہ ہو جائے تو دونوں فریق راضی ہو جاتے ہیں۔

اللہ کریم نے قانون کی یہ صورت عطا فرمائی تھی اس لیے سلیمان علیہ السلام کو اس کا فہم عطا فرما دیا۔ جب داؤد علیہ السلام نے فیصلہ دے دیا۔ کھیت والے کو بکریاں مل گئیں تو سلیمان علیہ السلام نے عرض کی، والدِ گرامی! انصاف عطا کرنے کی ایک اور صورت بھی ہے جس میں باہمی رضامندی سے دونوں فریقین کا بھلا ہو جائے گا اور کسی کے دل میں رنجش بھی نہیں رہے گی۔ وہ صورت یہ ہے کہ جس کی کھیتی کا نقصان ہوا ہے اسے بکریاں دے دی جائیں لیکن ہمیشہ کے لیے نہیں بلکہ اسے کہا جائے کہ وہ اپنی کھیتی بکریوں والے کو دے۔ وہ اس پر چند مہینے محنت کرے، بیج ڈالے، ہل چلائے، نئی فصل تیار کرے، ویسی فصل تیار کر دے جیسی پہلے تھی۔ کھیتی والے کا نقصان پورا ہو گیا تو کھیتی کا مالک اب بکریاں اصل مالک کو لوٹا دے۔ اس طرح نقصان بھی پورا ہو جائے گا اور مدعی اور مدعا علیہ دونوں دل سے فیصلے پر راضی ہو جائیں گے۔ کھیتی والا بڑا خوش تھا کہ یہ میری کھیتی تیار کر کے میرا نقصان پورا کر دے گا اور بکریوں والا خوش تھا کہ اسے اس کی بکریاں واپس مل جائیں گی۔

اسلام میں اللہ نے اس کی گنجائش خونِ ناحق اور قتل تک میں رکھی ہے اور اس لیے رکھی ہے کہ جب باہمی رضامندی سے خون بہا دے دیا جاتا ہے تو دشمنی آگے نہیں چلتی۔ جہاں قانون کا فیصلہ نافذ ہوتا ہے، قاتل کو سزائے موت ہو جاتی ہے وہاں وہاں اس کے وارثین میں دشمنی کی آگ بھڑکتی رہتی ہے۔

فرمایا، ہم نے قانونی فیصلے کے مقابلے میں کرم کی گنجائش رکھ دی۔ کرم کے فیصلے اچھے ہوتے ہیں، صلح کے

فیصلے اچھے ہوتے ہیں۔ یہی بات ہم نے سلیمان علیہ السلام کو سمجھا دی۔ ان سب کو ہم نے نبوت، حکمت و دانائی اور علوم کے خزانے بھی بخشے تھے۔

داؤد علیہ السلام کی تخصیص:

اور خیر داؤد علیہ السلام کی تو کیا ہی بات ہے!: وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ؕ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۷۹﴾ فرمایا، ہم نے پہاڑوں کو مسخر کر دیا تھا جو ان کے ساتھ اللہ کا ذکر کیا کرتے تھے اور پرندوں کو بھی مسخر کر دیا تھا کہ جب وہ ذکر کرتے تو پرندے بھی ان کے ساتھ ذکر کرتے تھے۔

بعض مترجمین اور مفسرین نے یہاں لکھا ہے کہ پہاڑ اور پرندے زبانِ حال سے ذکر کیا کرتے تھے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے تو قرآن حکیم میں موجود ہے: وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (بنی اسرائیل: 44) کائنات بھر میں کوئی شئے ایسی نہیں جو اللہ کی تسبیح نہ کرتی ہو یعنی ہر شئے اپنی زبانِ حال سے ہمہ وقت ذکر کر رہی ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ پوری کائنات میں کوئی ایسا وجود نہیں جو اللہ کا ذکر نہ کرتا ہو۔ جو شئے اللہ کا ذکر نہیں کرتی وہ ختم ہو جاتی ہے۔ جب ہر شئے ہمہ وقت ذکر کرتی ہے تو پھر حضرت داؤد علیہ السلام کی تخصیص کیا ہے؟ آپ علیہ السلام کی تخصیص یہ ہے کہ جب آپؑ ذکر کرتے، تسبیح کرتے تو پہاڑ اور پرندے بھی زبانِ قال سے بول کر اللہ کا ذکر کرتے تھے۔

کسی کے ذہن میں یہ خیال نہ آنے پائے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے، یہ کیسے ممکن ہے؟ فرمایا: وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۷۹﴾ ہم ہیں کرنے والے۔ یہ انسان کی عقل کی بات نہیں یہ ہماری قدرت کی بات ہے۔ جو کام ہم کرتے ہیں وہ ہو جاتا ہے۔

اللہ کی قدرت کاملہ کے لیے کچھ مشکل نہیں بے شمار روایات موجود ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں کہ اب تک مکہ مکرمہ کے ان پتھروں کو پہچانتا ہوں جو قبلِ بعثت مجھے سلام کیا کرتے تھے۔ ان درختوں کو پہچانتا ہوں جو مجھ پر درود بھیجتے تھے۔ شجر و حجر بھی اپنی ایک حیثیت رکھتے ہیں۔ سیرت نگار لکھتے ہیں کہ شب ہجرت آپ صلی اللہ علیہ وسلّم ایک پہاڑ کی طرف متوجہ ہوئے کہ اس پر سے گزر جائیں تو اس نے عرض کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم! مشرکین آپ کے پیچھے ہیں، کہیں مجھ پر آپ کو تکلیف نہ پہنچا دیں تو مجھے اس غضب سے بچا لیجیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم میرے اوپر ہوں اور مشرکین آپ کو ایذاء پہنچائیں۔ دوسرے پہاڑ نے عرض کیا کہ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم آپ مجھ پر قدم تو رکھیے، مجھے اس سعادت سے بہرہ ور کر دیجیے، ادھر سے آئیے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلّم اس پہاڑ کی طرف تشریف لے گئے۔

اللہ کریم بطفیلِ انبیاؑ ان کے حقیقی متبعین کو یہ قوت دیتے ہیں۔ ایسے اہل اللہ ملتے ہیں جو جڑی بوٹیوں سے بات کر لیتے تھے۔ معلوم کر لیتے تھے کہ وہ کس بیماری کا علاج ہیں۔ میں اپنے شیخ حضرت جیؒ کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ قاضی ثناء اللہ لیٹی والے بھی موجود تھے۔ ایک زمیندار کے فوت ہونے کا پتا چلا۔ حضرت جیؒ نے فرمایا نیک آدمی تھا۔ قاضی صاحب کہنے لگے وہ نماز روزہ کی پابندی تو نہیں کرتا تھا۔ حضرت جیؒ نے فرمایا: وہ بااثر آدمی تھا، لوگوں کو ایذا دینے کی طاقت رکھتا تھا لیکن کسی کو اس نے تنگ نہیں کیا، کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی۔ اور فرمایا، قاضی صاحب! وہ دور گیا جب لوگ نیکی کر کے نیک کہلاتے تھے۔ اب تو جو برائی نہ کرے ہم اسے نیک کہتے ہیں۔

قاضی صاحب بتانے لگے کہ انہوں نے زمیندار کی بیٹھک میں کچھ وقت گزارا تھا۔ وہاں بیٹھک کی چھت کی لکڑیاں کہنے لگیں، ''قاضی جی! وہ بھی لکڑیاں ہیں جو مسجدوں کی چھتوں پر لگی ہیں، جہاں رات دن اللہ اللہ ہوتی ہے، عبادت ہوتی ہے اور وہ مزے کرتی ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ یہاں زمینداروں کی بیٹھک میں رات دن بدکاری کے نظارے دیکھتی ہیں''۔ کہتے ہیں، میں نے ان سے کہا کہ یہ شخص تو اچھا آدمی ہے تو انہوں نے کہا، ''وہ خود ایسا نہیں ہے اس کے بھتیجے، بھانجے بڑے بدکار ہیں۔ عورتیں لے آتے ہیں اور یہاں بدکاری کرتے ہیں''۔

یعنی ایسے ولی اللہ تو ہم نے بھی دیکھے ہیں جن سے چھت کی لکڑیاں باتیں کر رہی تھیں۔ اگر ولی اللہ سے باتیں ہو سکتی ہیں تو نبی علیہ السلام کے ساتھ پہاڑ ذکر کریں تو اس میں اعتراض کی کیا گنجائش، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہیں اور یہی فرمایا: وَ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۷۹﴾ یہ کرنے والے تو ہم ہیں۔

فرمایا: وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ﴿۸۰﴾ اور ہم نے آپؑ کو تمہارے لیے زرہ بنانے کی صنعت سکھائی تا کہ وہ زرہ تمہیں لڑائی میں ایک دوسرے کی زد سے بچائے پس تم کیا اس نعمت کا شکر کرو گے!

جدید ٹیکنالوجی حاصل کرنا سنتِ انبیاؑ ہے:

اللہ کریم نے قرآنِ حکیم میں جا بجا انبیاؑ علیہم السلام کی صلاحیتوں، قابلیتوں کا ذکرِ خیر فرمایا ہے۔ لوہے سے زرہیں بنانا داؤد علیہ السلام کی ایجاد ہے۔ آپؑ کو اللہ نے یہ کمال عطا فرمایا تھا کہ آپؑ خوبصورت اور مضبوط زرہیں بناتے تھے۔ زرہوں کی شکل وصورت، ان کی بناوٹ میں موزونیت تک کی تفصیلات میں راہنمائی آپؑ کو براہِ راست اللہ کریم سے ملتی تھی۔ اس سے مراد ہے کہ جدید ٹیکنالوجی سیکھنا انبیاؑ کی سنّت ہے۔ اسے سیکھنا چاہیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ پاک ہے: اَلْكَلِمَةُ الْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ حَيْثُمَا وَجَدَهَا فَهُوَ اَحَقُّ بِهَا (سنن ابن ماجه)

دانائی میں جدید اندازِ صنعت وحرفت بھی آتے ہیں۔ اگر یہ دولت کسی اور کے پاس ہے تو مومن کا حق ہے کہ وہ اپنی اس گمشدہ دولت کو حاصل کرے۔ عہد نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام میں چین بہت دور دراز کا ملک تھا۔ جہاں آج کل سلطنت عمان ہے وہاں ایک بہت بڑی منڈی لگا کرتی تھی جس میں عرب کے مضافات سے لوگ آتے، مغربی مما لک اور ہندوستان اور چین تک سے لوگ آتے تھے۔ جتنے لوگ وہاں جمع ہوتے تھے ان میں سب سے زیادہ دور سے آنے والے چین کے لوگ ہوتے تھے یعنی سب سے زیادہ فاصلہ چین کا تھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ بِالصِّیْن اوکما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم (بیہقی) کہ علم حاصل کرو خواہ اس کے لیے چین ہی جانا پڑے۔ علوم حاصل کرنا، اس میں محنت کرنا مسلمانوں کو زیبا ہے اور یہ مومن کے لیے آسان ہے اس لیے کہ نورِ ایمان سے، اللہ کی یاد سے، اللہ جلّ شانہٗ کے نام کے ذکر کے نور سے مومن کی مادی اور ظاہری استعداد میں زیادہ قوت ہوتی ہے۔ اسی لیے یہ عام مشاہدہ ہے کہ جتنی جلدی مسلمان کسی علم کو سمجھتا اور سیکھتا ہے غیر مسلم اقوام اس طرح نہیں سیکھتیں۔ مسلمان ایک گھنٹہ لگائے تو غیر مسلم دس گھنٹے لگا دیتا ہے۔

شکر کا طریقہ:

فرمایا: فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ﴿۸۰﴾ تو کیا تم اس پر اللہ کے شکر گزار ہو!

اللہ کا شکر ادا کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ محض زبان سے شُکر، شُکر کہتا رہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے درست جگہ پر استعمال کرے، باطل کے لیے استعمال نہ کرے۔ شکر یہ ہے کہ ٹیکنالوجی اور جدید علوم کا استعمال بنی نوعِ انسان کے فائدے کے لیے کیا جائے۔ شکر کا سلیقہ یہی ہے کہ علوم کو خلقِ خدا کی بہتری کے لیے استعمال کیا جائے۔

تذکرۂ سلیمان علیہ السلام:

فرمایا: وَلِسُلَیْمٰنَ الرِّیْحَ عَاصِفَةً تَجْرِیْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا ؕ وَ كُنَّا بِكُلِّ شَیْءٍ عٰلِمِیْنَ ﴿۸۱﴾ اور ہم نے تیز ہوا سلیمان علیہ السلام کے تابع کر دی تھی جو ان کے حکم سے ملک شام میں چلتی تھی۔ وہ ملک جس میں ہم نے برکت رکھ دی تھی اور ہم ہر چیز سے باخبر ہیں۔

ہوائی جہاز کی صنعت کی تعلیم اللہ کریم کی طرف سے سلیمان علیہ السلام کو عطا فرمائی گئی تھی۔ ہوا کو انؑ کے لیے مسخر کر دیا گیا تھا۔ آپؑ ایک تخت بچھاتے اس پر اہل دربار کو بٹھاتے، جب ضرورت ہوتی تو لشکر بھی ساتھ لے لیتے۔ ہوا اس سب کو اٹھا کر مہینوں کا سفر گھنٹوں میں طے کر لیتی تھی۔ اس وقت کا ہوائی جہاز یہ تھا۔ آج بھی

فضائی سفر ہوا پر ہی ہوتا ہے۔ اس میں انجن ہوا کو پیچھے دھکیلتا ہے اور اڑان بھرتا ہے اور ہوا پر تیرنے لگتا ہے۔ سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں ہوائی جہاز کی صورت کیا تھی یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے لیکن قرآن نے یہ بات قطعی بتا دی کہ آپؑ ہوا کے دوش پر سوار ہو کر مہینوں کی مسافت گھنٹوں میں طے فرماتے تھے۔ آپؑ مبارک وطن یعنی ارضِ شام میں سفر فرماتے تھے۔ فرمایا، یہ برکت والی زمین ہے۔ یہاں قبلہء اوّل ہے، یہاں بہت سے انبیاؑ کے مدفن ہیں۔

وَ كُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ﴿٨١﴾ اللہ کریم فرماتے ہیں ہم ہر شئے کو جانتے ہیں۔ انسان کو جو علوم ملتے ہیں وہ انسان کی استعداد اور حیثیت کے مطابق ہوتے ہیں۔ علمِ الٰہی اللہ کی شان کے مطابق ہے لہٰذا اس حیرت میں نہ آئیں کہ اللہ نے ان کا تخت کیسا بنایا، اسے ہوا کیسے اڑا لے جاتی تھی؟ حضرت داؤد علیہ السلام کیسے زرہ بنا لیتے تھے، پہاڑ کس طرح آپؑ کے ساتھ ذکر کرتے تھے، تسبیح کرتے تھے۔ ان سب چیزوں کا علم اللہ کے پاس ہے۔ جس چیز کو اللہ جس کام کا حکم دیں، وہ کرتی ہے۔

سلیمان علیہ السلام پر اللہ کریم کی طرح طرح کی عنایات تھیں۔ فرمایا: وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَ كُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ﴿٨٢﴾ ہم نے بڑے بڑے سرکش جنات کو آپؑ کے تابع کر دیا تھا جو آپؑ کے لیے سمندروں میں غوطے لگاتے، جواہرات تلاش کر کے لاتے تھے۔ اس کے علاوہ سونے چاندی کی کانوں سے دولت نکال کر لاتے، عظیم الشان تعمیرات کرتے۔ بہترین فرش بناتے اور جو کام بھی آپؑ ارشاد فرماتے انہیں بجا لاتے تھے۔ اور ہم ہی تو کائنات کی ہر شئے کو سنبھالنے والے ہیں۔ سرکش جنات کو کام کے لیے تابعدار بنانے والے ہم ہی ہیں کہ وہ کافر تھے، سرکش تھے لیکن اللہ نے ان کی قوت کو آپؑ کے لیے مسخر کر دیا۔ جس جن کو جس کام پر لگا دیتے ہیں اس کی مجبوری تھی کہ اسے وہ کام کرنا پڑتا۔

قبلہء اوّل بیت المقدس کی بنیاد سلیمان علیہ السلام نے رکھی تھی۔ یہ جنات کی تعمیر کی ہوئی بہت بڑی مسجد تھی۔ مرورِ زمانہ سے یہ تعمیر بدلتی رہی، کبھی تباہ ہوئی پھر بنائی گئی مختلف ادوار سے گزرتی رہی لیکن اس کی بنیاد حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہی رکھی۔

سلیمان علیہ السلام کو اللہ نے عظیم الشان سلطنت عطا فرمائی اور نبوت کی نعمت سے بھی سرفراز فرمایا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دولتِ دنیا، اقتدار و اختیار حاصل کرنا، اعلیٰ رہائش استعمال کرنا فی نفسہٖ برا نہیں ان نعمتوں کا غلط استعمال منع ہے۔ قرآن حکیم میں ملتا ہے کہ فرعون کے پاس بھی حکومت و سلطنت، مال دنیا، محلات سب کچھ تھا لیکن اس

کی مذمت کی گئی ہے۔سلیمان علیہ السلام کے پاس بھی حکومت وسلطنت، جواہرات، مال ودولت، اقتدار واختیار سب کچھ تھا اور آپؑ کی تعریف کی گئی ہے تو فرق کیا ہے؟ فرق یہ ہے کہ فرعون کی دولت ظلم، لوٹ مار اور ناجائز ذرائع سے حاصل کردہ تھی، اس کی حکومت جبر قہر تھا اور سلیمان علیہ السلام کی حکومت حق وانصاف، عدل اور حقوق کی پاسداری کا نام تھا۔ مال ودولت جائز وسائل کی پیداوار تھی۔ آپؑ اللہ کریم کے برگزیدہ بندے تھے۔

ایوب علیہ السلام کا ذکرِ خیر:

ایوب علیہ السلام کے واقعہ کو دیکھیں۔ اللہ کریم نے کس طرح کی محیّر العقول چیزیں جمع کردی ہیں۔ اللہ کریم نے کس طرح اپنی قدرت کی نشانیوں کے طور کیسے عجائبات دکھائے۔ حضرت ایوب علیہ السلام اللہ کے مقرب بندے اور نبیؑ تھے۔ آپؑ کو ایک ایسی بیماری لگ گئی کہ بدن پر پھوڑے نکل آئے یہاں تک کہ پورا بدن بھر گیا۔ آپؑ بڑے خوشحال گھرانے کے فرد تھے۔ بڑا خاندان تھا، بہت سے افرادِ خانہ تھے لیکن آپؑ اکیلے رہ گئے صرف ایک بیوی ساتھ رہ گئی جو حضرت یوسف علیہ السلام کی پوتی تھیں۔ یوسف علیہ السلام کے بیٹے منشا کی بیٹی تھیں۔ انہوں نے ہی سنبھالا جب جسم ایک پھوڑا بن گیا اور اہلِ شہر کو فکر لاحق ہوگئی کہ یہ مرض دوسروں کو بھی لگ جائے گا تو انہوں نے آپؑ کو شہر سے باہر نکال دیا۔ قرآن حکیم میں متعدد مواقع پر اس قصہ کے مختلف اجزاء آئے ہیں۔ یہ بہرحال حتمی بات ہے کہ ایوب علیہ السلام کی ان اہلیہ محترمہ نے آپؑ کا ساتھ نہ چھوڑا۔ دن کو گھروں میں مزدوری کرتیں اور جو اجرت ملتی اس سے آپؑ کی غذا اور دوا کا اہتمام کرتی تھیں۔

انقلابات زمانہ آتے رہتے ہیں۔ یہ حالات من جانب اللہ آتے ہیں۔ یاد رہے جب اللہ کریم کے مقربین پر تکالیف آتی ہیں تو ان کی بلندیٔ درجات کا سبب ہوتی ہیں۔ قربِ الٰہی کا سبب ہوتی ہے۔ ہم جیسے کمزور مسلمانوں پر جو تکلیف آتی ہے تلافیٔ مافات بن جاتی ہے۔ اس سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ کافر پر جو تکلیف آتی ہے وہ از قسمِ عقوبات ہوتی ہے۔ وہ گناہوں کی سزا ہوتی ہے۔ وہ دل کو دکھ دیتی ہے۔ مومن کی تکلیف اس کے دل کو دکھی نہیں کرتی وہ دل سے اللہ کا شکر کرتا ہے۔ تکلیف آکر گزر جاتی ہے۔

بالآخر جب ایوب علیہ السلام کا شفاء ملنے کا وقت آگیا تو اللہ کریم نے انؑ کے دل میں بات ڈال دی اور آپؑ نے بارگاہِ الٰہی میں دعا کی۔ فرمایا: وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۸۳﴾ اے میرے ربّ! مجھے بہت بڑی مصیبت نے آلیا، اب یہ بہت بڑھ گئی ہے، میری برداشت سے باہر ہوچکی ہے اور تو بڑا رحم کرنے والا ہے۔ تیری رحمت کی تو کوئی حد نہیں، کوئی انتہا نہیں، تیری رحمت تو

سمندرِ بے کنار ہے، تیری نظرِ کرم ہو جائے۔ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ فَكَشَفْنَا مَا بِهِ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهُ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ ﴿۸۴﴾ فرمایا، ہم نے آپؑ کی دعا قبول کر لی ساری تکلیف دور فرما دی۔ قرآن حکیم میں دوسری جگہ ہے کہ اللہ کریم نے آپؑ کے لیے آپؑ کے پاؤں میں چشمہ جاری فرما دیا۔ آپؑ نے اس چشمے سے غسل فرمایا، ساری بیماری جاتی رہی آپ مکمل صحت یاب ہو گئے۔ اللہ کریم نے اپنے کرم سے کھویا ہوا خاندان ملا دیا۔ اب یہ اللہ کریم بہتر جانتے ہیں کہ وہ کس طرح بچھڑے اور کیسے ملا دیے گئے۔ یہ تفصیل کسی تفسیر میں نہیں ملتی۔ قرآن حکیم خود بتا رہا ہے کہ پہلے سارے الگ ہو گئے تھے پھر اللہ کریم نے اپنی قدرت سے سارا خاندان ملا دیا اور اس کے ساتھ آپؑ کو اتنا ہی مزید عطا فرما دیا۔ آپؑ کا خاندان بھی بڑھ گیا اور مال و دولت بھی بڑھ گیا۔

عبادت کرنے والوں کے لیے نصیحت:

فرمایا، یہ سب اللہ کی رحمت کا مظہر تھا۔ اس میں اللہ کی عبادت کرنے والوں کے لیے نصیحت ہے۔ جو لوگ خلوصِ دل سے اللہ کی عبادت کرتے ہیں انہیں اللہ کریم سے ایک تعلق نصیب ہو جاتا ہے۔ یہ تعلق ایسا ہوتا ہے کہ راحت آئے تو شکر ادا کرتے ہیں، تکلیف آ جائے تو بھی دل بے چین نہیں ہوتا۔ بہر حال اللہ کا شکر ہی کرتے ہیں۔

ایک حکایت ہے کہ ایک کسان بادشاہ کے لیے خوبصورت اور تازہ پھل لے گیا۔ بادشاہ کو پھل بھلا لگا۔ اس نے پھل کاٹ کر پہلے ایک قاش اپنے وزیر کو دی۔ وہ اسے مزے لے کر کھا گیا دوسری قاش بادشاہ نے خود کھائی۔ منہ میں ڈالتے ہی منہ کڑوا ہو گیا کیونکہ وہ پھل کڑوا تھا۔ بادشاہ اپنے وزیر پر سخت خفا ہوا کہ اگر پھل کڑوا تھا تو اسے کیوں مزے لے کر کھا لیا۔ وزیر نے جواب دیا۔ حضور! اتنے برسوں سے آپ کے ساتھ بے شمار اچھے اچھے کھانے کھا رہا ہوں۔ ایک دن قاش کڑوی کھا لی تو کیا آپ کو شکایت کرنے لگ جاؤں۔ آپ کے عمر بھر کے احسان بھول جاؤں۔

اللہ کے عبادت گزار بندوں کا اللہ کریم سے ایسا ہی تعلق ہوتا ہے۔ وہ اللہ کریم کی نعمتیں لیتے ہیں اور شکر کرتے ہیں اور کبھی ان پر دکھ، تکلیف بھی آ جائے تو وہ شکایات نہیں کرتے اللہ کی رحمت کے ہی منتظر رہتے ہیں اس سے ان کے درجات بلند ہو جاتے ہیں۔

بلندیٔ درجات میں انبیاؑ کی تو شان ہی جدا ہے۔ اللہ کریم نے اپنے مقرب بندے ایوب علیہ السلام کی مثال دی ہے کہ کس طرح اللہ کی طرف سے آنے والی مصیبت پر آپؑ نے صبر فرمایا، شاکر رہے۔ بالآخر اپنے ربّ سے دعا

کی اور ربّ کریم نے اپنی شانِ رحمت سے آپؑ کو سب کچھ عطا فرما دیا۔ فرمایا: وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ ﴿۸۴﴾ اور یہ نصیحت ہے اللہ کی عبادت کرنے والوں کے لیے۔ بندے کو یاد رہے کہ دکھ تکلیف، غربت افلاس، امیری تونگری، آرام آسانی یہ سب ربّ کی طرف سے ہے۔ جس کو جو چاہتا ہے دیتا ہے، جتنا چاہتا ہے دیتا ہے۔ عبادت کر کے بندہ خدا نہیں بن جاتا کہ وہ سوچے کہ اب چونکہ اس نے بہت زیادہ عبادت کر لی ہے تو اب وہ ہونا چاہیے جو وہ چاہتا ہے۔ اس نصیحت کو یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ وہی ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے، وہی ہوگا جو اللہ چاہے گا۔ عبادت کر کے خود کو اللہ کا شریک بنانے کا خیال نہ کرو بلکہ اللہ کا بندہ بننے کا سوچو۔

عبادت کا حاصل یہ ہے کہ جتنی زیادہ عبادت کی توفیق ملے اتنا زیادہ اس میں خلوص آنا چاہیے۔ اس میں یہی نصیحت ہے عبادت کرنے والوں کے لیے کہ انبیاؑ و رسل پر بھی تکلیفیں آئیں، مسائل سے دوچار ہوئے۔ کتنے نبیؑ قید ہوئے، کتنے شہید ہوئے تو ان کا تعلق باللہ کتنا مثالی رہا۔ ایک عام مسلمان جب عبادت کرتا ہے تو اپنی حیثیت کے مطابق اس کی عبادت میں خلوص آنا چاہیے۔ عبادت کا حاصل یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے نعمتیں ملیں تو شکر ادا کرے اور تکلیف آ جائے تو بلبلا نہ اٹھیں۔ اللہ کریم نے عبادت گزاروں کے لیے مثالیں بیان فرماتے ہوئے اپنے برگزیدہ بندوں کا ذکر جاری رکھتے ہوئے فرمایا: وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِدْرِيْسَ وَذَا الْكِفْلِ ۭ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۸۵﴾ اسی طرح اسمٰعیل علیہ السلام، ادریس علیہ السلام اور ذوالکفل علیہ السلام سب نبیؑ تھے اور سب صبر کرنے والوں میں سے تھے۔ اسمٰعیل علیہ السلام کو دیکھیے۔ جب والدِ گرامی کے ساتھ دوڑنے پھرنے کی عمر کو پہنچے تو والدِ گرامی کو حکم ہوگیا کہ اسمٰعیل علیہ السلام کو ذبح کر دیں۔ آپؑ نے والدِ گرامی ابراہیم علیہ السلام سے عرض کی کہ میں ننھا سا بچہ سہی لیکن اللہ کا نبیؑ بھی ہوں۔ آپ مت گھبرائیے میں چلاؤں گا نہیں۔ آپؑ کو حکم دیا گیا ہے آپ حکم بجا لائیے۔ آپؑ ان شاء اللہ مجھے صابرین میں سے پائیں گے۔

اللہ کی عبادت کا مقصد اللہ کے قربِ خصوصی کا حصول ہے۔ جو لوگ اِدھر اُدھر سے، کتابوں سے پڑھ کر وظیفے شروع کر دیتے ہیں۔ قرآن کی آیتوں کو، سورتوں کو مخصوص کر دیتے ہیں۔ ان کی عبادت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اب وہ حاکم بن گئے ہیں۔ اب وہ ہوگا جو وہ کہیں گے۔ یہ اللہ کی عبادت نہیں۔ عبادت سے انسان خدا نہیں بن جاتا کہ وہ جو کہے وہ ہو جائے۔ ایسے وظائف پڑھنے والوں کی گمراہی کی داستانیں عام ہیں۔ گزشتہ دنوں ایک صاحب نے مجھے لکھا کہ کوئی وظیفہ بتائیں کہ ہمزاد میرے تابع ہو جائے پھر میں نیکی اور بھلائی کے کام کروں گا۔ میں نے اسے لکھا، اللہ کے بندے! ہمزاد تو شیطان ہوتا ہے۔ ہر پیدا ہونے والے شخص کے ساتھ ایک شیطان پیدا ہوتا ہے۔ عملیات کی زبان میں اسے ہمزاد کہتے ہیں۔ اب شیطان تمہارا تابع کیسے ہوگا؟ ہاں! یہ شان

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ پیدا ہونے والا مسلمان ہوگیا۔ میرا اور تمہارا شیطان تو مسلمان ہونے سے رہا اور ہماری ماننے سے رہا لہٰذا تم شیطان کو مسخر کرنے کے بجائے اپنے آپ کو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کے تابع کرلو۔

اہمیتِ شیخ:

یہاں ضرورت پڑتی ہے شیخ کی جو قلوب کو ذکر اللہ سے صیقل کرائے (صاف کرے) اور برکاتِ نبوت دلوں میں انڈیل دے۔ اللہ کے بندے اللہ کی رضا پر راضی رہنے کا جذبہ پالیں۔ خلوص، فعل ہی دل کا ہے۔ جب تک دل میں خلوص نہ آئے ظاہری عبادات کافی نہیں۔ عبادات کا حاصل یہ نہیں کہ بندہ اللہ کا شریک بن جائے۔ عبادات کا حاصل یہ ہے کہ بندے میں عجز پیدا ہوجائے، مزید خشوع پیدا ہوجائے، مزید قربِ الٰہی اور اللہ کی رضا پر راضی رہنے کا جذبہ قوی ہوجائے۔

انبیا علیہم السلام مثالی ہستیاں:

اپنے انبیاء علیہم السلام کی مثالیں دے کر فرمایا، اسمٰعیل علیہ السلام کی داستان پڑھ لو، ادریس علیہ السلام کے حالات دیکھ لو، ذوالکفل علیہ السلام کو دیکھ لو: كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۸۵﴾ سب پر مشکل وقت آئے، تنگی آئی، تکلیفیں آئیں، سب نے صبر کیا۔ جب انبیاء علیہم السلام نے صبر کی مثالیں قائم کردیں تو فرمایا: وَاَدْخَلْنٰهُمْ فِيْ رَحْمَتِنَا ۔۔۔ تو ہم نے انہیںؑ اپنی رحمتِ خاص میں داخل کرلیا۔ اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۶﴾ بے شک میرے یہ بندے ایسے نیک لوگوں میں سے تھے جنہیں حقیقی طور پر نیک کہا جاسکتا ہے۔ یہ صالحین تھے، میرا حکم ماننے والوں میں سے تھے۔

یونس علیہ السلام کا ذکرِ خیر:

فرمایا: وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ ۔۔۔ اور مچھلی والے یونس علیہ السلام کا ذکر پڑھ لیجیے۔ جب آپؑ قوم سے ناراض ہوکر چلے گئے تو انؑ کا خیال تھا کہ ہم اس بات پر کوئی دارو گیر نہ کریں گے۔

واقعہ یوں ہوا کہ یونس علیہ السلام برسوں اپنی قوم پر محنت کرتے رہے، قوم ان پر ایمان نہ لائی بلکہ ان کا مذاق اڑاتی رہی، ایذاء دیتی رہی بالآخر آپؑ نے یہ بددعا دی کہ یا اللہ انہیں تباہ کردیں۔ اللہ کریم کی طرف سے آپؑ کو بتادیا گیا کہ قوم کو آگاہ کردیں کہ ان کے پاس صرف تین دن ہیں۔ چوتھے دن ان پر عذاب نازل کردیا جائے گا۔ آپؑ نے قوم میں اس بات کا اعلان فرمادیا اور قوم کے توبہ کرنے کے لیے دعا فرماتے رہے۔ وقت مقررہ ختم ہونے

سے پہلے رات کو ہی آپؑ اس بستی سے نکل گئے۔

یونس علیہ السلام کا اجتہاد:

یہ یونس علیہ السلام کا اجتہادی فیصلہ تھا۔ اور یونس علیہ السلام کا خیال تھا کہ اس پر کوئی گرفت نہیں ہوگی لیکن اللہ کریم نے اس پر گرفت فرمائی۔ آپؑ صاحبِ وحی تھے۔ بذریعہ وحی جب حکم آتا کہ اب نکل جائیں تب نکلتے جیسا کہ گزشتہ انبیاؑ نے کیا۔ جن قوموں پر عذاب آئے اُن کے انبیاؑ پر وحی آئی، فرشتے نے اللہ کا حکم پہنچایا کہ اب آپ اس جگہ کو چھوڑ دیں تب انبیاؑ وہاں سے نکلے لیکن یونس علیہ السلام اپنے اجتہاد سے نکل گئے تو اللہ کریم نے آپؑ کو مچھلی کے پیٹ میں پہنچا دیا۔

تمام انبیا علیہم السلام معصوم عن الخطا ہوتے ہیں:

تمام انبیائے کرامؑ تخلیقی طور پر ہر گناہ سے معصوم ہوتے ہیں۔ یونس علیہ السلام بھی اللہ کے نبیؑ تھے۔ ہر نبیؑ معصوم ہوتا ہے لیکن انسانی فطری اور طبعی چیزیں موجود ہوتی ہیں۔ آپ علیہ السلام تو رات ہی کو نکل پڑے اور قوم کو جب معلوم ہوا کہ یونس علیہ السلام جا چکے ہیں تو اُن کے بڑوں نے سوچا اگر یونس علیہ السلام جا چکے ہیں تو پھر یہ بات یقینی ہے کہ عذاب آئے گا۔ صبح کو عذاب آتا دیکھ لیا تو اپنے نبیؑ کی بات نہ ماننے پر نادم ہوئے اور آہ و زاری کرنے لگے۔ ساری قوم میدان میں اکٹھی ہوگئی۔ مرد، عورتیں، بچے، جانور سب بلبلا رہے تھے۔ اللہ کریم نے ان کی توبہ قبول کر لی۔ وہ ایمان لے آئے اور عذاب ٹل گیا۔

یونس علیہ السلام بستی سے باہر تھے۔ آپؑ کو قوم کے توبہ استغفار کرنے کا علم نہیں تھا۔ جب قوم پر سے عذاب ٹل گیا تو آپؑ کو طبعی طور پر فکر لاحق ہوگئی کہ میں نے تو اللہ کا حکم سنا دیا تھا کہ چوتھے دن عذاب آجائے گا اب واپس جاؤں گا تو قوم مجھے جھوٹا قرار دے گی۔ اس لیے آپؑ نے اس بستی سے ہجرت کا ارادہ کر لیا۔ آپؑ کا شہر چھوڑ جانا اسی طبعی خوف کے باعث تھا ورنہ جسے اللہ کریم نے یونس علیہ السلام کی پیغمبرانہ شان کے مطابق نہ پایا تو مچھلی کے پیٹ میں پہنچا دیا۔ آپؑ نے اللہ کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کی تھی۔ جس کشتی میں سوار ہو کر آپؑ ہجرت فرمانے لگے تھے وہ کشتی دریا کے بیچ پہنچ کر رک گئی۔ کشتی والوں نے کہا کوئی غلام اپنے آقا سے بھاگا ہوا ہے جو اس کشتی میں سوار ہے۔ آپؑ نے کہا وہ غلام میں ہوں۔ کشتی والوں نے کہا انصاف کا تقاضا ہے کہ قرعہ ڈالا جائے۔ تین بار قرعہ ڈالا گیا اور آپؑ ہی کا نام نکلا تو آپؑ کو دریا میں ڈال دیا گیا۔

انبیاؑ کے وجود ہمیشہ سلامت رہتے ہیں:

انبیاؑ کے وجود میں ایسی برکت ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ سلامت رہتے ہیں۔ یونس علیہ السلام کو بھی مچھلی نے سالم نگل لیا۔ آپؑ مچھلی کی غذا نہیں بنے ارشاد باری ہے: فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِیْنَ ﴿۱۴۳﴾ لَلَبِثَ فِیْ بَطْنِهٖۤ اِلٰى یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴۴﴾ (الصفت) پھر انہوں نے مجھے یاد کیا میں نے انہیں معافی دے دی اور مچھلی نے انہیں باہر اگل دیا۔

اگر آپؑ کا وصال مچھلی کے پیٹ میں ہو جاتا تو مچھلی کا پیٹ بھی تب تک زندہ رہتا جب تک دوسرے لوگ قبروں سے زندہ ہوتے۔ نبی علیہ السلام کی موت عام آدمی کی موت کی طرح نہیں ہوتی۔ آپؑ مچھلی کے پیٹ کی غذا نہیں بنے۔ وہاں بھی حواس قائم رہے، زندگی باقی رہی، اللہ کا ذکر کرتے رہے۔ وہیں پر دعا کی۔ فرمایا: فَنَادٰى فِی الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۸۷﴾ پس انہوںؑ نے مچھلی کے پیٹ کے اندھیروں میں پکارا کہ آپ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔ آپ پاک ہیں۔ بے شک میں قصور واروں میں سے ہوں۔ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّیْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ؕ وَكَذٰلِكَ نُـْۨجِی الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۸۸﴾ فرمایا، ہم نے انؑ کی دعا قبول فرمالی اور مصیبت دور کر دی۔ اللہ کریم نے مچھلی کو حکم دیا، اس نے کنارے پر اُگل دیا۔ اللہ کریم نے وہاں آپؑ کے لیے بڑے پتوں والی بیل اُگا کر سایہ کر دیا۔ جنگلی بکری کو حکم دیا وہ آپؑ کے پاس آتی آپ اس سے دودھ حاصل کرتے۔

اِدھر قوم پر سے عذاب ٹل گیا۔ قوم ایمان لے آئی اب انہیں یونس علیہ السلام کی تلاش ہوئی تو اِدھر اُدھر پھیل کر تلاش کرنے لگے بالآخر انہوں نے اپنے نبیؑ کو تلاش کر لیا، اظہار ندامت کیا اور اپنے ساتھ واپس لے گئے۔

فرمایا اس طرح ہم اپنے بندوں کو مصیبتوں سے خلاصی دیتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ وہ صبر کریں۔ اللہ کی بارگاہ سے ناامید نہ ہوں۔ اپنی امیدیں اسی سے وابستہ رکھیں۔ دکھ اور غم میں اسی کو پکاریں، جائز اسباب ضرور اختیار کریں لیکن بھروسہ اسباب پر نہیں ربّ العالمین پر ہو۔

زکریا علیہ السلام کی دعا:

زکریا علیہ السلام نے ساری زندگی اللہ کے پیغام کو پھیلانے میں صرف کر دی۔ بڑھاپے تک اسی کام میں تندہی سے لگے رہے۔ آپؑ کی یہ خواہش تھی کہ تبلیغ حق کے اس کام کو جاری رکھنے کے لیے اللہ انہیں ایک وارث عطا فرمائے جو نبیؑ کی وراثت یعنی علوم دین اور معرفتِ الٰہی کو اسی محبت، لگن اور استقلال سے آگے پہنچاتا

رہے۔ اللہ کریم فرماتے ہیں: وَزَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ۔۔۔ اسی طرح زکریا علیہ السلام کا واقعہ دیکھ لیجیے جب انہوں نے ہمیں یعنی اپنے پروردگار کو پکارا: رَبِّ لَا تَذَرْنِىْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿٨٩﴾ اے میرے ربّ مجھے اکیلا نہ رکھ اور سب سے بہتر وارث تو ہی ہے۔ یا اللہ! مجھے ایسی اولاد دے جو میرے بعد میری اس محنت کو قائم رکھے، لوگوں کو سنبھالے، تیری عبادت کرنے کی تربیت کرے۔ لوگوں کو کسی ایک محرک کی ضرورت ہوتی ہے جو لوگوں کو تحریک دیتا ہے۔ زکریا علیہ السلام کی دعا بھی دین کے فروغ کے لیے تھی۔ فرمایا: فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۡ وَوَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ۔۔۔ ہم نے اپنے بندے کی دعا قبول فرمالی۔ بظاہر تو یہ بات ناممکنات میں سے تھی کہ بیوی بانجھ ہو اور اسے بڑھاپا بھی آچکا ہو اور اسے اولاد ہو جائے۔ میاں بھی بڑھاپے میں ہوں۔ فرمایا، ہم نے اپنے بندے کی دعا قبول فرمالی، آپؑ کو اور آپؑ کی اہلیہ کو اس قابل بنا دیا کہ ان کی اولاد ہو جائے۔ آپؑ کو یحییٰ علیہ السلام جیسا بیٹا عطا فرما دیا۔

ایمان، اُمید اور خوف کے درمیان ہے:

فرمایا: اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ؕ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ﴿٩٠﴾ یہ وہ لوگ تھے جو نیکی کے کاموں میں جلدی کرتے تھے اور ہمیں امید اور خوف سے پکارتے تھے۔ بتایا جارہا ہے کہ اللہ کی بارگاہ سے مایوس بھی نہ ہوں اور بے خوف بھی نہ ہو کہ دلیر ہو کر نافرمانیاں کرنے لگ جاؤ۔ ایمان یہی ہے کہ اللہ سے امیدِ بخشش بھی رکھے اور اللہ کی نافرمانی کرنے سے ڈرتا بھی رہے۔

انبیاء علیہم السلام کی مقدس جماعت کا ذکرِ خیر چل رہا ہے۔ اللہ کریم فرمارہے ہیں کہ یہ گروہِ انبیاؑ ہمارے سامنے عاجزی کیا کرتے تھے، خشوع کرنے والے تھے۔ یہ سب ہمارے روبرو نہایت عاجزی کرتے تھے، ہماری عظمت سے آگاہ تھے۔

خشوع یا عاجزی کیا ہے؟

عجز یہ ہے کہ کسی کو بااختیار، اپنے سے بڑا سمجھ کر، مان کر اپنی اصلیت کا تعیّن کرنا۔ جب معاملہ بارگاہِ باری تعالیٰ کا ہو تو اللہ کریم کو کوئی کتنا بااختیار، قادر سمجھتا ہے یہ ہر بندے کا اپنا درجہ ہے۔ اللہ کریم کی جس قدر عظمت اس پر آشکارا ہوگی اتنا وہ اپنے عجز اور کمزوری کا اعتراف کرے گا۔ اندرونِ قلب کی عاجزی اور نیازمندی کا نام خشوع ہے۔ دلی طور پر عظمتِ الٰہی کا اقرار اور اللہ کے سامنے اپنی بے بسی کا اقرار عاجزی ہے۔

انبیاؑ علیہم السلام معرفتِ الٰہی کے بلند ترین درجے پر ہوتے ہیں جو مخلوق کو اللہ کی معرفت کی طرف

راہنمائی کرتے ہیں، عظمت الٰہی سے آشنا کرواتے ہیں۔ جس درجے کی معرفت انبیاؑ علیہم السلام کی ہوتی ہے اُسی درجے کا ان کا خشوع ہوتا ہے۔ فرمایا، یہ سارے نبی اور رسول علیہم السلام ہماری عظمت کا اقرار اور اپنی عاجزی کا اظہار کرتے تھے۔

پاکباز بی بی والدۂ عیسیٰ علیہ السلام کی پاکبازی کی تعریف:

وَالَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿٩١﴾ اور اُن خاتون کو یاد کریں جس نے اپنی آبرو کی حفاظت بہت بہترین انداز میں کی۔ اپنی آبرو کو بہت سنبھال کر رکھا۔ اس قدر پاک دامن تھیں، اتنی مقرب بارگاہِ الٰہی تھیں کہ ہم نے اُن میں اپنی روح پھونک دی۔

اللہ کی ذات حصّوں سے پاک ہے۔ اپنی روح سے مراد ہے اپنی ملکیت۔ ہر چیز ہی اللہ کریم کی ملکیت ہے۔ اپنی روح سے مراد ہے کہ بغیر خاتون اور مرد کے ملاپ کے، اولاد کے حصول کے اسبابِ ظاہریہ میں سے کسی سبب کو درمیان میں لائے بغیر، خاص اپنے پاس سے براہِ راست ہم نے ان کے وجود میں روح پھونک دی۔ اور اُن کو اور ان کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی نشانیوں میں سے ایک عظیم نشانی بنا دیا۔

عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے نبی تھے اور نبیؑ ہونا عظمت کے لیے کافی ہے لیکن یہاں اللہ کریم آپؑ کی خصوصی شان بیان فرما رہے ہیں کہ آپؑ نے اللہ کے حکم سے ماں کی گود میں کلام فرمایا۔ اپنی نبوت کا اعلان کیا اور احکامِ الٰہی بتائے۔ جب آپؑ بڑے ہوئے تو محیّر العقول معجزات آپؑ کے ہاتھوں پر صادر ہوئے۔ اندھوں کو بینائی نصیب ہو جاتی تھی، بیمار، شفایاب ہو جاتے تھے، مردے اللہ کے حکم سے زندہ ہو جاتے تھے۔ آپؑ مٹی سے کسی پرندے یا جانور کی مورت بناتے اور اسے اللہ کے حکم سے فرماتے کہ زندہ ہو جا تو وہ پرندہ بن کر اڑ جاتا، جس جانور کی شکل بناتے وہ جانور زندہ ہو کر چلنے پھرنے لگتا۔ آپؑ کے بے شمار کمالات و معجزات تھے۔ اس عظمت کے باعث فرمایا کہ ہم نے حضرت مریم اور آپ کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی عظیم نشانیاں بنا دیا۔

کیا شادی نہ کرنا کمال ہے؟

زکریا علیہ السلام نے دعا کی اور آپؑ کو حضرت یحییٰ علیہ السلام کی صورت میں بیٹا عطا ہوا تو اللہ کریم نے فرمایا کہ آپ کا یہ بیٹا: وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا ۔۔۔ (آل عمران: 39) سردار ہوگا اور جنسِ مخالف کے قریب نہیں جائے گا۔ حصُوْرًا کے معنی ہیں "پابند"۔ "حدود کے اندر" مراد یہ ہے کہ آپ اپنی ذات میں ہی رہیں گے جنسِ مخالف سے قرب نہیں کریں گے۔

یہاں حضرت مریم علیہ السلام کی بھی یہی تعریف کی گئی تو کیا شادی نہ کرنا کوئی اعلیٰ کام ہے، کیا یہ کوئی کمال ہے؟ ایسا نہیں ہے۔ اگر شادی نہ کرنا کمال ہوتا تو یہ کمال سب سے پہلے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم میں ہوتا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم جامع کمالات ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے نہ صرف شادیاں کیں بلکہ حکم دیا کہ شادی کرنا میری سنّت ہے۔ ارشاد ہے: اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ (ابن ماجہ) اوکما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم۔ جو باوجود توفیق رکھنے کے شادی نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں۔ اس قدر زجر و توبیخ اور تنبیہہ کر دی تو پھر یہاں شادی نہ کرنے کی تعریف سے کیا مراد ہے؟ یہاں تعریف اس بات کی ہے کہ شادی نہ کر سکنے کی صورت میں اپنی آبرو کی ایسی حفاظت کرے کہ تہمت بھی نہ لگ سکے۔ یہاں شادی کی ممانعت نہیں کی جا رہی نہ ہی شرعی عذر کے بغیر تجرد کی فضیلت بیان ہو رہی ہے۔ یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ حضرت مریم علیہ السلام کی شادی نہیں ہوئی تو انہوں نے اپنی عصمت کی حفاظت کی اور ان کا اپنی آبرو کو محفوظ رکھنا مثالی تھا۔

ایک لطیف نکتہ:

اس میں ایک باریک نکتہ ہے جو سمجھنے سے تعلق رکھتا ہے اور جو شاید صاحبِ دل بندے کو ہی سمجھ آ سکتا ہے۔ دوسروں کے لیے اس کا سمجھنا اتنا آسان نہیں ہے۔ جس کو اللہ کریم صاحبِ حال بنا دے، اس کے پاس کیفیات ہوں، احوال ہوں وہ شاید اس بات کو سمجھ سکے۔ بیان کر دینا ضروری ہے کسی کے کام ہی آ جائے کہ دنیا کے جتنے بھی کام ہیں، کاروبار، تجارت، ملازمت یعنی روزی کمانا۔ تعلیم و تعلّم یعنی پڑھنا پڑھانا یہ ساری مصروفیات ایسی ہیں کہ آپ جس کام میں بھی لگ جائیں وہ توجہ جذب کر لیتا ہے اور صاحبِ حال کی جو توجہ اللہ کی طرف ہوتی ہے اس میں کمی آ جاتی ہے۔

ان سب میں سب سے زیادہ توجہ جذب کرنے والا فعل جنسی ملاپ ہے۔ یہ ایسا کام ہے کہ آدمی کی ساری توجہ اس کی طرف مبذول ہو جاتی ہے۔ اس لیے اگر اسے شرعی طریقے سے بھی کیا جائے تو بھی وہ توجہ جذب کرتا ہے اور اگر شرعی طریقے سے نہ ہو سکتا ہو تو پھر بالکل نہ کرنا بہت بڑا کمال ہے۔ الحمد للہ۔

ہر نبیؑ اپنے عہد کی باکمال ہستی ہوتا ہے:

فرمایا، ہم نے مریم علیہ السلام کے فرزندِ ارجمند کو جہان بھر کے لیے اپنی ایک عظیم نشانی بنا دیا۔ جب تمام کائنات کے لیے نشانی بنا دیا تو کیا حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اتنے افضل ہو گئے تو پھر دیگر انبیائے کرام علیہم السلام کی عظمت کہاں گئی؟ یاد رہے ہر نبیؑ اپنے عہد میں پوری کائنات کے لیے باکمال ہستی ہوتا ہے

یعنی جب عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا زمانہ تھا تو آپؑ ساری کائنات میں اللہ کریم کی عظیم نشانی تھے۔ بعض سادہ لوح حضور صلی اللہ علیہ وسلّم سے تقابل کرنے لگ جاتے ہیں جیسے یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام سارے جہانوں میں خوبصورت تھے تو کیا آپؑ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم سے خوبصورت تھے؟ اس طرح کے سوال گستاخی ہیں۔ تمام نبیؑ اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم امام الانبیاء ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ جب یوسف علیہ السلام کا عہد تھا تو روئے زمین پر اُن جیسا کوئی خوبصورت نہیں تھا۔ اسی طرح اپنے عہد میں حضرت مریم مقربِ بارگاہ تھیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب تھے تو کائنات بھر میں ان جیسا مقربِ الٰہی کوئی دوسرا نہیں تھا یعنی ہر فضیلت اپنے عہد سے تعلق رکھتی ہے۔ اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۹۲﴾ انبیاؑ کی مقدس جماعت کو خطاب ہو رہا ہے اور اگرچہ حضرت مریم نبی نہیں تھیں لیکن اللہ کریم نے تقدس، آبرو کی حفاظت اور عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ ہونے کے حوالے سے آپ کا ذکرِ خیر بھی یہیں فرما دیا۔

فرمایا، اللہ کے نبیوں کی مقدس جماعت ایک ہی ہے اور میں آپ سب کا پروردگار ہوں تو میری ہی عبادت کیا کریں۔ تمام انبیاؑ نے توحید باری کی دعوت دی۔ اللہ کو وحدہٗ لاشریک ماننے کا حکم فرمایا۔ سب کا پیغام ایک ہی تھا۔ یاد رہے شریعت دو امور سے عبارت ہے۔ ایک عقائد جسے اصطلاحاً اخبار کہتے ہیں یعنی اطلاع دینا جیسے یہ کہ اللہ واحد و لاشریک ہے، حَیّ و قیوم ہے، جبّار و قہار ہے، اَلرَّحِیْمُ الرَّحْمٰنُ ہے بخشنے والا مہربان ہے۔ قیامت قائم ہوگی، فرشتے ہیں، آخرت میں حساب کتاب ہوگا۔ یہ اخبار ہیں ہر شریعت میں اخبار ایک سے ہی رہے۔ دوسری چیز ہے احکام۔ احکام مختلف شریعتوں میں فرق تھے۔ احکام میں اختلاف ہر عہد کے اعتبار سے اور استعداد کے اعتبار سے رہا۔ ہر عہد کی، ہر وقت کی ایک اپنی ضرورت تھی۔ ہر قوم کی اپنی ایک استعداد تھی۔ اللہ کریم نے اس کے مطابق احکام دیے۔

فرمایا: وَاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ﴿۹۲﴾ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ میں تم سب کا پروردگار ہوں۔ یہاں اللہ کریم نے معبود یا اِلٰہ نہیں فرمایا بلکہ رَبُّكُمْ فرمایا جس میں اپنی شانِ ربوبیت کا اظہار فرمایا کہ میں تمہارا ربّ ہوں۔ جتنے کمالات، جتنی عظمتیں، جتنے معجزات تھے وہ سب کو میں نے عطا کیے لہٰذا: فَاعْبُدُوْنِ ﴿۹۲﴾ میری ہی عبادت کرو۔

دین میں اختلاف کی بنیادی وجہ:

دین میں اختلاف صرف بے دین ہی کرتے ہیں اس لیے کہ انہیں رضائے باری مقصود نہیں ہوتی اپنے ذاتی مفادات عزیز ہوتے ہیں۔ وہ خود کو بڑا منوانا چاہتے ہیں، دنیا سے اپنی اطاعت کروانا چاہتے ہیں، دولت حاصل کرنا

چاہتے ہیں یا اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ فرمایا: وَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ۭ كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ ﴿۹۳﴾ ان لوگوں نے اپنی اغراضِ باطلہ کے لیے دین کے ٹکڑے کردیے۔ دین کی مختلف تعبیریں گھڑلیں، مختلف تاویلیں کرلیں۔

اگر مقصد اللہ کی رضا ہو تو اختلاف نہیں ہوتا۔ یاد رہے دین میں اختلاف تب ہوتا ہے جب اصول میں اختلاف کیا جائے یعنی اللہ کی توحید میں اختلاف، قرآن حکیم میں اختلاف، آخرت کے عقیدے میں اختلاف یا اسلام کے بنیادی عقائد میں کوئی اختلاف۔ جو اختلاف آئمہ کرام میں ہے وہ عقائد اور ضروریات دین، ارکان دین میں نہیں ہے۔ آئمہ کے درمیان اختلاف اعمال کی فضیلت میں ہے، تشریح اور وضاحت میں ہے۔ جیسے ایک امام کہتے ہیں آمین بالجہر کہو دوسرے کہتے ہیں خاموشی سے کہنا بہتر ہے۔ آئمہ کے اختلاف میں اللہ کریم نے یہ حسن رکھا ہے کہ ایک کام کے بہت سارے پہلو سامنے آجاتے ہیں۔ یہ وضاحت ہے اختلاف نہیں۔ اختلاف صرف بنیادی عقائد میں تبدیلی سے ہوتا ہے۔

فرمایا، سب نے جو اختلاف کیے تو ان کا مقصد دنیوی فائدے اٹھانا تھا۔ اس لیے انہوں نے دین کے ٹکڑے کردیے لیکن یہ کب تک دولتِ دنیا کو پاس رکھیں گے، کب تک حکومت اور اقتدار کے مزے لیں گے۔ آخر سب نے میری بارگاہ میں ہی حاضر ہونا ہے۔ سب دولت، حکومت، آسائشیں چھوڑ کر اکیلے اکیلے آنا ہے۔

سورۃ الانبیاء رکوع 7 آیات 94 تا 112

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ۚ وَاِنَّا لَهٗ
كٰتِبُوْنَ ﴿٩٤﴾ وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿٩٥﴾ حَتّٰٓى اِذَا
فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ﴿٩٦﴾ وَاقْتَرَبَ
الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا
فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿٩٧﴾ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ﴿٩٨﴾ لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ؕ
وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٩٩﴾ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿١٠٠﴾ اِنَّ
الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴿١٠١﴾ لَا
يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿١٠٢﴾ لَا
يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ
كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿١٠٣﴾ يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ؕ كَمَا
بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ؕ وَعْدًا عَلَيْنَا ؕ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿١٠٤﴾ وَلَقَدْ كَتَبْنَا
فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ﴿١٠٥﴾ اِنَّ
فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ﴿١٠٦﴾ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠٧﴾ قُلْ
اِنَّمَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿١٠٨﴾ فَاِنْ
تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ وَاِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا

تُوْعَدُوْنَ﴿۱۰۹﴾ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُوْنَ﴿۱۱۰﴾ وَاِنْ
اَدْرِيْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ﴿۱۱۱﴾ قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ
وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ﴿۱۱۲﴾

پس جو نیک کام کرے گا اور ایمان والا بھی ہوگا سو اُس کی محنت ضائع جانے والی نہیں اور بے شک ہم اُس کو لکھ لیتے ہیں ﴿۹۴﴾ اور جن بستیوں کو ہم نے ہلاک کر دیا اور یہ بات ناممکن ہے کہ وہ (دنیا میں) پھر لوٹ کر آئیں ﴿۹۵﴾ یہاں تک کہ جب یاجوج اور ماجوج کھول دیے جائیں گے اور وہ (بوجہ کثرت کے) ہر بلندی سے دوڑ رہے ہوں گے ﴿۹۶﴾ اور (قیامت کا) سچا وعدہ قریب آ جائے گا تو اچانک کافروں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی (اور کہتے ہوں گے) وائے ہماری کم بختی! ہم اس (حال) سے غفلت میں رہے بلکہ ہم (اپنے حق میں) ظلم کرنے والے تھے ﴿۹۷﴾ (کافرو! اس روز) یقیناً تم اور جن کو تم اللہ کو چھوڑ کر پوجتے ہو سب جہنم میں جھونکے جاؤ گے تم سب اس میں داخل ہو گے ﴿۹۸﴾ اگر یہ (واقعی) معبود ہوتے تو اس میں داخل نہ ہوتے اور سب اس میں ہمیشہ (جلتے) رہیں گے ﴿۹۹﴾ وہاں ان کا شور ہوگا اور اس میں اُنہیں کچھ سنائی بھی نہ دے گا ﴿۱۰۰﴾ بے شک جن لوگوں کے لیے ہماری طرف سے پہلے بھلائی مقرر ہو چکی وہ اس (دوزخ) سے دور کیے جائیں گے ﴿۱۰۱﴾ کہ وہ اس کی آہٹ بھی نہ سنیں گے اور وہ اپنی دل پسند چیزوں میں ہمیشہ رہیں گے ﴿۱۰۲﴾ ان کو (اس دن کا) بھاری خوف غمگین نہیں کرے گا اور فرشتے (ان کے قبر سے اٹھتے ہی) ان کو لینے آئیں گے (اور کہیں گے) یہ ہے تمہارا وہ دن جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا ﴿۱۰۳﴾ (وہ دن بھی قابلِ ذکر ہے) جس دن ہم آسمانوں کو (نفخہ اولیٰ کے وقت) اس طرح لپیٹ دیں گے جس طرح لکھے ہوئے مضمونوں کا کاغذ لپیٹ لیا جاتا ہے جس طرح ہم نے (کائنات کو) پہلے پیدا فرمایا اسی طرح ہم اس کو دوبارہ (پیدا) فرمائیں گے (یہ) ہم پر وعدہ (لازم) ہے ہم ایسا

ضرور کرنے والے ہیں ﴿۱۰۴﴾ اور یقیناً ہم نے ذکر (نصیحت) کے بعد زبور میں لکھ دیا تھا کہ میرے نیکوکار بندے ہی ملک کے وارث ہوں گے (یعنی حکومت نیک لوگوں کے سپرد کی جائے) ﴿۱۰۵﴾ یقیناً عبادت کرنے والوں کے لیے اس میں تبلیغ (پیغام پہنچا دینا) ہے ﴿۱۰۶﴾ اور ہم نے آپ کو (اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم) تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے ﴿۱۰۷﴾ فرما دیجیے کہ مجھ پر (اللہ کی طرف سے) وحی آتی ہے کہ تم سب کا معبود (حقیقی) ایک ہی (اللہ) معبود ہے تو کیا تم فرماں بردار ہو جاؤ گے؟ ﴿۱۰۸﴾ پھر اگر یہ منہ پھیر لیں تو فرما دیجیے میں نے تم سب کو برابر طور پر آگاہ کر دیا اور مجھ کو نہیں معلوم کہ جس چیز کا (قیامت) تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ جلدی (آنے والی) ہے یا (اس کا وقت) دور ہے ﴿۱۰۹﴾ وہ جو بات پکار کر کی جائے وہ یقیناً اُسے بھی جانتا ہے اور جو تم چھپا کر کرتے ہو اس سے بھی واقف ہے ﴿۱۱۰﴾ اور میں نہیں جانتا شاید وہ تمہارے لیے آزمائش ہو اور (تم کو) ایک مدت تک (اس کا) فائدہ دینا ہو ﴿۱۱۱﴾ (پیغمبر نے) فرمایا اے میرے پروردگار! حق کے ساتھ فیصلہ فرما دیجیے اور ہمارا پروردگار بڑا مہربان ہے اور اُسی سے ان باتوں میں جو تم بیان کرتے ہو مدد مانگی جاتی ہے ﴿۱۱۲﴾

تفسیر و معارف

صاحبِ ایمان ہونے کی شرط:

فرمایا: فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ ۔۔۔ جس کسی نے کوئی بھلا کام کیا بشرطیکہ وہ مومن ہو، یعنی اس کا عقیدہ صحیح ہو۔ صحتِ عقیدہ سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ کریم کی ذات کے بارے وہ عقیدہ رکھتا، ہو جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے بیان فرمایا۔ اطاعتِ الٰہی کے بارے اس کے پاس یہ سند ہو کہ اس کا عمل اس کے مطابق ہے جو رسول اللہ صلی اللہ وسلّم نے فرمایا ہے۔ یہ نہیں کہ وہ اپنی مرضی سے اعمال گھڑ لے۔ دین ہر شخص کی ذاتی رائے کا نام نہیں۔ دین ارشاداتِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نام ہے، تعمیلِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا نام ہے جو عمل حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے کرنے کا حکم دیا وہ نیکی ہے اس پر عمل کرنا دین۔ جس کام سے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے روک دیا اسے چھوڑ دینا دین

ہے۔ایسا شخص ہی صاحب ایمان ہے۔

فرمایا: فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ۚ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ﴿٩٤﴾ ایسے شخص کی ذرا سی کاوش بھی ضائع نہیں جائے گی۔ ہمارے کارندے چھوٹے سے چھوٹے عمل کو بھی لکھ لیتے ہیں، ضائع نہیں جانے دیتے۔اللہ کریم کا علم تو وسیع ہے اور حضوری ہے۔ماضی مستقبل سب اس کے حضور حاضر ہیں۔اس کے علاوہ اللہ کے مقرر کردہ لکھنے والے ساتھ ساتھ لکھتے جاتے ہیں۔ذرہ برابر عمل بھی داخل دفتر کرتے رہتے ہیں۔

اکثر سوال کیا جاتا ہے کہ کافروں نے بھی بھلائی کے کام کیے ہیں اور کرتے رہتے ہیں تو ان کو اس کا اجر ملے گا؟ جواب یہ ہے کہ کافر کا اللہ پر ایمان ہے نہ آخرت پر نہ اللہ کے نبیؐ سے کوئی تعلق ہے تو وہ آخرت میں کیا پائے گا؟اس کی بھلائی کا اجر اسے دنیا میں ہی دے دیا جاتا ہے۔اللہ کریم کافر کی بھلائی بھی ضائع نہیں کرتے۔

فرمایا: وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿٩٥﴾ اور جن بستیوں کو ہم نے ہلاک کر دیا یہ بات ناممکن ہے کہ وہ دنیا میں پھر لوٹ کر آئیں۔ہم نے شہروں کے شہر تباہ کر دیے۔قوموں کی قومیں غرق ہوگئیں تو یہ نہ سمجھا جائے کہ اللہ نے ان پر ظلم کر دیا۔اللہ کریم نے ان کے ساتھ زیادتی نہیں کی بلکہ وہ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے رہے۔وہ ایمان لانے والے تھے ہی نہیں۔ان کے مزاج بگڑ کر اس انتہا کو پہنچ چکے تھے کہ وہ ایمان قبول کرنے والے نہیں تھے۔انہیں اللہ کے نام کی عظمت کا کچھ خیال تک نہ تھا۔اگر ان کی آئندہ نسلیں بھی ہوتیں تو اسی طرح بے دین چلتی رہتیں۔اس جرم میں ہم نے انہیں تباہ کر دیا اور وہ لوگ خواب و خیال ہو گئے کہ انہیں پھر لوٹ کر دنیا میں نہیں آنا۔

یاجوج ماجوج:

فرمایا: حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ﴿٩٦﴾ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ يٰوَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿٩٧﴾ حتیٰ کہ ایک وقت آئے گا جب ہم یاجوج ماجوج کو کھول دیں گے۔وہ کثیر تعداد میں ہیں جو پہاڑوں، وادیوں میں پھیل جائیں گے۔ہر اونچی نیچی جگہ سے بھاگتے ہوئے آ رہے ہوں گے۔جو چیز سامنے ہوگی اسے چٹ کر جائیں گے، ہر شئے کو تباہ کرتے چلے جائیں گے تو یہ جو اللہ کی اطاعت چھوڑ کر ناجائز طریقوں سے دولت جمع کر رہے ہیں اسے یہ کہاں لے جائیں گے؟ جب یاجوج ماجوج نکل آئیں گے تو ان کے کام کیا آئے گا؟ یاجوج ماجوج کا کھلنا قیامت کی نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی ہے۔وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ ۔۔۔قیامت کا سچا وعدہ قریب آ جائے گا اور کافروں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی کہ یہ کیا ہو گیا؟ یاجوج ماجوج کی تباہی کے پیچھے پیچھے قیامت کا زلزلہ آ

جائے گا اور کافر بھی کہہ اٹھیں گے۔ ہم نے تو اس دن کو کبھی یاد ہی نہیں کیا تھا۔ ہم تو بھولے ہوئے تھے۔ اس دن کی طرف سے ہم بالکل غافل تھے۔ ہم نے ساری عمر ظلم وزیادتی اور لوٹ مار میں گزار دی جو دنیا جمع کی تھی ہمیں یاد ہی نہیں تھا کہ اس کا یہ انجام ہونے والا ہے۔ بَلْ كُنَّا ظٰلِمِيْنَ﴿۹۷﴾ بلکہ ہم نے تو بہت ہی ظلم کیے۔ اللہ کی یاد کو بھول گئے، اس کی عظمت کو یاد نہ رکھا، ساری عمر فضول گزار دی۔ ہم نے تو بہت بڑی زیادتی کی قرآن حکیم میں ملتا ہے کہ حضرت ذوالقرنین اللہ کے نیک بندے اور اعلیٰ درجے کے ولی تھے۔ انہیں کشف والہام بھی ہوتا تھا وہ جب سفر کرتے ہوئے ایسی جگہ پہنچے جہاں یاجوج ماجوج کا بسیرا تھا تو وہاں کے اچھے لوگوں نے ذوالقرنین (سکندر) سے شکایت کی یہ یاجوج ماجوج آجاتے ہیں قتل وغارت گری کرتے ہیں اور سب کچھ چھین کر لے جاتے ہیں۔ سکندر ذوالقرنین نے لوہے کی چادروں کو پہاڑوں کے درمیان رکھ کر پہاڑوں کے برابر بلند کر دیا۔ اس کے اوپر سات دھاتوں کو گرم کر کے پھیلا دیا۔ اس وقت انہوں نے فرمایا یہ رکاوٹ اب نہیں ٹوٹے گی۔ ہاں! جب میرا ربّ چاہے گا اسے توڑ دے گا۔ وہ اب تک وہاں اس سَدِ سکندری کے پیچھے محبوس ہیں۔ قربِ قیامت میں جب اللہ چاہے گا یہ باہر نکل آئیں گے۔

یاجوج ماجوج حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ انسان ہی تھے۔ جنگلوں میں رہنے کی وجہ سے وحشی ہو گئے۔ جس طرح دیگر انسانوں میں گورے، کالے، چھوٹے قد کے اور قدآور، کمزور، طاقتور ہوتے ہیں اسی طرح یہ بھی انسانوں ہی کی نسل ہے لیکن بالکل وحشی جانوروں جیسی عادات کے مالک ہیں۔ ان کی نسل بڑھ چڑھ کر بہت زیادہ ہو چکی ہے۔

آج کے محقق جن کا قرآن وحدیث پر ایمان نہیں وہ ان کے موجود ہونے کے منکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے سیٹلائٹ سے زمین کا چپہ چپہ چھان ڈالا ہے۔ انہیں کہیں یاجوج ماجوج نظر نہیں آئے۔ یہی مغربی محققین عرصے سے دعویٰ کر رہے ہیں کہ قطب شمالی اور جنوبی میں جو پہاڑ ہیں جو سارا سال برف سے ڈھکے رہتے ہیں وہاں کوئی برفانی مخلوق ہے۔ اس کے قدموں کے نشان انسانوں جیسے ہیں۔ ان نشانات سے پتا چلتا ہے کہ وہ بہت بڑا، قدآور اور قوی الجثہ ہے تو آج تک یہی محققین اسے اپنی سیٹلائٹ سے کیوں نہیں دیکھ سکے؟ یہ محقق کہتے ہیں کہ بحر الکاہل کے کنارے لوہے کی دیوار کے آثار ملے ہیں جو کسی زمانے میں کسی حکمران نے بنوائی تھی۔ وہ کہتے ہیں یہ سَدِ سکندری ہو سکتی جس سید سکندری کا ذکر قرآنِ حکیم میں ہے وہ صرف لوہے کی دیوار نہیں ہے۔ وہ لوہے کی چادروں پر سات دھاتوں کو پگھلا کر مضبوط آڑ بنائی گئی تھی۔

ایک مغالطہ یہ بھی ہے کہ سکندر ذوالقرنین کو مقدونیہ کا سکندرِ اعظم کہہ دیا جاتا ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ سکندر ذوالقرنین جن کا ذکر قرآن حکیم میں آیا ہے وہ اللہ کے نیک بندے تھے۔ وہ نبی نہیں تھے لیکن اہل اللہ میں سے پائے

کے ولی اللہ تھے۔ قرآن حکیم اس پر گواہ ہے کہ اللہ کریم نے فرمایا، ہم نے ذوالقرنین کو یہ بات کہی، یہ کام کرنے کا حکم فرمایا۔ مقدونیہ کا سکندر بے دین تھا اور سکندر ذوالقرنین اللہ کے نیک بندے تھے۔

جب کفار کھلی آنکھوں سے انکار کرنے کا وبال دیکھ لیں گے اور خود کو ظالم مان لیں گے اس وقت ارشاد ہوگا کہ اب توبہ کا وقت گزر چکا۔ تمہیں اب احساس ہوا جب واپسی کے راستے ختم ہو چکے۔ جب تم اتنی دور نکل گئے کہ واپس نہیں آسکتے۔ اب تو تمہارا انجام یہ ہے: اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ﴿۹۸﴾ اب تم اور وہ جن کی تم عبادت کرتے تھے دونوں جہنم میں جھونک دیے جاؤ گے۔ وہ پتھر کے بت، درخت، جانور جن کی تم پوجا کیا کرتے تھے سب کے لیے جہنم کافی ہے۔ وہ خود بھی جل رہے ہوں گے اور تمہیں بھی جلا رہے ہوں گے۔ اگر یہ معبودانِ باطلہ جن کو تم پوجتے رہے ہو واقعی سچے معبود ہوتے تو: لَوْ كَانَ هٰۤؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ؕ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۹۹﴾ آج دوزخ میں کیوں جاتے، سزا پا کر آج تمہارے ساتھ آگ میں کیوں جلتے؟ اور اب تو یہ ہمیشہ اس میں جلتے رہیں گے نہ ان کا جلنا ختم ہوگا نہ تڑپنا۔ ہم انہیں ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں جلاتے ہی رہیں گے۔ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ وہاں ان کا شور ہوگا اور اس میں انہیں کچھ سنائی بھی نہ دے گا دوزخ میں چلائیں گے، چیخیں گے۔ اتنا شور ہوگا کہ کوئی سننے والا نہیں ہوگا۔

مشرکین کا اعتراض:

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیات سنائیں اور مشرکین کے کانوں تک پہنچیں تو یہود کے علماء کے پاس پہنچے۔ وہ لوگ مشرکین کو عجیب اعتراضات پر مبنی سوال سکھا کر مکہ واپس بھیجتے۔ مشرکین مکہ نے مدینہ کے یہود کو بتایا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قرآن کی ایسی آیتیں سنائی ہیں جن کے مطابق لات ومنات اور دیگر معبود خود بھی جہنم میں جلیں گے اور منکرین کو جلانے کا ایندھن بھی بن جائیں گے۔ اب ہم کیا جواب دیں؟ علمائے یہود نے کہا تم کہو کہ لوگ تو فرشتوں کو بھی پوجتے ہیں، نبیوں کو بھی پوجتے ہیں، عیسائی عیسیٰ (علیہ السلام) کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں، یہودی عزیز (علیہ السلام) کو اللہ کا بیٹا مانتے ہیں، ان کی پوجا کرتے ہیں تو کیا یہ سب بھی ہمارے ساتھ جہنم جائیں گے؟ مشرکین مکہ اس اعتراض کو پا کر بہت خوش ہوئے اور واپس آ کر بارگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ اعتراض کیا تو جواب اللہ کریم نے دیا۔ فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ جن لوگوں کے نصیب میں ہماری طرف سے بھلائی مقرر ہو چکی ہے۔ جو لوگ ایمان لے آئے، جن لوگوں نے قربِ الٰہی حاصل کیا وہ دوزخ سے بہت دور رہیں گے۔ فرشتے، انبیاؑ، نیک لوگ سب جہنم سے اتنے دور ہوں گے کہ: لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ اس کی ہلکی سی آہٹ بھی نہیں سنیں گے۔ جہنم کی شدید چنگھاڑ ہوگی، مشرکین خوف

سے لرز رہے ہوں گے لیکن اللہ کے مقبول بندوں کو اس کی ہلکی سی آہٹ بھی سنائی نہیں دے گی اور وہ اللہ کی نعمتوں میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ تم دوزخ کی چنگھاڑ کی بات کرتے ہو، قیامت کا زلزلہ بھی گزر جائے گا لیکن میرے مقرب بندوں کو کچھ پتا نہیں چلے گا۔ دنیا تہہ و بالا ہو جائے گی، آسمان ٹوٹ کر گر جائیں گے، سورج بے نور ہو کر ڈھل جائے گا، سمندر بخارات بن کر اڑ جائیں گے، پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائیں گے۔ قیامت کا اتنا بڑا حادثہ انہیں متاثر نہیں کر سکے گا وہ میری رحمت کے سائے میں محفوظ ہوں گے۔ انہیں کوئی خبر نہ ہو گی کہ کیا ہو چکا۔ ان کے استقبال کے لیے اللہ کے مقرب فرشتے آئیں گے کہ جناب! دنیا ختم ہو چکی ہے۔ آیئے ہم آپ کو آپ کا ٹھکانہ دکھائیں۔ آج وہ دن آ گیا ہے جس کا وعدہ آپ سے اللہ کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کیا تھا، اللہ کی کتاب میں اللہ نے کیا تھا۔ آج نیک کام کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے، نیکی کے انجام کا وعدہ بتانے والے مقربینِ بارگاہ کے لیے فرشتے آئیں گے۔ گے جو انہیں بارگاہِ الوہیت میں لے جائیں گے۔ انہیں بتائیں گے کہ یہ ہے وہ دن جس کا آپ کے ساتھ وعدہ کیا جاتا تھا۔

يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ؕ كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ؕ وَعْدًا عَلَيْنَا ؕ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ وہ دن تو ہیبت ناک ہو گا کہ آسمانوں تک کو پرانے کاغذوں کی طرح لپیٹ کر دستِ قدرت میں لیا گیا ہو گا، زمینیں، پہاڑ، دریا، سیارے، ستارے تو نیچے رہ گئے آسمانوں کو لپیٹ کر دست قدرت میں لے لیا جائے گا گویا ہر چیز تہس نہس ہو جائے گی لیکن اللہ کے مقرب بندوں کو کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ ہم نے مخلوق کو جس طرح پہلے پیدا کیا تھا ویسے ہی دوبارہ پیدا کر لیں گے۔ یہ ہمارا وعدہ ہے اور ہم ایسا ضرور کریں گے۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ وہ مر کر غائب ہو جائے گا یا بھاگ جائے گا۔ اللہ دوبارہ زندہ کریں گے اور لوگ زندہ ہو کر دو میں سے ایک سمت کو ضرور جائیں گے۔ جہنم کے عذابوں میں یا جنت کی نعمتوں میں۔ آج کا دن خوش نصیبوں کے لیے انعام ملنے کا دن ہے اُن سے فرشتے کہیں گے کہ آپ نے اللہ کی اطاعت میں محنت کی آج بارآوری کا دن ہے اور یہ بات آج ہی نہیں بتائی جا رہی۔ صرف قرآن حکیم نے ہی نہیں اس کے متعلق بتایا۔ انجیل و تورات نے ہی نہیں بتایا۔ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ یہ بات اس سے پہلے ہم نے جو کتاب زبور بھیجی تھی اس میں بھی لکھ دی گئی۔ انبیاؑ و رسل علیہم السلام مسلسل بتاتے چلے گئے۔ تم حیرت زدہ کیوں ہوتے ہو؟ کیا یہ صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے کہ دنیا فانی ہے، فنا ہو جائے گی۔ اللہ کی اطاعت کرو، اللہ کی عظمت پر ایمان لاؤ، اللہ کے احکام مانو، آخرت میں کامیابی پاؤ گے، درجات پاؤ گے۔ یہ نئی بات نہیں ہے۔ جب سے آسمانی کتابیں نازل ہوئیں تب سے یہ حقائق بیان ہوتے آ رہے ہیں۔ زبور میں بھی ہم نے وعظ و نصیحت اور تلقین کے بعد یہ

بات بتا دی تھی کہ میرے نیک بندے ہی ملک کے وارث ہوں گے، ہماری نعمتوں کے وارث ہوں گے۔ انہیں انعاماتِ الٰہی ایسے ملیں گے جس طرح کوئی چیز وراثت میں مل جاتی ہے۔ جو چیزیں کما کر لی جاتی ہیں ان پر محنت لگتی ہے جو وراثت میں ملتی ہے وہ خود بخود مل جاتی ہے۔ فرمایا: یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ﴿۱۰۵﴾ میرے نیک بندے ہی جنت کے وارث ہوں گے یعنی انہیں جنت اس طرح ملے گی جس طرح وراثت اچانک مل جاتی ہے۔ کسی کا باپ کھرب پتی ہوتو اس کا دم نکلتے ہی بیٹا کھرب پتی ہو جاتا ہے۔

ایک بلیغ بات:

فرمایا: اِنَّ فِیْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِیْنَ﴿۱۰۶﴾ اس سارے تذکرے میں عبادت کرنے والوں کے لیے ایک خوبصورت پیغام ہے۔ بہت بلیغ بات ہے کہ بندے کی ذاتی حیثیت کچھ بھی نہیں۔ اللہ کریم کی اتنی وسیع کائنات ہے اور بے شمار مخلوق ہے اس میں ایک فرد کی کیا حیثیت؟ اگر ہم اپنی حیثیت متعین کرنا چاہیں تو اعشاریہ لگا کر صفر لکھنا شروع کر دیں۔ زندگی ختم ہو جائے گی ایک لکھنے کی نوبت نہیں آئے گی۔ بندہ زیرو ہی رہتا ہے۔ اللہ کی کائنات میں ہر ذرہ ربّ کے آگے جواب دہ ہے۔ بندہ بھی چند ذرات کا مجموعہ ہے، کوئی حیثیت نہیں لیکن اتنا بے حیثیت ہونے کے باوجود جب اللہ اس سے مخاطب ہو، کلام فرمائے تو اس کا ایک مقام بن جاتا ہے۔ دنیا میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک عام شہری کو جب ملک کا سربراہ بلائے، اس سے بات کرے تو یکدم اس کا ایک مقام بن جاتا ہے۔ یہ فلسفہ اگر سمجھ آ جائے تو پتا چلتا ہے کہ ایمان، تعلق باللہ، کلامِ الٰہی کتنی بڑی نعمتیں ہیں۔

عہدِ حاضر کے مسلمانوں کا روّیہ:

آج مسلمان اگر قرآن پڑھیں تو ثواب کے لیے پڑھتے ہیں۔ بلاشک قرآن کو دیکھنا ثواب ہے، تلاوت ثواب ہے، تلاوت سننا بھی ثواب ہے لیکن مقصود صرف یہ نہیں ہے۔ بندہ جب قرآن پڑھتا ہے تو درحقیقت وہ اللہ کریم سے بات کر رہا ہوتا ہے۔ اللہ اس پڑھنے والے سے مخاطب ہوتے ہیں۔ جب اللہ کریم کسی کو مخاطب کریں تو پھر ذرہٗ بے مقدار اور ناچیز ہونے کے باوجود بندے کی عظمت کتنی بڑھ جاتی ہے۔ ذرا سوچیے! قرآن کے الفاظ اللہ کا ذاتی کلام ہے جو بذریعہ وحی آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلّم پر نازل ہوا۔ یہی وہ کلام ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی زبانِ مبارک پر جاری ہوا۔ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی نگرانی میں قلمبند کروایا۔ یہ بعینہٖ وہی کلام ہے جو اللہ کریم کا ذاتی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے مخلوق کو پہنچایا۔ آج ہمارے پاس مِنْ وَ عَنْ وہی کلام موجود ہے۔ یہی فرمایا جا رہا ہے کہ کیا شان ہے اس بندے کی جس سے اللہ بات کرتا ہے۔ (سبحان اللہ!)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے صلوٰۃ ادا کرنے والے کے بارے فرمایا: اَحَدُ کُمۡ اِذَا قَامَ فِي الصَّلٰوۃ فَاِنَّہٗ یُنَاجِی رَبَّہٗ (بخاری) بے شک تم میں سے کوئی اپنی صلوٰۃ میں کھڑا ہوتا ہے تو وہ اپنے رب سے سرگوشی کر رہا ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ اس کے سامنے سے مت گزرو کہ وہ اپنے پروردگار سے سرگوشیوں میں بات کر رہا ہے۔ احساس کرنے کی بات ہے کہ جس بندے کی دنیا میں کوئی بات نہیں سنتا اُسے رب العالمین اجازت دیتا ہے، اپنا قرب دیتا ہے کہ وہ اپنے ربّ سے سرگوشیاں کر لیتا ہے۔ جس بندے کو یہ قرب نصیب ہو وہ کتنا بڑا آدمی ہے۔ بات محسوس کرنے کی ہے لیکن ہم نے کبھی خیال نہیں کیا۔ اتنی عظمت بندۂ ناچیز کو کہاں سے ملی؟ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے بندوں کو اللہ سے ہم سخن کر دیا۔

قرآن کو سمجھ کر پڑھنا چاہیے، یہ سمجھ کر پڑھنا چاہیے کہ یہ الفاظ اللہ کے ہیں، یہ الفاظ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے جاری ہوئے۔ لیکن یہ باتیں ان کو سمجھ آتی ہیں جو عبادت میں کوشش کرتے ہیں، مجاہدہ کرتے ہیں، ذکر اذکار سے قلب و باطن کو صاف کرتے ہیں، جن کے سینے منور ہوتے ہیں جو حقیقی عبادت کرنے والے لوگ ہیں۔ یہ باتیں دوسروں کو سمجھ نہیں آتیں۔

اگر کسی کے کانوں میں شنوائی نہ ہو تو کیا اسے خوبصورت آواز سنائی دے گی، کسی کی آنکھوں میں بینائی نہ ہو تو کیا اُسے کوئی خوبصورت چیز دکھائی دے گی؟ اسی طرح کسی کے سینے میں روشن دل نہ ہو تو قرآن کی عظمت اسے کہاں سمجھ آئے گی، وہ قرآن کی لذت کیسے چکھے گا؟ یہ تو انہیں نصیب ہوتی ہے جو عبادت کو زندگی کا مقصد بنا لیتے ہیں۔ جو عبادت کے لیے زندہ رہتے ہیں، عبادت کرتے ہوئے مرتے ہیں۔ جن کے سینے روشن اور دل زندہ ہوتے ہیں۔ لذت انہیں ہی آتی ہے باقی یہ کہہ کر گزر جاتے ہیں کہ ہاں! یہ اللہ کا کلام ہے۔

اللہ کا کرم بے کراں ہے:

سبحان اللہ! کلامِ الٰہی اتنا وسیع تیس پاروں پر محیط اتنی بڑی کتاب جس کا ایک ایک لفظ اللہ کریم کا ذاتی کلام ہے۔ وہ کسی نے بہت خوب کہا تھا!

بیک لفظ تواں گفتن تمنائے جہانِ را
من از ذوقِ حضوری طول دادن داستانِ را

دنیا بھر کی بات ایک لفظ میں ہو سکتی ہے۔ ساری بات سُن کر آپ ایک لفظ ہاں کہہ دیں یا ایک لفظ نہ کہہ دیں سارے کا جواب ہو جاتا ہے۔

دنیا بھر کی بات ایک لفظ میں ہوسکتی ہے لیکن میں نے حضوری کی لذت پانے کے لیے بات کو طول دیا اور بات لمبی کردی۔

اللہ کریم کی اس کتاب کی ہر آیت اتنی جامع اتنی کامل اتنی مکمل ہے کہ وہ ایک آیت پوری، انسانی زندگی کے لیے کافی ہے۔ یہ اس کا کرم ہے، احسان ہے کہ اس نے اتنی بڑی اور وسیع کتاب نازل فرما کر اتنا لمبا کلام فرمایا۔ کاش! انسان اس کرم کو سمجھ سکتا! جب آنکھ بند ہوگی تو آنکھ کھلے گی اور پتا چلے گا کہ کلامِ باری کی عظمت کیا ہے اور اس کا کیا احترام کرنا چاہیے تھا اور ہم نے اسے کیسے لیا۔ اب یہ آیہء مبارکہ بڑی معرکۃ الآرا آیت ہے اور صرف ایک یہ آیت نازل ہوجاتی تو سارا معاملہ اُس ایک آیت میں طے ہوجاتا یہ تو اُس کا کرم ہے کہ اُس نے تیس سپارے نازل فرمادیے۔ فرمایا: وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴿۱۰۷﴾ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو عالمین کے لیے رحمت بنا کر بھیجا اس ایک بات میں ساری بات سما جاتی ہے۔ عالمین میں ایک اللہ کی ذات کے علاوہ جو کچھ ہے سب آ جاتا ہے۔ صرف انسان نہیں، اقوامِ عالم نہیں، دنیا نہیں، جاندار چرند پرند حیوان ہی نہیں، پتھر دریا پہاڑ ہی نہیں، زمین و آسمان اس میں ستارے، سیارے، اللہ کی ذات کے علاوہ جنت دوزخ، عرش کرسی سب کچھ عالمین ہے۔ ایک اللہ کی ذات کے علاوہ جتنی اللہ کی مخلوق ہے سب عالمین ہے۔ سب کے لیے رحمت ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم تو اس ایک بات پر بات ختم ہوجاتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم جس بات پر راضی ہیں وہ کرو، جس بات کو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم پسند نہیں کرتے وہ چھوڑ دو۔

رحمتِ الٰہی صرف رحمۃ العالمین سے وابستہ ہے:

ہر شئے رحمتِ الٰہی کی محتاج ہے اور رحمتِ مجسم ہیں آقائے نامدار حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم۔
آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت کیے جاؤ اور رحمتِ الٰہی میں سفر کیے جاؤ ہر کام میں رحمت، ہر کام میں برکت ہوگی یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بے شمار مخلوق ہے جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کو تسلیم ہی نہیں کیا یا ایمان کی دولت سے محروم رہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کو مانا ہی نہیں۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو گستاخیاں بھی کرتے ہیں۔
مسلمانوں میں بھی بعض ایسے ہیں جو زبانی تو مانتے ہیں لیکن عملاً ثابت نہیں کرتے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کو مانتے ہیں کیونکہ ماننے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اطاعت کی جائے۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رسالت پر ایمان یہ ہے کہ اپنی پوری دیانت امانت اور خلوص سے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی غلامی کی جائے۔ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے حکم کو ماننے کی پوری کوشش کرے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو مانتا ہے۔ ورنہ زبانی کلمہ پڑھ لینا اور کام اپنی مرضی کے کرنا حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے حکم کے خلاف کرنا۔ اطاعت نہ کرنا

درحقیقت آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو نہ ماننا ہے۔ اللہ معاف کر دے تو وہ قادر ہے لیکن یہ ہے تو نہ ماننے والی بات۔ نہ ماننے والوں کو، کفار و مشرکین کو، کس طرح رحمتِ الٰہی پہنچ رہی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے وسیلے سے پہنچ رہی ہے۔ کائنات کے ہر ذرّے کا وجود خود مظہر رحمتِ الٰہی ہے۔ ساری تخلیق اس کی ربوبیّت کا مظہر ہے جو اس کی رحمت ہی کی ایک شاخ ہے۔ پھر اس نے رحمت کو دو طریقوں پر تقسیم فرما دیا ہے۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ قرآنِ کریم کی آیت ہے اس میں رحمت کے دو شعبے ارشاد فرمائے، الرَّحۡمٰنِ اور الرَّحِیۡمِ الرَّحۡمٰنِ کا وزن فعلان کے وزن پر ہے۔ اس وزن پر اسمائے صفات کی صفت عارضی اور وقتی ہوتی ہے۔ جیسے کہتے ہیں العطشان یعنی پیاسا۔ اس وزن کے جو الفاظ ہوتے ہیں ان میں کیفیت عارضی ہوتی ہے جیسے پیاس ایک عارضی کیفیت ہے، پانی مل جائے گا، پیاس ختم ہو جائے گی۔ اسی طرح رحمانیت باری کے مظاہر، الرَّحۡمٰنُ کے تحت ہوتے ہیں یہ دارِ دنیا کے لیے ہیں۔ یہ رحمت کی وہ قسم ہے جس سے لوگوں کو وجود ملا، حیات ملی، ایک ایک عضو اس طرح سے سنوارا گیا۔ صحت، حیات زندگی، یہ موت تک کی مہلت میں انسان کئی طرح کی نعمتوں سے فائدہ حاصل کرتا ہے، لطف اندوز ہوتا ہے۔ وہ انسان خواہ کافر ہی ہو۔ یہ الرَّحۡمٰن کی رحمانیت کے سبب سے ہے۔

الرَّحِیۡمُ کے اوزان ہی ایسے ہیں۔ جیسے اَلۡحَکِیۡمُ۔ یہ فعیل کے وزن پر ہے۔ اس وزن پر تمام اسمائے صفات کی صفت دائمی ہوتی ہے یہ دائمی صفت ہے۔ یہ نہیں کہ آج حکیم ہے تو کل نہیں ہوگا۔ جیسے اَلۡعَلِیۡمُ کہ آج عالم ہے تو کل جاہل نہیں ہو جائے گا۔ یہ دائمی صفت ہے اَلرَّحِیۡمُ دنیا میں بھی رحمت۔ آخرت میں بھی رحمت رحمانیت دنیا کے لیے ہے کہ دنیوی زندگی اور اس کی نعمتوں سے کافر و مومن دونوں مستفید ہو رہے ہیں یہ رحمانیتِ باری ہے جو دنیوی زندگی تک محدود ہے رحیمیت دنیا و آخرت دونوں جہانوں کے لیے ہے جنہیں ایمان نصیب ہوا آخرت پر بھی اور جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا اتباع کیا، اطاعت اختیار کی وہ یہاں بھی چین سے رہ رہے ہیں وہاں بھی راحت میں ہوں گے۔ زندگی میں، موت میں بھی بعد از موت بھی۔

اسی اعتبار سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم رحمت العالمین ہیں کہ جو نہیں مانتے وہ بھی رحمت سے مستفید تو ہو رہے ہیں اور وہ رحمت انہیں بطفیل رحمۃ العالمین صلی اللہ علیہ وسلّم نصیب ہو رہی ہے اور جو مانتے ہیں اور اتباع کرتے ہیں اللہ ان کا قبول فرمائے۔ انہیں تو دونوں جہانوں میں سکون ہے کہ یہاں بھی زیر سایہ شفقتِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ہیں وہاں بھی زیر سایہ شفقت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ہوں گے۔

یہ بہت جامع آیت ہے مولانا محمد شفیع مفتی اعظم پاکستان (اللہ اُن پر کروڑوں کروڑوں رحمتیں نازل کرے) نے اس آیت کے تحت معارف القرآن میں ایک پیراگراف لکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ”عالمین عالم کی جمع

ہے جس میں ساری مخلوقات جن، حیوانات، نباتات، جمادات سب ہی داخل ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ان سب چیزوں کے لیے رحمت ہونا اس طرح ہے کہ تمام کائنات کی حقیقی روح اللہ کا ذکر اور اس کی عبادت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس وقت زمین سے یہ روح نکل جائے گی اور زمین پر کوئی اللہ اللہ کہنے والا نہ رہے گا تو ان سب چیزوں کی موت یعنی قیامت آجائے گی اور جب ذکر اللہ و عبادت کا ان سب چیزوں کی روح ہونا معلوم ہوگیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ان سب چیزوں کے لیے رحمت ہونا خود بخود ظاہر ہوگیا۔ کیونکہ اس دنیا میں قیامت تک ذکر اللہ اور عبادت آپ صلی اللہ علیہ وسلّم ہی کے دم قدم اور تعلیمات سے قائم ہے"۔ (معارف القرآن جلد ششم ص 234)

حضور صلی اللہ علیہ وسلّم سے پوچھا گیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم قیامت کب ہوگی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا حتیٰ لایُقَالَ اَللہ اَللہ (شعبہ الایمان) جب کوئی اللہ اللہ کرنے والا نہ رہے گا اس وقت قیامت آجائے گی۔ گویا کائنات ختم ہوجائے گی۔ کائنات کو اللہ اللہ کا درس تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے دیا۔

سب انبیآء نے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم سے فیض حاصل کیا اور قیامت تک ہر طالب فیض لیتا رہے گا تو سارے فیض کی بنیاد قول و فعل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ہے۔ کائنات کی حیات کا مدار حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے بتائے ہوئے ذکر پر ہے۔ ساری کائنات محتاج ہے آپ کی رحمت کی اور سب پر جو رحمتِ باری نازل ہو رہی ہے اس کا وسیلہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذات ہے۔ جب کوئی اللہ اللہ کرنے والا نہیں رہے گا تو قیامت قائم ہوجائے گی، ساری کائنات تباہ ہوجائے گی۔ اس لیے ہر ذرہ اُس کا وجود، اس کا بننا اور اس کی بقا رحمتِ الٰہی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ عالی ہے۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۞ اس آیت کریمہ کی وسعت پر غور کیا جائے تو سادہ سی بات ہے کہ بدونِ اتباعِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم، کہیں کوئی جائے پناہ ہے ہی نہیں۔ جس طرح ایک صحیح الدماغ شخص خود کو صاف ستھرا رکھتا ہے۔ صاف لباس پہنتا ہے۔ بال سنوار کر رکھتا ہے لیکن جب کوئی پاگل ہوجائے اس کا دماغ پھر جائے تو وہ لباس پھاڑ دیتا ہے۔ بدن کو مٹی گارے سے بھر دیتا ہے۔ بال الجھا لیتا ہے۔ اسے کوئی فکر نہیں ہوتی کہ کیا ہو رہا ہے بالکل اسی طرح جو نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت سے باغی ہے وہ پاگل ہے۔ اپنے آپ کے ساتھ زیادتی کر رہا ہے، اپنے منہ پر کیچڑ مل رہا ہے، اپنے بالوں میں خاک ڈال رہا ہے، اپنا لباس تار تار کر رہا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ نتائج تب سمجھ آجائیں گے جب ظاہری آنکھ بند ہوگی اور حقیقی آنکھ کھل جائے گی۔ میرے بھائیو! یہ مہلت بڑی غنیمت ہے اللہ کریم کا بڑا احسان ہے۔ حق یہ ہے کہ بندہ ہر دم، ہر سانس کے ساتھ اس بات کا خیال رکھے کہ جو سوچ رہا ہوں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے حکم کے خلاف نہ ہو۔ جو دیکھ رہا ہوں حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی پسند کے خلاف نہ ہو۔ جو بول رہا ہوں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی پسند کے مطابق ہو۔ جو کر رہا ہوں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی

پسند کے تابع ہو۔ یہی زندگی ہے، یہی دانش ہے، یہی شعور ہے، یہی عقل مندی ہے۔ اس کے باہر سارا پاگل پن ہے۔ ظاہری علوم کی بین الاقوامی سطح کی بڑی بڑی ڈگریاں لوگوں کے پاس ہوں گی، کیا وہ آخرت میں فائدہ دیں گی؟ اس علم کا کیا فائدہ۔ جس علم نے دُنیوی ضروریات کو تو جانچا لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ ستودہ صفات کو نہ پہچان سکا۔ وہ علم تو جہالت ہی رہا۔ دنیا بھر کی یونیورسٹیوں کی ڈگریاں ہو جائیں اس علم کا کیا فائدہ، وقت اور محنت ضائع کرنے کے سوا کیا حاصل؟ کائنات ہمارے چلانے سے نہیں چل رہی، اس کا مالک ہے جس نے بنائی ہے۔ وہ چلا رہا ہے، جب وہ چاہے گا، فنا کر دے گا۔ سب سے اعلیٰ علم یہ ہے کہ کوئی عظمتِ رسالت علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جان جائے پھر اسے اللہ کی کتاب پڑھنے کا بھی مزا آئے گا۔ سمجھنے کی بھی توفیق ہوگی۔ توفیقِ عمل بھی ہوگی اس لیے کہ رحمتِ باری کا ہر جھونکا بطفیلِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نصیب ہوتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی زبانِ حق ترجمان ہی قولِ فیصل سناتی ہے کہ اللہ کی رضامندی کا سبب کیا ہے اور اللہ کی ناراضگی کن باتوں پر ہے۔ اس کے علاوہ کسی کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ سو فرمایا: لوگوں سے کہہ دیجیے: قُلْ اِنَّمَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ اَنَّمَآ اِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ۔۔۔فرما دیجیے کہ مجھ پر (اللہ کی طرف سے) وحی آتی ہے کہ تم سب کا معبود (حقیقی ایک ہی اللہ) معبود ہے یعنی میرا مرتبہ جو اللہ کریم نے عطا فرمایا ہے، میری شان جو اللہ نے مجھے دی ہے اسے دیکھو اور میری بات سنو۔ میں تمہیں اپنی ذاتی بات نہیں کہتا کہ میری یہ مرضی ہے، یہ کرو۔ نہیں مجھ پر میرا پروردگار وحی فرماتا ہے، مجھ سے میرا ربّ بات کرتا ہے، ارشاد فرماتا ہے۔ کہ لوگو! خوب جان لو، تحقیق کرلو، ریسرچ کرلو، مطالعہ کرلو دنیا بھر کی لائبریریاں چھان ڈالو، کوئی دلیل تمہیں نہیں ملے گی کہ اللہ کے علاوہ بھی کوئی ایسی ہستی ہے جس کی عبادت کی جائے۔ ایسی صرف ایک ہی ہستی اللہ ہے جو واحد و لاشریک ہے۔ اللہ کے علاوہ کوئی ستاروں کو پوجے، کوئی دیوی دیوتاؤں کو پوجے، کوئی خیالی صورتوں کو پوجے، کوئی مجسموں کو پوجے وہ مخلوق کی ہی پرستش کرے گا۔ مخلوق ہونا احتیاج کی دلیل ہے تو جب مخلوق ہونا محتاج ہونے کی دلیل ہے تو جو خود محتاج ہے وہ اس لائق کہاں کہ اس کی پوجا کیجائے، اس کی عبادت کی جائے۔ فرمایا مجھے میرا پروردگار یہ بات وحی فرماتا ہے کہ یہ پکی بات ہے، خوب غور سے سن لو! اس میں کوئی رائی برابر شبے کی بات نہیں ہے تمہارا معبود وہی وحدہٗ لاشریک ہے۔ عبادت کے لائق وہی ہے۔

عبادت کیا ہے؟

عبادت کہتے ہیں غیر مشروط اطاعت کو۔ اپنے آپ کو کسی کے حوالے کر دینا کہ جو کہو گے کروں گا جیسے کہتے ہو ویسے کرتا ہوں۔ عبادت پوری زندگی پر محیط ہے۔ عبادت کا پورا نظام اللہ کریم نے اور آپ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے پہنچا دیا ہے۔ اس کے تین شعبے ہیں۔ اوّل عقیدہ، جو بنیاد ہے۔ زندگی کی بنیاد ہی عقیدے پر ہے۔ قرآنِ کریم کے

مطابق جس کا عقیدہ درست نہیں ہے وہ زندہ نہیں ہے۔ زندگی ایمان سے ہے۔ جب ایمان نہیں تو روح میں حیات نہیں۔ بدن میں روح ہے لیکن روح میں حیات نہیں ہے۔ جس میں حیات نہیں رہتی وہ بندہ اس قابل نہیں رہتا کہ محسوس کرے۔ گرمی ہے سردی ہے، دھوپ ہے چھاؤں ہے، پیاس ہے بھوک ہے، کچھ نہیں خاموش ہو جاتا ہے، اسی طرح جب نورِ ایمان نہ ہو تو بندے کے اندر روح بدن کو زندگی دینے کے لیے تو ہوتی ہے لیکن روح کا اپنا مطالبہ نہیں ہوتا۔ وہ تو مردہ ہوتی ہے۔ جیسے مردے کا کوئی مطالبہ نہیں ہوتا اس طرح اس روح کا کوئی مطالبہ نہیں ہوتا۔ نورِ ایمان آتا ہے تو روح میں حیات آتی ہے۔ روح زندہ ہوتی ہے تو اُسے بھوک لگتی ہے، پیاس لگتی ہے، نیند آتی ہے۔ اپنی ضروریات پورا کرنا چاہتی ہے۔ اس کی غذا کیا ہے؟ اللہ کا ذکر۔ اس کی دوا کیا ہے؟ اللہ کا ذکر۔ اس کا آرام کیا ہے؟ اللہ کا ذکر۔ اس کی صحت اور بقا کا راز کیا ہے؟ اللہ کی یاد، اللہ کی اطاعت، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کا اتباع۔ پھر وہ ان چیزوں کا تقاضا کرتی ہے۔ اگر کسی بندے کے اندر اتباعِ رسالت کا اور اطاعتِ الٰہی کا تقاضا نہیں ہے تو اسے یہ فکر کرنی چاہیے کہ اس کی روح زندہ بھی ہے کہ نہیں۔ اگر زندہ ہے تو کہیں بے ہوش تو نہیں؟ کیا معاملہ ہے کہ یہ کوئی مطالبہ نہیں کرتی نہ کھانے کا نہ پینے کا نہ آرام کا۔

عبادات کے دو حصے ہیں۔ ایک فرائض یعنی صلوٰۃ، روزہ، حج زکوٰۃ، دوسرا پوری زندگی کے اعمال۔ مزدوری کرنا عبادت ہے، روزی کمانا عبادت ہے، بال بچے پالنا عبادت ہے، والدین کی خدمت عبادت ہے، زندگی کا ہر کام عبادت بن جاتا ہے جب وہ احکام الٰہی کی حدود میں آجائے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت میں آئے، اور ایسا کون ہے جس کے لیے ساری زندگی وقف کر دی جائے؟ اس سے پوچھ کے سوئے، اس سے پوچھ کر جاگے، اس سے پوچھ کر کمائے، اس سے پوچھ کر خرچ کرے۔ اس سے پوچھ کر دوستی اس سے پوچھ کر دشمنی کرے۔

تو ایسا کون ہے؟ فرمایا وہ وحدہٗ لاشریک ہے کوئی دوسرا ایسا نہیں۔ اگر ان کاموں میں کسی دوسرے کی خوشنودی چاہے گا تو یہ نافرمانی ہی نہیں شرک ہو جائے گا۔ فرمایا: قُلْ اِنَّمَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۸﴾ لوگو! اس اٹل حقیقت کو کب مانو گے، ''کیا تم مان لو گے؟'' کتنی عجیب بات ہے! قرآنِ کریم کا انداز دیکھیں فرماتے ہیں عظمتِ الٰہی تو ہویدا ہے، سورج سے زیادہ روشن ہے لیکن کیا تم بھی مانو گے؟ اس کی عظمت تمہارے ماننے کی محتاج نہیں سورج روشن ہے کوئی باہر نکل کر کہہ دے کہ سورج تو سیاہ ہو گیا ہے تو کیا اس کے کہنے سے سیاہ ہو جائے گا؟ اس کی روشنی تو ظاہر ہے۔ اللہ تو خالقِ کائنات ہے اس کی عظمت کو مخلوق کے ماننے نہ ماننے سے کیا فرق پڑے گا۔ جس نے ماننا ہے اُس نے اپنی روح کو حیات بخشنی ہے، اپنے آپ کو زندہ کرنا ہے۔ دونوں جہان میں سرفراز ہونا ہے تو فرمایا، فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۸﴾ کیا تم مان جاؤ گے، کیا تم اطاعت شعار بن جاؤ گے؟ اگر یہ بات بھی نہ مانیں تو فرمایا: فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ ۔۔۔ اگر کوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی

بات نہیں مانتا تو اس سے فرما دیجیے کہ میں نے تم سب کو برابر طور پر آگاہ کر دیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا پیغام پہنچانے والے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے قاصد ہیں:

حضور صلی اللہ علیہ وسلّم پوری کائنات کے لیے اللہ کے نبیؐ اور رسولؐ مبعوث ہوئے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلّم دنیوی حیاتِ مبارکہ میں جزیرہ نمائے عرب سے باہر تشریف نہیں لے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی رسالت تمام انسانوں اور تمام زمانوں کے لیے ہے یورپ والوں کے لیے بھی، مغرب بعید کے لیے بھی چین اور جاپان، مشرق بعید والوں کے لیے بھی۔ ساری کائنات ساری زمین کے انسانوں کے لیے بھی۔ قرآن حکیم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی زبان سے کہلوایا گیا: قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ۔۔۔(الاعراف:158) اے اولادِ آدم میں تم سب کے لیے اللہ کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلّم) ہوں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلّم دنیوی حیاتِ مبارکہ میں جزیرہ نمائے عرب سے باہر تشریف ہی نہیں لے گئے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے جزیرہ نمائے عرب میں دین کا وہ پودا لگایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ہجرتِ مبارکہ کے بعد مدینہ منورہ کے دس سال اور بعثت عالی کے بعد کے مکہ مکرمہ میں تیرہ سال۔ تیئس سال حیاتِ نبوی دُنیوی میں دین مکمل طور پر نافذ فرما دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے وصال کے بعد تیئس برسوں کے اندر اندر کائنات کا شجر و حجر بھی جان چکا تھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا پیغام کیا ہے۔ چین سے لے کر افریقہ تک اور فار ایسٹ سے لے کر فار ویسٹ تک اسلام کا پیغام پہنچ چکا تھا اور معلوم دنیا کا کم و بیش نصف سے زیادہ حصہ ایک سلطنت بن چکی تھی جس پر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کا راج تھا اور خلفائے راشدین کو صحابہ کرامؓ، کو تابعین، تبع تابعین کو اللہ کریم نے نور کی وہ قندیلیں بنا دیا جنہوں نے علوم اور حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات کو دنیا بھر میں بادشاہ کے محل سے لے کر فقیر کی جھونپڑی تک ہر جگہ پہنچا دیا۔ کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو آج تک اس پیغام کو پوری دیانت امانت سے پہنچا رہے ہیں۔ یہ سب اسی آیت کے تحت آتا ہے۔ فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ ۔۔۔ میں نے تم سب کو برابر برابر پیغام پہنچا دیا۔ گویا آج بھی جو دین کا پیغام خلوص اور دیانت اور اس عقیدے سے پہنچا رہا ہے کہ یہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کا اتباع کر رہا ہوں وہ اسی بارگاہ کا قاصد ہے اور کتنا عظیم انسان ہے جسے یہ شرف حاصل ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے بتائے ہوئے علوم کو مخلوق تک پہنچا رہا ہے۔ یہ لوگ تا قیامِ قیامت رہیں گے یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے اس کائنات کی بقا کا سبب قرار دیا ہے جب یہ لوگ اُٹھ جائیں گے جیسا کہ ارشاد نبوی ہے: حتی لا یقال اللہ اللہ کوئی دین پر عمل کرنے والا، کوئی دین کا نام لینے والا، کوئی اللہ کا نام لینے والا، کوئی اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے پیغام کو پہنچانے والا نہیں رہے گا تو دنیا تباہ ہو جائے گی، دنیا سے روح نکل جائے گی۔ یہ روح کائنات ہے۔ اب یہ منصبِ جلیلہ تھا رسالت کا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس کا حق ادا کر

دیا۔اور بڑے خوش نصیب وہ لوگ ہیں جو قیامت تک آتے رہیں گے جو زندگی میں اپنے عقیدے سے بھی۔اپنے اطوار سے بھی اور اپنے عمل سے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچا رہے ہیں اور پہنچاتے رہیں گے۔

یہ فریضہء رسالت تھا اس کا حق ادا ہو گیا۔اب اس سے آگے اے لوگو! تمہارے اور تمہارے پروردگار کی بات ہے:وَاِنۡ اَدۡرِیۡۤ اَقَرِیۡبٌ اَمۡ بَعِیۡدٌ مَّا تُوۡعَدُوۡنَ ﴿۱۰۹﴾ میرا اس سے کوئی علاقہ نہیں کہ تمہارے پاس زندگی کی کتنی مہلت ہے۔یا قیامت کب قائم ہوگی۔کائنات کے پاس کتنی فرصت ہے یہ میرا موضوع نہیں ہے۔یہ تمہارا اور تمہارے مالک کا موضوع ہے تم جانو اور تمہارا پروردگار جانے۔جس نے تمہاری موت کا وقت معین کیا ہے،جس نے قیامت کا وقت مقرر کیا ہے وہ اللہ جانے۔یہ معاملہ اللہ اور اس کی مخلوق کے درمیان ہے۔ہاں میں نے تمہیں یہ بتا دیا کہ قیامت ضرور قائم ہوگی ضرور۔میرا منصب اُس کے متعلقات اور اُس کی تیاری سے آگاہ کرنا ہے۔کب قائم ہوگی؟ یہ تم جانو اور تمہارا پروردگار جانے اور میں تمہیں یہ بات بھی بتا دوں:اِنَّهٗ يَعۡلَمُ الۡجَهۡرَ مِنَ الۡقَوۡلِ وَيَعۡلَمُ مَا تَكۡتُمُوۡنَ ﴿۱۱۰﴾ اسے ہر بات کی خبر ہے۔جو تم نے ابھی سوچا نہیں کبھی سوچو گے،خیال آئے گا وہ بھی اس کے علم میں ہے۔جو تم ظاہر کرتے ہو وہ بھی اس کے علم میں ہے۔جو تم چھپاتے ہو وہ بھی اس کے علم میں ہے۔کوئی چیز اس کی ذات سے پوشیدہ نہیں ہے۔وَاِنۡ اَدۡرِیۡ لَعَلَّهٗ فِتۡنَةٌ لَّـكُمۡ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيۡنٍ ﴿۱۱۱﴾ اور مجھے یہ بھی خبر نہیں ہے کہ اس نے تمہیں جو زندگی دے رکھی ہے رزق دے رہا ہے۔مہلت دے رکھی ہے۔کیا اس نے تمہیں آزمائش میں ڈال رکھا ہے اگر وہ نعمتیں عام کیے جا رہا ہے اور اس نے ایک خاص وقت تک کے لیے اپنی نعمتوں کے دروازے تم پر کھول رکھے ہیں تو لگتا ہے یہ یقیناً آزمائش ہے اس کی عظمت کا اقرار کر لو اسے منعمِ حقیقی مان لو اس کی اطاعت کر لو ورنہ مارے جاؤ گے۔ قٰلَ رَبِّ احۡكُمۡ بِالۡحَـقِّ۔۔۔پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم بحکم الٰہی متوجہ الی اللہ ہوئے اور عرض کی،بارِ الٰہی آپ حق کے ساتھ فیصلہ فرما دیجیے۔ہر چیز جب آپ کے علم میں ہے ہر ایک دل کا حال آپ پر آشکارا ہے۔ہر سوچ آپ کے علم میں ہے تو جو حق کا فیصلہ ہے وہ فرما دیجیے اور فرمایا وَرَبُّنَا الرَّحۡمٰنُ الۡمُسۡتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوۡنَ ﴿۱۱۲﴾ ہمارا پروردگار بے حساب رحم فرمانے والا مہربان ہے۔جو کچھ تم کرتے ہو اس پر میری مدد کرنے والا بھی وہی ہے۔یہ جو تم حق کا راستہ روکنے کی تدبیریں کرتے ہو،میری بات نہ ماننے کی تدبیریں کرتے ہو تم یہ سب کچھ نہیں کر سکو گے اس لیے کہ میری مدد کرنے والا وہ ربّ کریم ہے میرا پیغام رہے گا جب تک دنیا قائم ہے اللہ کا کلام پہنچتا رہے گا۔تم ساری تدبیریں کر لو،تم سارا زور لگا لو،اللہ کا پیغام پہنچتا رہے گا،پھیلتا رہے گا۔یہ اس کی اپنی شان ہے۔

سورۃ الحج رکوع 1 آیات 1 تا 10

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ﴿١﴾ يَوْمَ
تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا
وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ﴿٢﴾
وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ۙ ﴿٣﴾
كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَيَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ﴿٤﴾ يٰٓاَيُّهَا
النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ
نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۭ
وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَاۗءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ
لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ
لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ۭ وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا
عَلَيْهَا الْمَاۗءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ﴿٥﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ
هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۙ ﴿٦﴾ وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا
رَيْبَ فِيْهَا ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴿٧﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي
اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۙ ﴿٨﴾ ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ ۭ لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿٩﴾ ذٰلِكَ بِمَا

قَدَّمَتۡ يَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِيۡدِ ۝١٠

اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو بے شک قیامت کا زلزلہ بڑی بھاری چیز ہوگی ﴿۱﴾ (اے مخاطب!) جس دن تُو اُسے دیکھے گا کہ ہر دودھ پلانے والی (عورت) اپنے دودھ پیتے (بچے) کو بھول جائے گی اور ہر حمل والی اپنے حمل کو (دن پورے ہونے سے پہلے) ڈال دے گی اور تجھ کو لوگ نشہ کی سی حالت میں نظر آئیں گے اور وہ نشہ میں نہیں ہوں گے اور واقعہ میں اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے ﴿۲﴾ اور بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے بارے (اس کی ذات وصفات میں) بغیر جانے بوجھے جھگڑا کرتے ہیں اور ہر سرکش شیطان کے پیچھے ہو لیتے ہیں ﴿۳﴾ جس کے بارے میں لکھا جا چکا ہے یہ کہ جو اُسے دوست رکھے گا تو وہ اُسے گمراہ کر دے گا اور اس کو دوزخ کے عذاب کا راستہ دکھائے گا ﴿۴﴾ اے لوگو! اگر تم (قیامت کے دن) دوبارہ زندہ ہونے کے بارے شک میں ہو تو یقیناً ہم نے تم کو (پہلی بار بھی تو) پیدا فرمایا تھا (پہلے) مٹی سے پھر نطفہ سے پھر خون کے لوتھڑے سے پھر بوٹی سے جس کی بناوٹ کامل بھی ہوتی ہے اور ناقص بھی تا کہ ہم تم پر (اپنی خالقیت) ظاہر کر دیں اور ہم جس کو چاہتے ہیں ایک مدت معین تک پیٹ میں ٹھہرائے رکھتے ہیں پھر ہم تم کو بچہ بنا کر باہر لاتے ہیں پھر تم اپنی جوانی کو پہنچتے ہو اور بعض تم میں وہ ہیں جو (جوانی کو پہنچنے سے پہلے) مر جاتے ہیں اور بعض تم میں وہ ہیں جو نکمی عمر (بڑھاپے کی زیادہ عمر) کی طرف لوٹائے جاتے ہیں کہ ایک چیز سے باخبر ہو کر پھر بے خبر ہو جاتے ہیں اور (اے مخاطب!) تُو زمین کو دیکھتا ہے کہ خشک پڑی ہے پھر جب ہم اُس پر پانی برساتے ہیں تو ابھرتی ہے اور شاداب ہوتی ہے اور ہر قسم کی خوش نما نباتات اگاتی ہے ﴿۵﴾ یہ سب اس لیے کہ اللہ ہی (قادرِ مطلق) برحق ہے اور یہ کہ وہی بے جان کو زندہ کر دیتا ہے اور یہ کہ وہی ہر چیز پر قادر ہے ﴿۶﴾ اور یہ کہ قیامت آنے والی ہے اس میں ذرا شبہ نہیں اور یہ کہ اللہ سب

لوگوں کو جو قبروں میں ہیں زندہ کر اٹھائیں گے ﴿۷﴾ اور بعض لوگ ایسے ہیں کہ اللہ کے بارے میں بغیر واقفیت (علم ضروری) اور بغیر دلیل (علمِ عقلی) کے اور بغیر کسی روشن کتاب (دلیلِ نقلی) کے جھگڑا کرتے ہیں ﴿۸﴾ (تکبر سے) گردن موڑ لیتے ہیں تاکہ وہ (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے بے راہ کریں ایسے شخص کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور قیامت کے دن ہم اس کو جلتی آگ کا عذاب چکھائیں گے ﴿۹﴾ (اس سے کہا جائے گا) یہ تیرے ہاتھوں کیے گئے کاموں کا بدلہ ہے اور یہ کہ اللہ اپنے بندوں پر زیادتی کرنے والے نہیں ﴿۱۰﴾

تفسیر و معارف

سورۂ حج شروع ہوتی ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کے بارے اکثر مفسرین کی رائے ہے کہ اس کی کچھ آیات مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں کچھ مدینہ منورہ میں۔ کچھ آیات سفر میں نازل ہوئیں کچھ حضر میں۔ کچھ حالتِ جنگ میں اور کچھ امن کے زمانے میں۔ کچھ آیات ناسخ ہیں اور کچھ منسوخ بھی ہیں۔ کچھ آیات متشابہ ہیں اور کچھ محکم۔ اس طرح یہ سورۂ مبارکہ عجائباتِ قرآن میں سے ہے۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کا معمولِ مبارک تھا کہ جو آیت نازل ہوتی اس کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلّم خود فیصلہ فرما دیتے کہ اسے کس سورت میں، کس آیت سے پہلے یا بعد میں لکھا جائے گا اس لیے یہ ترتیب آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ہی مرتب کردہ ہے۔

ارشادِ باری ہے: يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۔۔۔ اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو۔ اپنے پروردگار کی عظمت سے لرزاں و ترساں رہو۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ اللہ کریم نے یہاں اپنی الوہیت کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ اپنی صفتِ ربوبیت ارشاد فرمائی ہے: اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۔۔۔ اس لیے کہ مخلوق کو تخلیق کرنا، اسے مختلف مراحل سے گزار کر، عجیب و غریب صورتوں سے دوچار کر کے مکمل انسانی وجود بنانا ربوبیت باری ہے۔ انسانی وجود کے مختلف اعضاء دیکھیں۔ ہر عضو کے کام دیکھیں، دماغ کی صلاحیتیں دیکھیں، عقل کے کرشمے دیکھیں۔ روئیدگی سے غذا کا بننا دیکھیں۔ ہر، ہر شئے ربوبیت باری تعالیٰ پر گواہ ہے۔ اس لیے فرمایا کہ اپنے پروردگار کی عظمت کا احساس رکھو۔ اللہ کی عظمت کا احساس بندے کو بندہ بننا سکھاتا ہے۔

دورِ حاضر کی پستی:

جب تک علمائے کرام دین سیکھتے اور سکھاتے رہے دین کی عظمت تھی۔ اب میڈیا کے مادر پدر آزاد دور میں علماء کی آبرو ہی نہیں رہی نہ اُن کی عزت کی جاتی ہے۔ اب دین کے بارے میں جو جتنا جاہل ہے اور اداکاری کر سکتا ہے وہ ٹی وی چینلز پر دین کے نام پر گمراہی پھیلا رہا ہے۔ اللہ کریم کی ذات بے عیب ہے اور یہ جاہل اللہ کریم کی ذات کے بارے گمراہیاں پھیلا رہے ہیں۔ ان کے اپنے پلے دین نہیں ہے تو یہ لوگوں کو عظمتِ باری کیا سمجھائیں گے؟

زلزلہء قیامت:

فرمایا: اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ① بے شک قیامت کا زلزلہ بڑی بھاری چیز ہوگی۔ قیامت کا زلزلہ اتنا بڑا ہے جس میں ساری کائنات تباہ ہو جائے گی۔ سمندر خشک ہو جائیں گے، چاند سورج جھڑ جائیں گے، آسمان پھٹ جائیں گے، پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اُڑ جائیں گے۔ اس بہت بڑے زلزلے سے ڈرو اور اس دن کی تیاری کرو۔ اگرچہ وہ بڑا بھاری دن ہوگا لیکن اس دن اللہ کے پیارے بندوں کو قیامِ قیامت کا پتا ہی نہیں چلے گا۔ سورۃ انبیاء میں گزر چکا ہے کہ اللہ کے ان بندوں کو اس کی ذرا سی سرسراہٹ بھی سنائی نہ دے گی۔ اللہ کریم یہاں پہلے سے اطلاع دے رہے ہیں کہ رحمتِ الٰہی کو اسی دنیا میں حاصل کر لو۔ رحمتِ الٰہی کو پانے والے راستے پر چلو تا کہ اس دن وہاں پہنچو جہاں اللہ کی رحمت ہوگی ورنہ جو اس سے باہر رہ جائیں گے وہ اس زلزلہ کی زد میں ہوں گے۔ وہ اتنا بڑا زلزلہ ہے کہ: (اے مخاطب) جس دن تو اسے دیکھے گا: تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ يَوْمَ تَرَوْنَهَا ۔۔۔ کہ دودھ پیتے بچوں کو دودھ پلانے والی مائیں بھول جائیں گی۔ دنیا میں جتنے مضبوط رشتے ہیں سب سے مضبوط رشتہ ماں مامتا کا ہے۔ خصوصاً جب بچہ شیر خوار ہو۔ ماں ساری قربانیاں دے کر بچے کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ فرمایا، مامتا بھری مائیں بھی معصوم بچوں کو بھول جائیں گی۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں رہے گی۔ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا ۔۔۔ اور حمل والی ماداؤں کے حمل گر جائیں گے۔ وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى ۔۔۔ اور آپ لوگوں کو ایسے دیکھیں گے جیسے وہ نشے میں ہوں۔ کوئی اِدھر گر رہا ہے کوئی اُدھر لوٹ رہا ہے۔ وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى ۔۔۔ لیکن وہ نشے میں نہیں ہوں گے وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ② اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے اس سے ان کے حواس مختل ہو جائیں گے۔ قیامت کا دھماکہ اتنا بڑا واقعہ ہے کہ اس سے اُن کے ذہن ماؤف ہو جائیں گے۔

فرمایا: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ③ اور بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے بارے اس کی ذات وصفات میں بغیر جانے جھگڑا کرتے ہیں اور ہر سرکش شیطان کے پیچھے ہو لیتے

ہیں۔ ایسے جاہل لوگ بھی ہیں کہ اپنی جہالت کے باوجود ذاتِ باری پر، صفات باری پر احکام باری اور نبوت پر اعتراض کرتے ہیں لیکن اصل بات یہ ہے کہ یہ جہلا، سرکش شیطانوں کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ انہوں نے انبیاؑ کا دامن نہیں تھاما اسی لیے جہالت کا شکار رہے اور شیطانوں کی صحبت میں چلے گئے۔ شیاطین ان پر جو باتیں اِلقاء کرتے ہیں وہی باتیں یہ آگے بیان کر دیتے ہیں۔ اس لیے ان کی باتیں اعتراضات ہیں۔ اللہ کی ذات و صفات پر اعتراضات اور اللہ کے نبیوںؑ اور دین کے احکامات پر اعتراضات۔

صحبت کے اثرات:

جب شیاطین کا ساتھ اختیار کر لیا تو ظاہر ہے وہ گمراہی میں ہی لے کر جائیں گے۔ جب بندہ اپنی مرضی سے فیصلہ کر لیتا ہے تو جس صحبت کو اختیار کرے گا اسی کے انجام کو پالے گا۔ یہی فرمایا گیا: كُتِبَ عَلَيْهِ أَنَّهُ مَنْ تَوَلَّاهُ فَأَنَّهُ يُضِلُّهُ وَيَهْدِيهِ إِلَىٰ عَذَابِ السَّعِيرِ ۞ جس کے بارے لکھا جا چکا ہے، کہ جو اسے دوست رکھے گا تو وہ اسے گمراہ کر دے گا اور اس کو دوزخ کے عذاب کا راستہ دکھائے گا۔

یہ آیت صحبت کے اثرات پر دلیل ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ ان گوں کے کردار پر یہ فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ جو شیطان کی دوستی کرے گا وہ اسے ضرور گمراہ کرے گا اور سیدھا جہنم کے عذابوں میں لے کر جائے گا۔ یہاں سے یہ مسئلہ سمجھ آ جاتا ہے کہ

صحبتِ صالح تُرا صالح کنند
صحبتِ طالح تُرا طالح کنند

اللہ کے نیک بندوں کی صحبت، صالحین کی صحبت صلاحیت کی طرف نیکی کی طرف لے جائے گی اور بدکار کی صحبت برائی کی طرف لے جائے گی۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشادِ عالی کا مفہوم ہے کہ برے کی صحبت لوہار کی بھٹی ہے۔ اس کے پاس بیٹھنے والے پر ہوسکتا ہے کہ گرم لوہے کی چنگاری یا لوہے کا چھوٹا سا ٹکڑا اگر پڑے۔ اور کچھ بھی نہ ہو صرف پاس بیٹھنے سے دھواں اور تپش تو آتی رہے گی۔ نیک لوگوں کی صحبت عطّار کی دکان ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ روئی پر عطر لگا کر بطور تحفہ دے دے اور اگر نہ بھی دے تو جتنی دیر وہاں بیٹھا رہے گا خوشبو تو آتی رہے گی۔ معطر رہے گا۔

اس آیہء مبارکہ میں واضح کیا جا رہا ہے کہ شیطان کی دوستی دوزخ کی طرف جانے والا راستہ ہے۔ وہ خود

دوزخ جا رہا ہے، جو اس سے دوستی کرتا ہے، اسے بھی ساتھ لے کر دوزخ میں جائے گا۔

قدرتِ کاملہ کے مظاہر، حصولِ ہدایت کے دلائل:

زیر نظر آیہ مبارکہ میں اللہ کریم اپنی قدرتِ کاملہ کا ذکر فرما کر حصولِ ہدایت کے در وا کر رہے ہیں تاکہ لوگ حق کو پا سکیں۔ فرمایا: يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنْ كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن تُرَابٍ۔۔۔ اے لوگو! اگر تم قیامت کے دن دوبارہ زندہ ہونے کے بارے شک میں ہو تو یقیناً ہم نے تم کو پہلی بار بھی تو مٹی سے پیدا فرمایا تھا۔ فرمایا کہ اپنی پیدائش پر غور کرو۔ ہم نے تمہاری پیدائش مٹی سے کی۔ مٹی کو کتنے روپ دیے۔ کہیں اناج، پھل، سبزیاں اُگا کر تمہاری غذا بنا دی، کہیں چارا اُگایا، اسے جانوروں نے کھایا، دودھ دیا، وہ دودھ انسان تک پہنچا۔ وہ جانور ذبح ہوا، اس کا گوشت انسان تک پہنچا۔ زمین سے جڑی بوٹیاں نکلیں، وہ انسان کی دوا بنیں۔ ایک مٹی ہی تھی جسے کتنی شکلوں سے گزار کر کتنے روپ دے کر کہیں انسان کی غذا بنائی اور کہیں دوا۔ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِن مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ۔۔۔ تمہاری پیدائش بنیادی طور پر مٹی سے ہوئی پھر نطفہ سے پھر خون کے لوتھڑے سے پھر بوٹی سے جس کی بناوٹ کامل بھی ہوتی ہے اور ناقص بھی تاکہ تم پر اپنی خالقیت ظاہر کر دیں۔ تمہیں یہ سارا کچھ اس لیے بتایا جا رہا ہے کہ تمہیں پتا ہو کہ رب العالمین کتنا عظیم ہے۔ وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ ۖ وَمِنكُم مَّن يُتَوَفَّىٰ وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِن بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا۔۔۔ پھر ہم ایک خاص مدت تک ماں کے پیٹ میں ٹھہرائے رکھتے ہیں۔ اسی نطفے سے پھر انسانی بچہ تخلیق کر کے دنیا میں لاتے ہیں۔ اس کے اعضا و جوارح ہوتے ہیں، بے نظیر حواس عطا ہوتے ہیں، بہترین قوتیں، صلاحیتیں ملتی ہیں۔ وہی بچہ جو کبھی طفل تھا، مکھی نہیں اڑا سکتا تھا وہ کڑیل جوان بن جاتا ہے۔ کچھ کر جانے کی قوت سے بھرپور ہوتا ہے لیکن وہ قادر کریم کسی کو جوانی میں ہی موت دے دے تو جوانی کا زور موت کو روک نہیں سکتا۔ وہ جو ایک ذرّے کو اتنی باریکیوں سے گزار کر انسان بنا رہا ہے وہ انسان کے مرنے کے بعد اس کے ذرّات کو کہہ دے کہ اٹھ کر کھڑا ہو جا تو کیا انسان کھڑا نہیں ہوگا؟

قادرِ مطلق ہی وہ ذات ہے کہ کسی کو جوانی میں موت دے دیتا ہے اور کسی کو بڑھاپے کی بڑی عمر تک پہنچا دیتا ہے۔ ہر شئے اللہ کے دستِ قدرت میں ہے، بچہ جب ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے تو کچھ نہیں جانتا پھر وہ سیکھتا رہتا ہے اور بڑا فاضل بن جاتا ہے جب بڑھاپا آ جاتا ہے تو حافظہ ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ قویٰ مضمحل ہو

جاتے ہیں۔ وہی بہت بڑا سائنسدان جس نے دنیا بھر کے علوم حاصل کر لیے تھے وہ اب یہ بھی بھول جاتا ہے کہ اس نے کھانا کھایا تھا یا نہیں۔

یہاں اللہ کریم یکے بعد دیگرے اپنی قدرت کی نشانیوں کا ذکر فرما رہے ہیں تا کہ انسان سمجھ بوجھ سے کام لے۔ فرمایا: وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيْجٍ ﴿۵﴾ تم زمین کو دیکھتے ہو کہ خشک پڑی ہے، گرد اڑ رہی ہے پھر ہم اس پر بارش برسا دیتے ہیں تو وہ ساری زمین شاداب ہو جاتی ہے۔ خوشنما نباتات اگاتی ہے، گھاس کا لباس پہن لیتی ہے، پھولوں سے لد جاتی ہے، درخت پھلوں سے بھر جاتے ہیں، فصلیں لہلہانے لگتی ہیں۔ وہی زمین جو مردہ پڑی تھی، خاک اڑ رہی تھی اس پر ہم نے بارش برسائی اور کیا کیا کمالات پیدا کر دیے۔ تم بھی جب مٹی میں مل جاؤ گے تو اسی طرح سے تمہیں بھی اٹھا کھڑا کر دیا جائے گا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۶﴾ یہ سب اس لیے ہے کہ اللہ ہی قادرِ مطلق برحق ہے اور یہ کہ وہی بے جان کو زندہ کر دیتا ہے اور یہ کہ وہی ہر چیز پر قادر ہے۔ اور یہ بھی یاد رکھو: وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴿۷﴾ کہ قیامت آنے والی ہے اس میں ذرا شبہ نہیں اور یہ کہ اللہ سب لوگوں کو جو قبروں میں ہیں زندہ کر اٹھائیں گے۔

قبر سے مراد ہے وہ جگہ جہاں مرنے کے بعد جگہ ملے گی جیسے کوئی سمندر میں غرق ہوا یا کسی جانور نے کھا لیا۔ یہ سب کچھ اس لیے بتایا جا رہا ہے کہ اللہ حق ہے، قادرِ قیوم ہے جو چاہے کر سکتا ہے۔ قیامت یقیناً قائم ہوگی۔ اس میں ذرا شک کرنے کی گنجائش نہیں اور اللہ ایسا قادر ہے کہ جتنے لوگ زمین کا حصہ بن چکے ہیں ان سب کو حشر میں کھڑا کر دے گا۔

تکبر کا انجام:

فرمایا: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ﴿۸﴾ اور بعض لوگ ایسے ہیں کہ اللہ کے بارے میں بغیر واقفیت (علمِ ضروری) اور بغیر دلیل (علمِ عقلی) کے اور بغیر کسی روشن کتاب (دلیلِ نقلی) کے جھگڑا کرتے ہیں۔

متکبر لوگوں کا ذکر ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ اللہ کی ذات، اس کی عظمت اور اس کی قدرتِ کاملہ میں جھگڑا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں مر کر دوبارہ زندہ ہونا کیسے ہوگا؟ کاش! وہ غور کر لیتے کہ وہ خود کیسے بن گئے تھے، انہیں خاک

سے انسانی قالب میں کس نے ڈھالا؟ اور جب وہ قالب مر کر خاک میں مل جائے گا تو اس قادرِ مطلق کے لیے کیا مشکل ہے کہ وہ دوبارہ بنا کھڑا کرے! یہ ایسے جاہل ہیں کہ بغیر علم کے جھگڑتے ہیں عظمتِ باری کے خلاف ان کے پاس کوئی علمی دلیل ہے نہ عقلی و نقلی۔ کسی الہامی کتاب میں کوئی ایسی دلیل نہیں جو ذاتِ باری کے بارے نزاع پیدا کرتی ہو۔ اس کے باوجود ان کا روّیہ یہ ہے: ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔۔۔(تکبر سے) گردن موڑ لیتے ہیں تا کہ وہ (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے بے راہ کریں۔

اپنی جاہلیت کے باوجود متکبر ہیں۔ اکڑے ہوئے، گردن پھیرے ہوئے ہیں۔ حق سے منہ موڑے ہوئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسرے لوگ بھی ان کا اتباع کریں۔ دوسروں کو بھی گمراہ کر کے جہنم لے جائیں۔ قرآن حکیم نے لوگوں کے اس عجیب روّیے کی نشاندہی کی ہے کہ بدکار لوگ کس طرح اپنے ساتھ دوسروں کو بھی برائی میں شامل کرنے کے لیے محنت کرتے ہیں۔ معاشرے میں اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے کہ نیک اور باعمل لوگ اس پر اتنی محنت نہیں کرتے کہ دوسروں کو بھی نیک بنایا جائے جتنی محنت برائی کرنے والے کرتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنے ساتھ ملالیں۔ فرمایا: لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝٩ ایسے شخص کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور قیامت کے دن ہم اس کو جلتی آگ کا عذاب چکھائیں گے۔

بتایا جارہا ہے کہ برائی کر کے کوئی دنیا میں بھی سکھ نہیں پاسکتا۔ ذلیل و رسوا ہی ہوتا ہے۔ دنیا میں انسان برائی کرتا ہے۔ چوری، ڈاکہ ڈالتا ہے، رشوت لیتا ہے، بددیانتی کرتا ہے تو اسی لیے کہ دنیا کی زندگی آرام سے بسر کرسکے۔ دولت، عہدہ، اقتدار سے عزت پائے لیکن ایسا نہیں ہوسکتا۔ بتایا جارہا ہے کہ برائی کر کے آرام نہیں ملتا۔ معاشرہ ایسی مثالوں سے پُر ہے۔ عوام ہوں یا سربراہانِ مملکت سب کا روّیہ ایک سا ہے۔ ہر ایک اپنی حدود سے تجاوز کر کے، اختیارات کا ناجائز استعمال کر کے دنیوی عزت، شہرت، دولت اور سکون حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ بڑے بڑے حکمرانوں کو ہتھکڑیاں لگ جاتی ہیں۔ زندگی میں یہ انجام ہوتا ہے کہ سکون غارت رہتا ہے۔ تو کیا کیفیت ہوگی ان کے دلوں کی!

اللہ کریم برائی کے انجام کی خبر دے رہے ہیں کہ بندہ دنیوی مفادات کے لیے برائی کرتا ہے اور وہ ان مفادات کو حاصل بھی کر لیتا ہے لیکن برائی کا ایک انجامِ بد اسے دنیا میں ہی دیکھنا پڑتا ہے۔ وہ دنیا میں ذلیل و رسوا ہوتا ہے اور آخرت میں آگ کا عذاب اسے بھگتنا ہوگا۔ جس دنیا کے لیے اس نے ظلم کیے، اللہ کی

نافرمانی کی وہ دنیا بھی اسے نہیں ملتی اور آخرت میں آگ کا عذاب گلے پڑ جاتا ہے۔ جب آگ اور دوزخ کا عذاب گلے پڑے گا تو اسے یاد دلایا جائے گا کہ: ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝۱۰ (اس سے کہا جائے گا) یہ تیرے ہاتھوں کیے گئے کاموں کا بدلہ ہے اور یہ کہ اللہ اپنے بندوں پر زیادتی کرنے والے نہیں۔

اللہ کی شان سے یہ بعید ہے کہ وہ ایک حقیر سی مخلوق پر زیادتی کرے۔ خالق کے سامنے مخلوق کی حیثیت کیا ہے۔ اللہ کریم کسی سے زیادتی نہیں کرتے۔ جو بھی زیادتی کرتا ہے اپنے آپ پر ظلم ڈھاتا ہے۔ اپنے لیے دوزخ خود بھڑکاتا ہے۔ اپنے لیے خود آگ جلاتا ہے اور پھر اس میں جلتا ہے۔

گمراہی کے جتنے رستے ہیں ہر ایک رستے پر وہی چلتا ہے جو اس فریب میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ برائی کر کے وہ دنیوی دولت، عزت، شہرت، سہولتیں پالے گا اور دنیا میں اس کی بڑی عزت ہوگی لیکن حق یہ ہے کہ برائی کا انجام بُرا ہی ہوتا ہے۔ برائی کرنے والے کو کبھی عزت و وقار نہیں ملتا اور آخرت بھی جاتی رہتی ہے۔

سورۃ الحج رکوع 2 آیات 11 تا 22

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ
وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ؕ ذٰلِكَ
هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۱﴾ يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ؕ
ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۲﴾ يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗۤ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ؕ لَبِئْسَ
الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ﴿۱۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۱۴﴾ مَنْ
كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى
السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ﴿۱۵﴾ وَكَذٰلِكَ
اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ﴿۱۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـِٕيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْۤا ۖ اِنَّ
اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۱۷﴾ اَلَمْ تَرَ
اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ
وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَكَثِيْرٌ حَقَّ
عَلَيْهِ الْعَذَابُ ؕ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا
يَشَآءُ ؕ۩ ﴿۱۸﴾ هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ۫ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ

ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ؕ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ﴿۱۹﴾ يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ
بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ؕ﴿۲۰﴾ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ﴿۲۱﴾ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا
مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۗ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۲۲﴾

اور لوگوں میں بعض ایسا بھی ہے جو اللہ کی عبادت (ایسے طور پر) کرتا ہے (جیسے کسی چیز کے) کنارے پر (کھڑا ہو) پھر اگر اس کو کوئی (دنیا کا) نفع پہنچ گیا تو اس کے سبب مطمئن ہو گیا اور اگر اس کو کوئی آزمائش آ گئی تو منہ اٹھا کر (کفر کی طرف) چل دیا اس نے دنیا میں (بھی) نقصان اٹھایا اور آخرت میں (بھی) یہی تو کُھلا نقصان ہے ﴿۱۱﴾ اللہ کے سوا ایسی چیز کو پکارتا ہے (عبادت کرتا ہے) جو اس کو نہ نقصان پہنچا سکتی ہے اور نہ اس کو نفع دے سکتی ہے یہی انتہا درجہ کی گمراہی ہے ﴿۱۲﴾ وہ ایسے کو پکار رہا ہے (عبادت کر رہا ہے) کہ اس کا نقصان اس کے فائدہ کی نسبت زیادہ قریب ہے ایسا کارساز بھی بُرا ہے اور ایسا ہم نشین بھی بُرا ہے ﴿۱۳﴾ بے شک اللہ ایسے لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک کام کیے (بہشت کے) ایسے باغوں میں داخل فرمائیں گے جن کے تابع نہریں جاری ہوں گی بے شک اللہ جو ارادہ کرتے ہیں کر گزرتے ہیں ﴿۱۴﴾ جو یہ خیال کرتا ہے کہ اللہ ان (نبی صلی اللہ علیہ وسلّم) کی دنیا اور آخرت میں ہرگز مدد نہیں فرمائیں گے تو اُس کو چاہیے کہ ایک رسی آسمان تک تان لے پھر (اس کے ذریعے آسمان پر پہنچ کر) اگر ہو سکے (تو وحی کو) ختم کر دے پھر دیکھ لے کہ کیا اُس کی یہ تجویز اس کے غصے کو دور کر سکتی ہے؟ ﴿۱۵﴾ اور ہم نے اس (قرآن) کو اسی طرح نازل فرمایا ہے (اس کی) باتیں کُھلی کُھلی (ہیں) اور یہ کہ اللہ جس کو چاہتے ہیں ہدایت بخشتے ہیں ﴿۱۶﴾ بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور ستارہ پرست اور عیسائی اور مجوسی اور وہ لوگ جنہوں نے شرک کیا یقیناً اللہ ان سب میں قیامت کے دن فیصلہ فرما دیں گے۔ بے شک اللہ ہر چیز سے باخبر ہیں ﴿۱۷﴾ (اے مخاطب) کیا تم نے نہیں دیکھا یہ کہ جو (مخلوق) آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور

چار پائے اور بہت سے انسان اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جن پر عذاب ثابت ہو چکا اور جس کو اللہ ذلیل کریں تو اس کو کوئی عزت دینے والا نہیں بے شک اللہ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں ﴿۱۸﴾ یہ دو فریق (ایک دوسرے کے دشمن) ہیں اپنے پروردگار کے بارے میں جھگڑتے ہیں تو جو لوگ کافر ہیں ان کے لیے آگ کے کپڑے کاٹے جائیں گے (بنائے جائیں گے) ان کے سروں کے اوپر سے تیز گرم پانی ڈالا جائے گا ﴿۱۹﴾ اس سے ان کے پیٹ کی چیزیں (انتڑیاں) اور کھالیں سب گل جائیں گی ﴿۲۰﴾ اور ان کے (مارنے کے) لیے لوہے کے گرز ہوں گے ﴿۲۱﴾ وہ جب چاہیں گے کہ اس (دوزخ) سے، دکھ کے مارے نکل جائیں (پھر) اُسی میں لوٹا دیے جائیں گے اور (کہا جائے گا) جلنے کا عذاب (ہمیشہ کے لیے) چکھتے رہو ﴿۲۲﴾

تفسیر و معارف

گزشتہ آیات میں واضح کیا گیا کہ ہدایت کا راستہ ایک ہے۔ وہ لوگ جو ہدایت پر ہیں ان سب کا طریقہ، سوچ، عمل یعنی عقیدہ سے اعمال تک سب ایک سا ہے۔ کفر کے جتنے راستے ہیں ان پر چلنے والے سب کے سب مختلف عقیدے رکھتے ہیں۔ کوئی جنوں کو پوجتا ہے، کوئی ستاروں کو۔ کوئی فرشتوں کو پوجتا ہے اور کوئی اہل اللہ کی پوجا کرتا ہے۔ کسی نے انبیاؑ کو اللہ کی اولاد مان لیا اور ان کی پوجا شروع کر دی لیکن سب کی عبادت کا مقصد صرف حصولِ دنیا ہے۔ کافر کا دین بھی دنیا ہے۔ وہ عبادات کے نام پر جو رسومات ادا کرتا ہے ان سے بھی وہ دنیوی فائدہ ہی چاہتا ہے۔ مومن کی دنیا بھی دین ہے۔ وہ دنیا کے کام کرتے ہوئے آخرت سنوارتا ہے۔

مشروط عبادت دو عالم کا خسارہ:

فرمایا: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ⑪ اور لوگوں میں بعض ایسا بھی ہے جو اللہ کی عبادت (ایسے طور پر) کرتا ہے (جیسے کسی چیز کے) کنارے پر (کھڑا ہو) پھر اگر اس کو کوئی (دنیا کا نفع) پہنچ گیا تو اس کے سبب مطمئن ہو گیا اور اگر اس کو کوئی آزمائش آ گئی تو منہ اٹھا کر (کفر کی طرف) چل

دیا اس نے دنیا میں بھی نقصان اٹھایا اور آخرت میں (بھی) یہی تو کھلا نقصان ہے۔

فرمایا جا رہا ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جنہیں دعوئ ایمان تو ہے لیکن اللہ کی عبادت مشروط کرتے ہیں۔ ان عبادات اور مجاہدوں سے ان کی مراد رضائے الٰہی نہیں ہوتی بلکہ دنیا کا ہی کوئی فائدہ مطلوب ہوتا ہے۔ وہ یہ سوچتے ہیں کہ نمازیں پڑھیں گے تو دکان خوب چلے گی۔ تہجد پڑھیں گے تو بیٹے ملازم ہو جائیں گے، کاروبار میں ترقی ہو گی۔ یعنی وہ مشروط عبادت کرتے ہیں۔ ان کی عبادات کا حاصل دنیا ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کے بارے ارشاد ہوا ہے کہ وہ گویا کنارے پر چلتے ہیں۔ اگر کام ان کی مرضی کے مطابق ہوا تو ٹھیک ورنہ کہتے ہیں، ''تہجد پڑھ کے دیکھ لیا دکان تو چلتی نہیں پھر کیا فائدہ؟'' یا یہ کہ ''اتنی تسبیحات پڑھیں بیٹا بیمار تھا وہ تو ٹھیک نہیں ہوا۔''

اگر دنیا کا کوئی فائدہ پہنچ جائے تو بڑے خوش ہو کر کہتے ہیں کہ میرے وظیفے سے اور میرے نفلوں سے یہ کام ہو گیا اور اگر ناکامی ہو، کوئی مشکل آ جائے تو ساری عبادات چھوڑ چھاڑ کر بیٹھ جاتے ہیں کہ اتنی نمازیں پڑھیں، اتنے وظیفے کیے، ملا تو کچھ بھی نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی دنیا بھی ضائع ہو گی اور آخرت بھی۔ انہیں اس دنیا میں کچھ ملا نہ آخرت میں۔

مسلمان کی تو ساری زندگی عبادت ہے۔ مسلمان کی عملی زندگی کا ہر قدم عبادت کا اجر پاتا ہے۔ صلوٰۃ، زکوٰۃ، روزہ اور حج تو ایسے ہے جیسے کسی سے کہا جائے کہ روزانہ صبح اٹھ کر غسل کر لیا کرو۔ صاف ستھرے تازہ دم ہو جاؤ گے۔ یہ عبادات بھی اسی طرح اثر رکھتی ہیں کہ عبادت سے عقیدے اور ایمان کو تازہ کر لیا جائے۔ اللہ کے حضور حاضری ہو جائے، اللہ سے شرفِ ہمکلامی نصیب ہو جائے۔ ایمان میں نئی تازگی اور عقیدے میں مضبوطی آ جائے اس کا اثر یہ ہو کہ بندہ دنیا کے کام بحیثیت مسلمان کرے۔ جب ہر کام اطاعتِ الٰہی اور اتباعِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم میں ہو گا تو وہ عبادت ہو گا۔ اسی لیے شریعت نے مومن کے ہر کام کو عبادت قرار دیا ہے کہ وہ روزی کماتا ہے تو شریعت کے مطابق، خرچ کرتا ہے تو شریعت کے مطابق۔ اس کی پوری زندگی عبادت ہے کہ اس کا ہر کام شریعت کے مطابق ہوتا ہے کنارے پر چلنے والے لوگ مختلف سوچ رکھتے ہیں۔ وہ عبادت کریں یا مجاہدہ اس کے ساتھ شرط لگا لیتے ہیں کہ اس سے ان کا فلاں کام ہو جائے گا اور جب وہ کام نہیں ہوتا تو ان کا دل عبادت سے اچاٹ ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم اس روّیے کی وجہ بتا رہا ہے کہ یہ لوگ عبادت پر محنت بھی کسی شرط پر کرتے ہیں حالانکہ کام تو اللہ کی مرضی اور اس کے حکم پر ہوتے ہیں۔ اللہ کا اپنا نظام ہے، تقدیرِ الٰہی ہے۔ بندے کی ہر خواہش پوری نہیں ہوتی۔ بندہ اپنی ذات کے اعتبار سے خواہش کرتا ہے۔ وہ مالک الملک کائنات کا فرماں روا ہے۔ وہ ساری کائنات کو متوازن رکھ کر چلاتا ہے۔ ہمارے سامنے ہماری اپنی ذات ہوتی ہے ہم اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے کوشاں رہتے ہیں خواہ

ہماری وہ خواہشات ہمارے لیے مضر ہی ہوں۔ ہم تو اپنی ذات سے بھی واقف نہیں ہیں کہ ہماری ذات کے لیے کیا چیز بہتر ہے اور کیا نقصان دہ ہے اور ربّ العالمین سب کی بھلائی جانتے ہیں جب اللہ علیم وخبیر کی عبادت میں انسان دنیا کی شرطیں لے کر آتے ہیں تو غیرتِ الٰہی اسے قبول نہیں فرماتی۔ جب لوگ اللہ کی عبادت بھی مشروط کریں گے تو اس بے نیاز کو کسی کی عبادت کی تو ضرورت ہی نہیں۔ اللہ کی عبادت کو دنیا سے مشروط کر دینا خود اپنے آپ کے ساتھ زیادتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں عظمتِ الٰہی کے مقابلے میں دنیا اور دنیوی مفادات عزیز ہیں۔ ان کے نزدیک دنیا اتنی قیمتی ہے کہ اللہ کی عبادت بھی دنیا کو حاصل کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ ان کی یہ مشروط عبادت ان کے لیے دو عالم کے خسارے کا باعث ہے۔

انتہا درجے کی گمراہی:

فرمایا: يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿١٢﴾ اللہ کے سوا ایسی چیز کو پکارتا ہے (عبادت کرتا ہے) جو اس کو نہ نقصان پہنچا سکتی ہے اور نہ اس کو نفع دے سکتی ہے یہی انتہا درجہ کی گمراہی ہے۔

اللہ کے سوا جو دوسروں کو پکارتے ہیں اور امیدیں رکھتے ہیں کہ وہ ان کے کام کر دیں گے۔ ان سے مصیبت کو دور کر دیں گے تو یہ بہت بڑی گمراہی ہے۔ ایک مخلوق دوسری مخلوق کا کیا بگاڑے گی اور کیا سنوارے گی! تمام مخلوقات اپنی ذات میں اللہ کے سامنے جواب دہ ہے۔ وہ اپنے جواب کی تیاری کرے گا یا کسی دوسرے کی فکر کرے گا۔ یہ آیہ مبارکہ واضح کر رہی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی کارساز نہیں لہٰذا اپنی امیدوں کا مرکز ذاتِ باری کو بناؤ۔

دنیا عالمِ اسباب ہے۔ یہاں کام اسباب کے ذریعے انجام پاتے ہیں لیکن اسباب اختیار کرنا اور بات ہے اور اسباب پر کلّی بھروسہ کر لینا دوسری بات ہے۔ عموماً اہل اللہ سے ایسی امیدیں وابستہ کر لی جاتی ہیں جو صرف اللہ سے وابستہ ہونی چاہئیں۔ درست طریقہ یہ ہے کہ اپنی امیدیں ذاتِ باری سے وابستہ کرو۔ اہل اللہ کا احترام اس لیے کرو کہ وہ اللہ کے نیک بندے ہیں۔ ان سے نیکی سیکھو، اللہ کی عبادت کے طریقے سیکھو، اللہ کا دین سیکھو اور اُن سے وہ فائدہ اٹھاؤ جو تمہیں دو عالم میں سرفراز کر دے وہ تمہاری روزی گھٹانے بڑھانے یا تمہارے ہاں بچوں کی پیدائش کے ٹھیکیدار نہیں ہیں۔ وہ تمہاری دکان چلانے یا نوکری دلوانے کے ذمہ دار نہیں۔ نظامِ کائنات اللہ کے دستِ قدرت میں ہے۔ جیسے چاہتا ہے چلاتا ہے۔ ساری مخلوق اس کی محتاج ہے تو اولیاء اللہ سے ایسی امیدیں کیوں وابستہ کی جائیں؟ کیا اہل اللہ خود بیمار نہیں ہوتے؟ وہ دوسروں کی بیماری کہاں ٹھیک کر سکتے ہیں نہ ہی یہ ان کی ذمہ داری ہے۔ ہاں! کسی نیک

بندے سے اللہ کی بارگاہ میں دعا کروانا اچھی بات ہے۔ خود دعا کرنا سب سے زیادہ اچھی بات ہے۔ اللہ کریم کو یہ زیادہ پسند ہے کہ اس کا بندہ خود اسے پکارے اور اپنی حاجت بیان کرے۔ دعا ایک نعمت ہے کہ بندہ براہ راست اللہ کریم کی بارگاہ میں اپنی گزارشات پیش کر دیتا ہے۔ اللہ کا یہی انعام کافی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہم جو دعا کریں خواہ خلوص سے ہی کریں اور یہ چاہیں کہ ویسا ہو جائے جیسا ہم چاہتے ہیں تو یہ ممکن نہیں۔ ویسا ہو گا جیسا وہ چاہتا ہے جس نے دنیا بنائی ہے۔ اُس کا علم قدیم ہے۔ دنیا نہیں بنی تھی تو بھی وہ جانتا تھا کہ دنیا بنائے گا۔ کون کون سی مخلوق کہاں ہوگی، کون سا جھونکا کس سرزمین پر چلے گا، کون سا قطرۂ بارش کہاں گرے گا؟ دنیا بنانے سے پہلے بھی وہ جانتا تھا، دنیا فنا ہو جائے گی تب بھی ہر چیز پہلے سے اس کے علم میں ہے۔ اس کا علم ہر لمحہ اس کے سامنے حاضر ہے۔ اس میں ماضی ہے نہ مستقبل۔ دنیا کا نظام اسی قادرِ مطلق کے ہاتھ میں ہے اور اسی کے حکم کے مطابق چلے گا، ہماری رائے کے مطابق نہیں۔ مخلوق تو خود اپنی ذمہ داری میں مشغول ہے وہ بھلا تمہارا کیا سنوارے گی؟ اللہ کو بھول کر غیر اللہ کے دروازے پر مت جاؤ۔ وہ تمہارا بگاڑ سکتا ہے نہ سنوار سکتا ہے اس لیے کہ نفع و نقصان صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ کو چھوڑ کر غیر اللہ کے دروازے پر جانا حد درجہ گمراہی ہے۔ فرمایا: ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿١٢﴾ یہی انتہا درجہ کی گمراہی ہے۔

بدترین خلائق:

يَدْعُوا لَمَنْ ضَرُّهٗۤ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ۔۔۔ وہ ایسے کو پکار رہا ہے (عبادت کر رہا ہے) کہ اس کا نقصان اس کے فائدہ کی نسبت زیادہ قریب ہے۔

جنہیں اللہ کے سوا پکارا جاتا ہے اُن کو پکارنے کا نقصان تو یقینی ہے اور نفع کے بارے پکارنے والے کو وہم ہے کہ اسے ان سے کچھ نفع ہو گا۔ تم عجیب لوگ ہو کہ ایسا کام کرتے ہو جس میں نقصان یقینی ہے اور نفع وہم کے درجے میں ہے کہ شاید ایسا ہو جائے۔ پکارنے سے مراد یہ ہے کہ اپنی امیدیں اُن سے وابستہ کر لیتے ہو کہ یہ تمہارا کام سنوار دیں گے یا مشکلات دور کر دیں گے، مسائل حل کر دیں گے۔ فرمایا: لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ﴿١٣﴾ ایسا کارساز بھی بُرا ہے اور ایسا ہم نشین بھی بُرا ہے۔

ایسا کارساز بدترین خلائق ہے اور اس کا ہم نشین جو اس سے توقعات لگائے بیٹھا ہے وہ اس سے بھی بُرا ہے۔ ایسا ہر بندہ بُرا ہے جو اللہ کی بارگاہ سے ہٹا کر لوگوں کو اپنے دروازے پر بلائے کہ وہ ان کی مشکلیں حل کر دے گا اور جو اس سے ایسی امید رکھے وہ اس سے بھی بُرا ہے۔

اہلِ ایمان کے لیے بشارت:

فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ

اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿١٤﴾ بے شک ایسے لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک کام کیے (بہشت کے) ایسے باغوں میں داخل فرمائیں گے جن کے تابع نہریں جاری ہوں گی بے شک اللہ جو ارادہ کرتے ہیں کر گزرتے ہیں۔

ایمان والوں کو جنت کی نعمتوں کی بشارت دی جارہی ہے اور ساتھ ہی ایمان والوں کی تشریح فرمائی جارہی ہے کہ ایمان والے وہ ہیں جنہوں نے نیک کام کیے۔ ایمان کی گواہی کردار و اعمال سے دیتے ہیں لہٰذا ایمان والے وہ ہیں جو اللہ، اللہ کرتے ہیں۔ اپنی امیدیں اللہ ہی سے رکھتے ہیں۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کا دامن تھام لیتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے توحیدِ باری تعالیٰ ایسی سکھائی کہ دلوں میں پیوست کردی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمتِ عالی میں حاضر ہونے والے ہر طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ بڑے بڑے عالم و فاضل تھے تو ایسے بھی تھے جو نہیں جانتے تھے۔ متقی و پرہیز گار تھے تو اعمال میں کمی والے بھی تھے۔ مرد تھے، خواتین تھیں، بچے اور بوڑھے بھی تھے۔ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے شیدا تھے۔ کیا کسی ایک فرد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ تم مجھے سجدہ کرو، میں تمہیں اللہ سے ملوا دوں گا؟ ہرگز نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ہر فرد کو صف میں کھڑا کر کے فرمایا، میں بھی اللہ کو سجدہ کروں گا تم بھی اللہ کو سجدہ کرو۔ ہر بندہ سیدھا بارگاہِ الٰہی میں سجدہ کرے۔

سجدہ کیا ہے؟ تذلل، عاجزی، اللہ کی عظمت کا اقرار، اپنی ساری ضروریات کی طلب ایک اللہ کے در پر رکھ دینا۔ یہ سجدہ ہے۔ ربّ العالمین کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو کر بندہ کہتا ہے کہ میرے مالک! میرے سانس کی آمد و شد، میرے رزق کی کمی بیشی، میری صحت کی درستی و خرابی میرے معاملاتِ زندگی، میرے معاملات وقتِ موت، قبر، برزخ، حشر سب کا مالک تُو ہی ہے تُو ہی مشکل کشا ہے۔ صرف تُو ہی مددگار ہے۔ اے میرے ربّ! تو ان سب کاموں میں میری مدد فرما۔ تیرے سوا کوئی نہیں۔

آج تو ایمان والوں سے استہزا کہا جاتا ہے کہ بڑے دیکھے ہیں نمازی لیکن کیا دیکھا ہے انہوں نے؟ اللہ فرماتا ہے، تم تب دیکھو گے جب یقیناً اللہ اپنے مومن اور صالح بندوں کو جنت میں داخل فرمائے گا تب تمہیں سمجھ آئے گی کہ اللہ پر اعتماد، اللہ کی اطاعت، اللہ کے دین کی عظمت کا اقرار، قرآن پر ایمان و عمل، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا اتباع کتنی عظمت رکھتا ہے! جب تم میدانِ حشر میں اپنے سامنے دیکھ رہے ہو گے کہ تمہیں جہنم کی طرف گھسیٹا جا رہا ہے اور انہیں بڑی عزت و احترام سے جنت کی طرف لایا جا رہا ہے۔ ان باغوں میں داخل کیا جا رہا ہے، نہریں جن کے تابع ہیں۔ دنیا میں تو جہاں پانی ہو وہاں باغ لگ سکتا ہے جنت کی خصوصیت یہ ہے کہ جہاں مومن باغ لگانا چاہے گا وہاں پانی باغوں کے تابع ہوگا پانی وہاں پہنچے گا۔ بلاشبہ اللہ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔

منکرین کا اسلام کے خلاف غصہ اور اس کا نتیجہ:

فرمایا: مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ﴿۱۵﴾ جو یہ خیال کرتا ہے کہ اللہ ان (نبی صلی اللہ علیہ وسلّم) کی دنیا اور آخرت میں ہرگز مدد نہیں فرمائیں گے تو اسے چاہیے کہ ایک رسی آسمان تک تان لے پھر (اس کے ذریعے آسمان پر پہنچ کر) اگر ہو سکے (تو وحی کو) ختم کر دے پھر دیکھ لے کہ کیا اس کی یہ تجویز اس کے غصّے کو دور کر سکتی ہے؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے خلاف منکرین کے غیض وغضب کا نتیجہ خود انہی پر الٹتا ہے۔ مومن کا اللہ کریم سے امید اور بھروسے کا رشتہ کبھی منقطع نہیں ہوسکتا۔ منکرین کے غیض وغضب کا وبال خود انہی پر آتا ہے اور وہ غضبِ الٰہی کا شکار ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو بتایا جا رہا ہے کہ یہ اگرچہ امرِ محال ہے لیکن تمہیں چاہیے کہ آسمان پر کمند ڈالو، اللہ کے لکھے کو مٹا ڈالو تا کہ تمہارا غصہ ٹھنڈا ہو جائے۔ ایسا ہونا ممکن ہی نہیں لہٰذا تم اپنے ہی ہاتھوں ہلاکت کا سامان کر رہے ہو۔

مقامِ فکر:

یہ آیت منکرین کی روش اور اس کا انجام بتا رہی ہے لیکن آج کے مسلمان کے لیے اس میں ایک آئینہ ہے۔ آج مسلمان کہلوانے کے باوجود ایسے لوگ ہیں جو اللہ سے ناراض اور بالکل ہی ناامید رہتے ہیں۔ اللہ کی کتاب پر اعتبار ہے نہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم سے رشتہ۔ بس ایک ہی رٹ لگائے رکھتے ہیں کہ آج تک اللہ نے تو ہمارا کچھ نہیں کیا۔ جب دنیا میں نہیں کیا تو آخرت میں کیا کرے گا! باقی لوگوں کو کیا کچھ نہیں دے رکھا۔ کسی کے پاس دولت ہے، کسی کے پاس حکومت۔ فلاں عیش کر رہا ہے اور فلاں مزے لوٹ رہا ہے۔

بندے کا اللہ سے ذرا سا بھی تعلق ہو تو وہ سوچے کہ اللہ نے اسے کیا نہیں دیا۔ اسے انسان بنایا، اسے بہترین مخلوق میں پیدا کیا۔ تیس پارے قرآن نازل کیا۔ اپنا حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم مبعوث فرمایا۔ محروم اور بدنصیب تو وہ ہے جو اتنی نعمتوں کے ہوتے ہوئے اللہ سے شکوہ کر رہا ہے۔ اس آیت کا سبق ایسے بدنصیبوں کے لیے بھی یہی ہے کہ کر سکتا ہے تو آسمان پر رسی ڈال کر چڑھ جائے اور سب کا نصیبہ کاٹ دے۔ عالم بالا چلا جائے، لوح محفوظ میں لکھا ہوا مٹا دے۔ کیا اس سے اس کا کلیجہ ٹھنڈا ہو جائے گا؟ دوسروں پہ نہ جلو اپنا معاملہ درست کرو۔ رحمت الٰہی برس رہی ہے۔ کاسہء دل کو سیدھا کرو۔ مسلمان کہلوانے والوں کو یہ رویہ زیب نہیں دیتا۔ مسلمان کا رشتہ ربّ کریم سے ہوتا ہے اور مسلمان اس کی تقسیم پر راضی رہتا ہے۔ اللہ نے کوشش کرنے سے نہیں روکا، دعا مانگنے سے نہیں روکا لہٰذا مسلمان ہو کر حسد کرنا کیا معنی؟

فرمایا: وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ﴿١٦﴾ اور ہم نے (قرآن) کو اسی طرح نازل فرمایا ہے (اس کی) باتیں کھلی کھلی (ہیں) اور یہ کہ اللہ جس کو چاہتے ہیں ہدایت بخشتے ہیں۔

اللہ کریم فرماتے ہیں کہ ہم باتیں تو بڑی کھول کر کرتے ہیں۔ آیاتِ قرآن تو بڑی واضح باتیں ہیں اور اس لیے یہ کھول کر بتا دی گئی ہیں کہ ہر فرد کی بات کا جواب آجائے۔ اللہ کریم کا یہ فیصلہ سنایا جا رہا ہے کہ: اَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ﴿١٦﴾ کہ اللہ جس کو چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں۔ اللہ تو اسے ہی ہدایت دیتے ہیں جو ہدایت کی خواہش رکھتا ہے۔ جو دل سے چاہے ہم اسے ہدایت ضرور دے دیتے ہیں۔ اسے محروم نہیں رکھتے لہٰذا دوسروں سے جھگڑنے اور حسد کرنے کی بجائے اپنے اندر کی خبر لو۔ اپنے دل میں صدق سے یہ بات جما لو کہ اللہ مجھے ہدایت عطا فرما۔ سوچنے سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ہدایت کی تمنا رکھنے والے کو ضرور ہدایت دے دیتے ہیں تو جو ہدایت پر نہیں ہے اس کا مطلب ہے کہ ہدایت پر نہ ہونے کا ذمہ دار بھی وہ خود ہے۔ اس نے دل سے یہ فیصلہ کیا ہی نہیں کہ اسے ہدایت چاہیے۔ فرمایا جا رہا ہے کہ اگر تم بھٹکتے پھر رہے ہو، گمراہ ہو گئے ہو، برائی میں مبتلا ہو چکے ہو، مصیبتوں میں گرفتار ہو گئے ہو تو میاں! اپنے اندر کی خبر لو۔ تم دل سے آخرت کے طلبگار ہی نہیں ہو۔ تم عبادت کے نام پر بھی جو کرتے ہو اس سے دنیا ہی کا کوئی فائدہ چاہتے ہو۔ اس میں اللہ کی عظمت کہاں ہے، اور اللہ سے تعلق کہاں، رشتہ کہاں ہے؟

تمہارے سامنے اللہ سے تعلق رکھنے والے بھی موجود ہیں۔ جو خلوصِ دل سے اللہ کی رضا کے لیے عبادت کرتے ہیں ان پر تو مصیبتیں بھی راحت بن کر گزر جاتی ہیں۔ ان کے دل پریشان نہیں ہوتے۔ انہیں کُلفت نہیں ہوتی۔ دنیوی پریشانیاں ان لوگوں کے دلوں کو جلاتی ہیں جنہوں نے اللہ کی رحمت اور نبی علیہ السلام کے دامانِ شفقت کو جھٹک دیا۔ یہ ایک سختی ہے اور عذاب ہے۔

دکھ اور تکلیف تو اللہ کے نیک بندوں پر بھی آتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام سے بڑی عظمت کس کی ہو گی لیکن کتنے ہی نبی ظلماً قتل کیے گئے۔ کتنی ایذائیں دی گئیں۔ کتنی تکالیف انہیں جھیلنی پڑیں لیکن ان سب تکلیفوں میں ان کے قلوب مطمئن رہے، اللہ کی یاد میں مصروف رہے۔ اس لیے کہ ان کی تکالیف ظاہری وحسّی تھیں معنوی نہیں تھیں۔ اس کے برعکس بدکار اگر محل کی آسائشوں میں بھی ہو تو وہ تکلیف میں ہوتا ہے اس لیے کہ اس کی تکلیفیں معنوی ہوتی ہیں۔ اس کے دکھ اندر کے دکھ ہوتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو دو میں سے ایک کو چُننے کا اختیار دیا ہے۔ دنیا یا آخرت؟ اپنی بڑائی منوانا چاہتا ہے یا اللہ کی بڑائی ماننا چاہتا ہے، دنیا میں اپنے آپ کو منوانا چاہتا ہے یا خود اللہ کو ماننا چاہتا ہے؟ حقیقت یہ

ہے کہ جو آخرت چاہتے ہیں انہیں دنیوی نعمتیں بھی ملتی ہیں اور اخروی کامیابی بھی ملتی ہے جو دنیا کے لیے آخرت تج دیتے ہیں انہیں دنیا میں ہی دے دیا جاتا ہے۔ آخرت میں کچھ نہیں دیا جاتا۔ یہ اللہ کی بتائی ہوئی کھلی کھلی باتیں ہیں، واضح ہیں تاکہ ہر ایک جان لے اور اپنے لیے درست فیصلہ کرلے۔

مومنین کے حق پر ہونے اور کفار کے گروہوں کا ذکر:

فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـِٕيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا ۖ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿17﴾ اور جو لوگ یہودی ہوئے اور ستارہ پرست اور عیسائی اور مجوسی اور وہ لوگ جنہوں نے شرک کیا یقیناً اللہ ان سب میں قیامت کے دن فیصلہ فرمادیں گے۔ بے شک اللہ ہر چیز سے باخبر ہیں۔

جو لوگ ایمان لائے اُن کا عقیدہ اور عمل درست ہے۔ لوگوں میں سے کچھ یہودی بن گئے کچھ بے دین ہو گئے، کچھ عیسائی ہو گئے کچھ آتش پرست ہو گئے اور کچھ شرک کی راہ پر چل دیے۔ یوں لوگوں کے مختلف طبقے بن گئے۔ ایمان والے تو حق پر ہوئے باقی سب گمراہ۔ آخر سب کو ایک میدان میں آنا ہے۔ اللہ وہاں ہم سب کے درمیان فیصلہ کریں گے اور پتا چل جائے گا کہ ایمان کا اجر کیا ہے اور کفر کا بدلہ کیا ہے۔ ہر چیز واضح ہو جائے گی اور اللہ کریم تو ہر چیز پر خود گواہ ہیں۔ ہر شخص کے عقیدے سے، کردار اور افکار سے، سوچ اور عمل سے، تمناؤں اور آرزوؤں سے واقف ہیں۔ ہر شئے سے ذاتی طور پر باخبر ہیں اور ہر ایک کو اس کا بدلہ دے دیا جائے گا۔

سجدہ سے مراد:

فرمایا: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَاۗبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ۭ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ۭ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاۗءُ ﴿18﴾ (اے مخاطب!) کیا تم نے نہیں دیکھا یہ کہ جو (مخلوق) آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چار پائے اور بہت سے انسان اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جن پر عذاب ثابت ہو چکا اور جس کو اللہ ذلیل کریں تو اس کو کوئی عزت دینے والا نہیں بے شک اللہ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔

سجدے سے مراد ہے عظمت بیان کرنا۔ سجدہ عجز کی علامت ہے۔ اپنی محتاجی کے اقرار کی علامت ہے۔ اللہ کی عظمت تسلیم کرنے کی علامت ہے۔ فرمایا، اے انسان کیا تو نہیں دیکھتا کہ کائنات کا ہر ذرہ اس کا مطیع ہے۔ اس

کے سامنے سربسجود ہے۔ اطاعت کرنا بھی سجدہ ہے اور ہر شئے حالاً بھی اللہ کریم کو سجدہ کرتی ہے اگر چہ ہر شئے کے سجدہ کرنے کا اپنا انداز ہے۔ آسمانوں اور زمینوں میں کیا اس کے حکم کے خلاف ہوتا ہے؟ کسی شئے میں کوئی طاقت نہیں کہ اس کے حکم کی خلاف ورزی کرے۔ اسی طرح تم سورج کو دیکھو، چاند ستاروں، پہاڑوں، درختوں اور جانوروں کو دیکھو۔ ہر چیز ہمہ وقت اس کی قدرتِ کاملہ کے آگے عاجز اور بے بس ہے۔ سورج کو اللہ نے جب سے اس ذمہ داری پر لگا رکھا ہے وہ اسی پر قائم ہے نہ گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے، چاند بھی اسی طرح اس خدمت کو بجالا رہا ہے جو اس کے سپرد کی تھی۔ ستارے بھی اپنے اپنے مقام پر ہیں۔ کسی میں یہ جرأت نہیں کہ آگے یا پیچھے ہو جائے۔ کائنات کے ہر ذرّے کو قادرِ مطلق نے جہاں سجا دیا وہ وہیں ڈیوٹی دے رہا ہے۔ اسی طرح پہاڑ درخت جانور ہر چیز اسے سجدہ کرتی ہے۔ سجدہ کا ایک معنی ہے ہمہ وقت اطاعت کرنا جیسا یہاں فرمایا گیا کہ ہر شئے ہمہ وقت اس کی مطیع ہے اور اگر حالاً بھی سجدہ کرے تو کوئی محال نہیں جیسا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ پہاڑوں کا ذکر کرنا قرآن میں موجود ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھروں کا سلام پیش کرنا قرآن اور حدیث میں موجود ہے۔ درختوں کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام پیش کرنا حدیث میں موجود ہے۔

یہ آیتِ سجدہ ہے سننے اور پڑھنے والے پر سجدۂ تلاوت واجب ہے۔ خواہ کوئی سپیکر پر سن رہا ہو اس پر بھی سجدہ کرنا واجب ہے۔ خواہ صلوٰۃ سے پہلے کرلے یا بعد میں۔ ایک ہی سجدہ کرنا ہوتا ہے۔

چونکہ سجدہ اللہ کی عظمت اور اپنی عاجزی تسلیم کرنے کا نام ہے اس لیے جو لوگ اللہ کی توفیق سے اپنی ساری زندگی اطاعتِ الٰہی میں گزارتے ہیں ان کی ساری زندگی ایک سجدہ بن جاتی ہے۔ گویا وہ ساری عمر حالتِ سجدہ میں رہے۔ اور ربِّ کریم تو ان کے اجر کو یوں بڑھاتا ہے کہ اس کا شمار ہی نہیں۔ اللہ کو اتباع نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام میں زندگیاں بسر کرنے والے اتنے محبوب ہیں کہ بتقاضائے بشریت ان سے جو غلطیاں ہو جاتی ہیں انہیں بھی معاف فرما دیتا ہے۔ توبہ کی اور اصلاح کی توفیق ارزاں فرما دیتا ہے۔ کتنا خوش نصیب ہوگا وہ شخص جو (50) پچاس سال یا ساٹھ، ستر، سو سال دنیا میں رہا اور اس کا سو سال سجدہ شمار ہوا۔ سجدہ یہی ہے نا کہ ایک شخص پاک لباس، پاک جسم، باوضو، قبلہ رو عظمتِ الٰہی کے ادراک میں دنیا کو بھول کر، سب سے کٹ کر اللہ کی عظمت کا اقرار کرنے کے لیے سر زمین پر رکھ دے۔ اور جس کی یہ کیفیت زندگی کے تمام امور میں رہے۔ وہ اپنی زندگی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں گزارے تو اللہ کریم اس کی زندگی کو سجدہ بنا دیتے ہیں۔

اب ذرا ان لوگوں کو بھی سوچنا چاہیے جنہیں فرض صلوٰۃ کے سجدوں کی بھی توفیق نہیں ہے۔ پروا نہیں کرتے

کہ خیر ہے پڑھ لی تو ٹھیک نہ پڑھی تو کوئی پرواہ نہیں اور یوں کہتے نظر آتے ہیں "دیکھیں ہیں بڑے نمازی ہم نے"۔ کہاں دیکھے ہیں؟ نمازیوں کو تو تب دیکھو گے جب میدانِ حشر میں ان کی عزت افزائی ہو رہی ہو گی۔

ایسی بہت سی مخلوق جن کا نہ عقیدہ درست ہے نہ عمل۔ سجدے کی توفیق ہے نہ رحمتِ الٰہی کا اقرار۔ گویا انہوں نے اپنے لیے عذاب واجب کر لیا ہے۔ یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ عذاب کی طرف ہی جانا ہے۔ ان پر ان کے کفر کے باعث عذاب لازم ہو چکا ہے۔ جنہیں اللہ ذلیل کر دیتے ہیں انہیں کوئی عزت نہیں دے سکتا۔ اللہ کی نافرمانی میں عزت نہیں۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے لہٰذا اس نے یہ طے کر دیا کہ جو عجز، بندگی اور اطاعت کرے گا میں اسے عظمت دوں گا جو اپنی بڑائی اور تکبر میں مبتلا ہو گیا میں اسے ذلیل کروں گا۔

مسلمان ایک قوم ہے، کافر ایک الگ قوم ہے:

فرمایا: هٰذٰنِ خَصْمٰنِ ۔۔۔ یہ دو فریق (ایک دوسرے کے دشمن) ہیں۔ یہ دو طرح کے لوگ ہیں جن کا آپس میں جھگڑا چلتا رہتا ہے۔ قرآنِ حکیم کے مطابق دنیا میں دو ہی قومیں ہیں ایک مومن دوسرے کافر۔ کفر کے بے شمار فرقے ہیں۔ کفر کی کئی اقسام ہیں لیکن قوم ایک ہی ہے۔ ارشادِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام ہے: اَلْكُفْرُ مِلَّةٌ وَّاحِدَة ۔۔۔ کفر ایک ہی ملت ہے لیکن ان کا آپس میں اتحاد ممکن نہیں۔ آپس میں امن سے رہنا ممکن ہے۔ ایک دوسرے کی حدود و قیود کا احساس رکھنا ممکن ہے لیکن نظریاتی طور پر ایک ہو جانا، یہ ممکن نہیں۔

مسلمان اور کافر کے نظریات مختلف ہیں۔ کافر اللہ کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام، اللہ کی کتاب، اور عقیدۂ آخرت کو نہیں مانتے اور مسلمان اس کا دامن چھوڑتے نہیں لہٰذا ان عقائد و نظریات پر یہ دونوں فریق متحد اور متفق نہیں ہوتے۔

سارے فرقے اسلام سے باہر ہیں:

اسلام میں کوئی فرقہ نہیں۔ آئمہ فقہ کا اختلاف ہے تو وہ بھی تشریح میں ہے بنیاد میں نہیں یعنی اصول میں اختلاف نہیں ہے فرع میں ہے۔ فروعات کا اختلاف باعثِ برکت ہے۔ یہ اختلاف صرف ترجیح کا ہے۔ فقہ کے تمام آئمہ بنیاد پر متفق ہیں صرف کام کرنے کے بارے اختلاف ہے کہ کام کا ایک انداز زیادہ بہتر ہے۔ اسے اختلاف اس لیے کہا جاتا ہے کہ ایک کام کرنے کے سارے جائز انداز شریعت میں جائز ہیں۔ ایک فرد کہتا ہے کہ اس انداز کو ترجیح ہے دوسرا کہتا ہے جس طرح وہ کام کر رہا ہے وہ زیادہ بہتر ہے۔ اس بات کو ترجیح کا اختلاف کہتے ہیں۔ یہ اختلاف بزرگانِ دین کے ہاں باعثِ برکت تھا کہ اللہ کے حکم کو بجا لانے کے سارے انداز اپنا لیے جاتے تھے۔ کوئی ایک

انداز اپناتا تو دوسرا کوئی اور انداز اپنالیتا۔ دورِ حاضر میں اسی اختلاف کو دشمنی میں بدل دیا گیا ہے۔ یہ اور کچھ نہیں، لوگوں کو آپس میں لڑا کر تقسیم کر کے اپنے لیے چندے جمع کرنا مقصد ہے۔ آئے دن نئے نئے مسئلے بنا کر لوگوں کو اس میں الجھائے رکھتے ہیں پھر اسے دشمنی کی حد تک لے جاتے ہیں یہاں تک کہ کفر کی حد تک لے جاتے ہیں۔ یہ درست نہیں۔

فرقہ تب بنتا ہے جب نظریات مختلف ہو جائیں۔ جس کا توحیدِ باری میں اختلاف ہو، رسالت میں ہو، نظریات مختلف ہو جائیں، کتاب اللہ میں عقیدہ مختلف ہو جائے، حشر نشر کے بارے عقیدہ فرق ہو جائے تو وہ اسلام سے ہی خارج ہو گیا۔ وہ مسئلہ اسلام کا نہیں ہے۔ جہاں کسی نے اصول میں اختلاف کیا وہ اسلام سے نکل گیا جیسے کوئی یہ کہتا ہے کہ کلمہ اسلام درست نہیں یا نبوت صحیح نہیں یا قرآن صحیح نہیں تو وہ خارج از دین ہے۔ اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ جو اللہ پر اللہ کی کتاب پر، آخرت پر، رسولوں پر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی ماننے پر، حساب کتاب پر، تمام ضروریاتِ دین پر ایمان رکھتا ہے وہ مسلمان ہے۔ جو ضروریاتِ دین میں سے کسی ایک کا بھی انکار کرتا ہے وہ کافر ہے۔ اس طرح تمام مسلمان ایک قوم ہیں اور کافر دوسری قوم۔

مومن اور کافر میں اصل جھگڑا اللہ کی ربوبیت کا ہے:

فرمایا: هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِیْ رَبِّهِمْ۔۔۔ مومن اور کافر کا جھگڑا ذاتِ باری پر ہے۔ مومن اپنی ساری امیدیں اللہ سے وابستہ کرتا ہے اور کافر اپنی امیدیں غیر اللہ سے وابستہ رکھتا ہے۔ مومن کی عبادات کا مقصد رضائے الٰہی ہے۔ کافر جو رسومات مذہب کے نام پر ادا کرتا ہے ان سب کا ماحصل بھی دنیا ہی ہوتی ہے۔ مومن کا ایمان ہے کہ اس کو زندہ رکھنا، موت دینا، صحت و بیماری، رزق کی تنگی اور فراخی، اولاد غرض تمام ضروریاتِ زندگی کے وسائل مہیا کرنا اللہ وحدہٗ لاشریک کا کام ہے۔ کافر کی امیدیں پروردگارِ عالم کو چھوڑ کر اپنے بتوں سے اور اپنے گھڑے ہوئے معبودانِ باطلہ سے جڑی ہوتی ہیں۔ ایمان یہ ہے کہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ وہ قادرِ مطلق ہے۔ صحت دے تو اس کی نعمت ہے۔ بیماری دے تو وہ مالک ہے دے سکتا ہے۔ امیر بنا دے تو قادر ہے۔ فقیر رکھے تو وہ قادر ہے۔ کافر کا ایمان یہ ہے کہ یہ کرو تو مال ملے گا، وہ کرو تو صحت ہوگی۔ فلاں مندر پر چڑھاوا چڑھاؤ تو اولاد ملے گی۔ فلاں دیوی کی پوجا کرو تو دیگر فوائد ملیں گے۔ غرض ذاتِ باری کی ربوبیت کے بارے جھگڑتے ہیں ورنہ ذاتِ باری کے معاملے پر بات آئے تو شاید کافر بھی کہہ دے کہ اللہ سب سے بڑا ہے کیونکہ ایک ہستی کو بڑا ماننا عقل کی مجبوری ہے۔ دیوی دیوتاؤں کو ماننے والے کو بھی آخر میں ایک ہستی ماننی پڑتی ہے جو سب کو بنانے والی ہے اور اسے بنانے والا

کوئی نہیں۔ وہ اپنی ذات سے قائم ہے۔ اس طرح شاید کہیں کا فر بھی اللہ کا نام لے لے لیکن جس نے ربوبیتِ باری کو نہ مانا اس نے اللہ کو کیا مانا؟ مومن اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔ اللہ کی اطاعت میں رزقِ حلال کمانے کے لیے جائز وسائل اختیار کرتا ہے اور اللہ سے اُمید رکھتا ہے کہ اس کا حصّہ اسے مل جائے گا۔ اسے اللہ کے ربّ العالمین ہونے پر کامل یقین ہوتا ہے جبکہ کفر کا حاصل دنیا ہے۔ کافر کو جائز ناجائز کی کوئی پروانہیں ہوتی۔ دوسروں کے حقوق چھیننے میں کوئی دریغ نہیں ہوتا کہ اس کی امیدوں کا مرکز بت ہوتے ہیں یا خواہشات۔ صاحبِ اقتدار ہوتے ہیں یا مذہبی راہنما۔

آج کے کلمہ گو:

کافر تو بتوں سے امیدیں رکھے تو سمجھ آتی ہے کہ اس کا عقیدہ ہی ایسا ہے۔ کلمہ گو جب اللہ کی ربوبیت کا عملاً انکار کرے تو کیا سمجھا جائے؟ آج کے مولوی بھی عبادات کا ثمرہ دنیا ہی بتا رہے ہیں۔ یہ کیسا اسلام ہے! ایک مولوی صاحب نے اشتہار دے رکھا ہے کہ رمضان کی ہر طاق رات کو ایک مخصوص تعداد میں فلاں سورت پڑھ لینے سے رزق بندے کی طرف اس طرح بھاگے گا جس طرح ڈھلوان سے پانی اترتا ہے۔ یہ صاحب رمضان کو بھی حصولِ رزق کا ہی ذریعہ بنا رہے ہیں۔ وظائف بھی حصولِ رزق کے لیے ایجاد کر رہے ہیں۔ انہیں اللہ کی ربوبیت پر کیوں یقین نہیں؟ مسلمان کا ایمان تو یہ ہے کہ جس نے اسے پیدا کیا ہے صرف وہی جانتا ہے کہ کس کو کتنا رزق دینا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے یہی تعلیم فرمایا ہے کہ مخلوق کے پیدا کرنے سے پہلے اللہ کریم نے سب کی روزی، سب کی عمریں، سب کی صحت، بیماری سب کچھ پہلے ہی تقسیم کر دیا۔ یہ فیصلے لکھ کر سیاہی خشک ہو چکی۔ اب کوئی وظیفہ کر کے اللہ کریم کو مجبور نہیں کر سکتا کہ اس کی روزی بڑھا دے۔ ہاں! اللہ سے دعا کر سکتا ہے، درخواست کر سکتا ہے اور اُس سے امید کرم رکھ سکتا ہے۔

عبادت تو صرف اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے ہے۔ وظائف میں اعلیٰ ترین وظیفہ درود شریف ہے جو مقبول دعا ہے۔ رمضان تو قربِ الٰہی کو پانے کے لیے ہے۔ اصلاحِ احوال کے لیے ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم رمضان میں تلاوت زیادہ کرتے تھے۔ نوافل زیادہ پڑھتے تھے، سخاوت زیادہ فرماتے تھے۔ زندگی بھر کسی سائل نے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم سے نہ نہیں سنی۔ کسی نے دنیا کا سوال بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلّم سے کیا ہو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہو ''نہیں''۔ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ پوری حیات طیبہ میں کسی سائل کو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے 'نہ' نہیں فرمایا۔ اس کے باوجود رمضان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی سخاوت زوروں پر ہوتی تھی۔

ساری نعمتیں اتباعِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ مومن کی دنیا بھی دین ہے کیونکہ مومن دنیا کے کام بھی آخرت کو مدنظر رکھ کر کرتا ہے۔ دین اللہ کے احکامات کی بجا آوری کا نام ہے۔ اللہ کی اطاعت ہی دین ہے۔ مومن دنیوی کام بھی اللہ کے حکم کے مطابق کرتا ہے تو اس کی دنیا بھی دین ہوتی ہے جبکہ کافر جو رسومات مذہب کے نام پر کرتا ہے ان سب کا ماحصل بھی دنیا ہے تو اللہ ہدایت دے ایسے مولویوں کو جو مسلمانوں کو یہ بتا رہے ہیں کہ عبادات کا حاصل بھی محض دنیا ہی ہے۔

یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بعض عبادت گزاروں کو یہ وہم ہو جاتا ہے کہ وہ چونکہ بہت عبادت کرتے ہیں، وظیفے کرتے ہیں لہٰذا اب ان کی دعا قبول ہونی چاہیے۔ وہ جو مانگتے ہیں وہ ہو جانا چاہیے۔ یہ گمراہی ہے۔ کیا بندہ بندگی کر کے حاکم بن جاتا ہے؟ حق یہ ہے کہ جو زیادہ بندگی کرتا ہے، زیادہ اللہ، اللہ کرتا ہے وہ اور زیادہ اللہ کا بندہ بن جاتا ہے۔

دعا کرنا بجائے خود عبادت ہے۔ دعا کا اصل مزہ یہ ہے کہ بندہ اللہ کریم سے گفتگو کرنے کی سعادت پالیتا ہے۔ اللہ کے حضور اپنی گزارشات براہ راست پیش کر دیتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھ کر اللہ سے مانگنے سے اللہ راضی ہوتا ہے۔ جب اللہ کی رضا ملے تو اس کے مقابلے میں دال روٹی ملے نہ ملے اس کی کیا حیثیت ہے! زیادہ عبادت کر کے بندہ حاکم نہیں بن جاتا مزید بندہ بن جاتا ہے۔ اللہ کی معرفت زیادہ نصیب ہوتی ہے۔ اس پر عظمتِ الٰہی مزید ہویدا ہوتی ہے۔ وہ اور زیادہ اللہ کا ڈرنے والا بندہ بن جاتا ہے۔

رہے کافر تو فرمایا: فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ۔۔۔ تو جو لوگ کافر ہیں ان کے لیے آگ کے کپڑے کاٹے جائیں گے (بنائے جائیں گے)

کافروں کی بات کرتے ہو تو سن لو! آخرت میں ان کے لیے آگ کا لباس تیار ہے۔ ان کے لباس دوزخ کی آگ سے بنائے جائیں گے۔ دنیا میں جس طرح تھان کاٹ، کاٹ کر لباس بناتے ہیں اسی طرح آخرت میں کفار کے لیے آگ کو کاٹ کر لباس بنائے جائیں گے۔ اور: يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ﴿١٩﴾ ان کے سروں کے اوپر سے کھولتا ہو گرم پانی ڈالا جائے گا۔ وہ اتنا کھولتا ہوا ہوگا کہ صرف جلد کو ہی نہیں، پورے بدن کے تمام اعضا کو جلا دے گا۔ فرمایا: يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ﴿٢٠﴾ اس سے ان کے پیٹ کی چیزیں (انتڑیاں) اور کھالیں سب گل جائیں گی۔ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ﴿٢١﴾ اور ان کے (مارنے کے) لیے لوہے کے گرز ہوں گے۔ عذابِ آخرت ایسا ہوگا کہ وہاں موت نہیں آئے گی۔ کھال جل گئی تو نئی آجائے گی۔ اندرونی اعضا جل گئے تو پھر بنا دیے جائیں گے۔ جسم جل رہا ہوگا، نیا بن رہا ہوں گا مزید یہ کہ

لوہے کے گرزوں سے مارا جائے گا۔ جب وہ ارادہ کریں گے کہ کہیں اِدھر اُدھر ہو جائیں تو فرمایا: كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا۔۔۔وہ جب چاہیں گے کہ اس (دوزخ) سے، دکھ کے مارے نکل جائیں (پھر) اسی میں لوٹا دیے جائیں گے۔ یعنی جب وہ ارادہ کریں گے کہ کہیں بھاگ جائیں تو پھر انہیں درمیان میں کھڑا کر دیا جائے گا کہ اب بھگتو۔ اس عذاب کا اہتمام تم نے اپنے لیے خود کیا ہے۔ تمہارے اپنے نظریات اور کردار کا ہی نتیجہ ہے۔ اور: وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿٢٢﴾ اور (کہا جائے گا) جلنے کا عذاب (ہمیشہ کے لیے) چکھتے رہو۔

تم اس میں جلتے رہو کہ تم نے اپنے لیے رہائش کی یہی جگہ منتخب کی ہے۔ اللہ تو اتنے کریم ہیں کہ اللہ نے دنیا میں اپنی تمام نعمتیں تمہیں دیں۔ تمہاری سرکشی کے باوجود تمہارا رزق بند نہیں کیا، اولاد جیسی نعمت دی۔ تم بندے تھے وہ مالک ہے اس نے تمہاری طرف اپنے نبیؑ بھیجے، کتابیں نازل کیں۔ تم نہیں مانے۔ تم نے ضد کی کہ اسی راستے کو ہی اپنانا ہے تو اب اس راستے کا انجام (Enjoy) کرو، موج کرو!

اللہ کے جو بندے اللہ کی عظمت پر یقین رکھتے تھے تم تو ان سے بھی جھگڑتے تھے، تم انہیں بے وقوف کہتے تھے۔ وہ تمہیں بھلائی کی طرف دعوت دیتے تھے کہ اللہ پر ایمان لے آو، اللہ کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مانو، آخرت پر ایمان لاؤ، اللہ کی کتاب کو مانو اور اپنے نظریات اور کردار کی اصلاح کر لو۔

اب اپنا انجام بھی دیکھ لو اور یہ بھی دیکھ لو کہ اُن کا کیسا بھلا انجام ہوا۔

سورۃ الحج رکوع 3 آیات 23 تا 25

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنَّ اللّٰہَ یُدْخِلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ یُحَلَّوْنَ فِیْھَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَھَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ؕ وَلِبَاسُھُمْ فِیْھَا حَرِیْرٌ ﴿۲۳﴾ وَھُدُوْٓا اِلَی الطَّیِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۚۖ وَھُدُوْٓا اِلٰی صِرَاطِ الْحَمِیْدِ ﴿۲۴﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِیْ جَعَلْنٰہُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۨ الْعَاکِفُ فِیْہِ وَالْبَادِ ؕ وَمَنْ یُّرِدْ فِیْہِ بِاِلْحَادٍۢ بِظُلْمٍ نُّذِقْہُ مِنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۲۵﴾

بے شک اللہ ان کو جو ایمان لائے اور نیک کام کیے بہشت کے ایسے باغوں میں داخل فرمائیں گے جن کے تابع نہریں جاری ہوں گی وہاں ان کو سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور موتی۔ اور وہاں ان کا لباس ریشم کا ہوگا ﴿۲۳﴾ اور اُن کو (دنیا میں) پاکیزہ کلام (کلمہ طیبہ) کی ہدایت کی گئی اور انہیں اس (اللہ) کے راستے کی ہدایت ہوگئی جو تعریف کے لائق ہے ﴿۲۴﴾ بے شک جو لوگ کافر ہوئے اور وہ اللہ کے راستہ سے اور مسجد حرام سے (بھی) روکتے ہیں جس کو ہم نے تمام لوگوں کے لیے (یکساں عبادت گاہ) بنایا ہے اس میں وہاں کا رہنے والا ہو یا باہر سے آنے والا، برابر ہے اور جو اس میں کوئی خلافِ دین (کفر و شرک کی بات یا کام) ظلم کے ساتھ قصداً کرے ہم اس کو دردناک عذاب (کا مزہ) چکھائیں گے ﴿۲۵﴾

تفسیر و معارف

فرمایا: اِنَّ اللّٰہَ یُدْخِلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ

يُحَلَّوۡنَ فِيۡهَا مِنۡ اَسَاوِرَ مِنۡ ذَهَبٍ وَّلُؤۡلُؤًا ؕ وَلِبَاسُهُمۡ فِيۡهَا حَرِيۡرٌ ﴿۲۳﴾ بے شک اللہ ان کو جو ایمان لائے اور نیک کام کیے بہشت کے ایسے باغوں میں داخل فرمائیں گے جن کے تابع نہریں جاری ہوں گی وہاں ان کو سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور موتی۔ اور وہاں ان کا لباس ریشم کا ہوگا۔

جب کفار اس طرح جل رہے ہوں گے عین اس وقت اللہ مومنین کو بہترین باغات میں جگہ دے گا۔ جنتی کو جہاں باغ لگانا ہوگا وہاں پانی از خود پہنچے گا کہ وہاں نہریں، باغوں کے تابع ہوں گی۔ ان باغوں پر خزاں کی رُت کبھی نہیں آئے گی۔ جب نافرمانوں، سرکشوں، منکرین کو آگ کا لباس پہنایا جارہا ہوگا اس وقت اللہ کریم اہل جنت کو ریشم کا لباس پہنائیں گے۔ ان کو سونے اور موتیوں سے مزین کنگن پہنائیں گے۔ اس لیے کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ: وَهُدُوۡۤا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الۡقَوۡلِ ۖۚ وَهُدُوۡۤا اِلٰى صِرَاطِ الۡحَمِيۡدِ ﴿۲۴﴾ اور اُن کو (دنیا میں) پاکیزہ کلام (کلمہ طیبہ) کی ہدایت کی گئی اور انہیں اس (اللہ) کے راستے کی ہدایت ہوگئی جو تعریف کے لائق ہے۔

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں سب سے پاکیزہ قول، کلمہ طیبہ کی ہدایت نصیب ہوئی۔ جنہوں نے اللہ کی توحید، اس کی ربوبیت، اس کے انبیاؑ کی رسالت کا اقرار کیا جو اللہ کے احکام کو بجالائے۔ انہیں دنیا میں خوبصورت راستے کی راہنمائی فرمائی گئی اور وہ اس تعریف کیے گئے راستے پر چلتے چلتے جنت پہنچ گئے۔

اہلِ دوزخ جو عذاب پا رہے ہیں یہ راستہ انہوں نے اپنے لیے خود چُنا۔ انبیاؑ کامیابی کے راستے کی راہنمائی کرتے رہے۔ اللہ کی کتابیں بتاتی رہیں۔ اُن تک بات پہنچتی رہی لیکن انہوں نے اپنے لیے جو راہ چُن لی اس پر چل کر اپنی منزل (دوزخ) پر پہنچ گئے۔ فرمایا: اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَيَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَالۡمَسۡجِدِ الۡحَـرَامِ الَّذِىۡ جَعَلۡنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۨالۡعَاكِفُ فِيۡهِ وَالۡبَادِ ؕ وَمَنۡ يُّرِدۡ فِيۡهِ بِاِلۡحَادٍۢ بِظُلۡمٍ نُّذِقۡهُ مِنۡ عَذَابٍ اَلِيۡمٍ ﴿۲۵﴾ بے شک جو لوگ کافر ہوئے اور وہ اللہ کے راستہ سے اور مسجد حرام سے بھی روکتے ہیں جس کو ہم نے تمام لوگوں کے لیے (یکساں عبادت گاہ) بنایا ہے اس میں وہاں کا رہنے والا ہو یا باہر سے آنے والا برابر ہے اور جو اس میں کوئی خلافِ دین (کفروشرک کی بات یا کام) ظلم کے ساتھ قصداً کرے ہم اس کو دردناک عذاب (کا مزہ) چکھائیں گے۔

مومن اور کافر میں فرق یہ ہے کہ کافر اللہ کی راہ سے روکتا ہے۔ یعنی کافر کی سوچ اور فکر۔ کافر کی تعلیمات۔ اس کے معاملات اور اس کی تہذیب ایسی ہے کہ وہ اللہ کی راہ سے روکنے کا سبب بنتی ہے۔ جیسے لباس سترِ عورت اور حیا کا سبب ہے کافر بے حیائی کے لیے بناتا ہے۔ یہی حال اس کی ساری تہذیب کا ہے۔ ہمیں دیکھنا ہوگا کہ بحیثیت

مسلمان کیا ہم اپنی تہذیب پر قائم ہیں یا ہم نے کافر کی تہذیب اپنالی ہے؟

ابن خلدون کی تحقیق:

علامہ ابن خلدون اپنی معرکۃ الآراء تصنیف ''مقدمہ ابن خلدون'' میں لکھتے ہیں کہ کافر کے وہ کام اپنا لیے جائیں جو اُن کی پہچان ہے جیسے اُن کا لباس، ان کی زبان، رہن سہن کے انداز، معاشرت یا اُن کا وہ فیشن جس سے ان کی پہچان وابستہ ہے تو ایسا کرنا اگرچہ شرعاً حرام نہیں ہے لیکن اس کے اثرات بڑے دور رس ہوتے ہیں۔ فرماتے ہیں ایک اثر یہ ہے کہ ایسا کرنے سے اس قوم کی بہت سی برائیاں معمولی لگنے لگتی ہیں اور بندہ غیر شعوری طور پر وہ گناہ (برائیاں) اپنا لیتا ہے۔ ایسے امور میں بہت محتاط رہنا چاہیے۔ تہذیب عقیدہ نہیں ہے رہنے سہنے کا ایک انداز ہے۔ جو لباس جسم ڈھانپ لیتا ہے تو کسی طرح کا بھی ہو کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن جو لباس کسی قوم کا شعار بن جائے مثلاً ہندوؤں کی دھوتی کا ایک مخصوص انداز ہے جو اس کا شعار ہے، اس کی پہچان ہے۔ اگر کوئی مسلمان ویسی ہی دھوتی لپیٹ لے تو دیکھنے والا یہی گمان کرے گا کہ یہ ہندو ہے۔ یہ لباس اگرچہ حرام نہیں ہے لیکن اتنا مشابہہ ہے کہ اسی قوم کا فرد ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے لہٰذا ایسا لباس جو قوم کی شناخت ہو، ان کا قومی، مذہبی شعار ہو ایسا لباس پہننا حرام ہے۔ آج کل کوٹ پتلون عام لباس ہے۔ یہ یہودی، عیسائی یا ہندو کا شعار نہیں۔ ایک عمومی لباس ہے۔ اسے استعمال کرتے ہوئے کچھ تبدیلی کر لینی چاہیے۔ اگر وہ اونچا کوٹ پہنتے ہیں تو آپ قدرے لمبا کر دیں۔ اگر وہ تنگ پتلون پہنتے ہیں تو آپ کھلی پہن لیں۔ کوشش کریں کہ کسی کے قومی شعار میں کلّی مشابہت نہ ہو۔ کچھ فرق ضرور رکھیں۔

علامہ ابن خلدون ایک مثال دیتے ہیں کہ مرغی جب انڈے دیتی ہے تو اس پر یہ تجربہ کریں کہ اس مرغی کو اونٹ کے گوشت کے باریک باریک ٹکڑے کر کے روزانہ تھوڑا تھوڑا کھلاتے جائیں۔ رفتہ رفتہ مرغی کے انڈوں کا سائز بڑھ جائے گا۔ فرماتے ہیں، یہی حال دوسروں کی تہذیب کو اپنانے میں ہے۔ جب مومن غیر مومن کی تہذیب سے مرعوب ہو کر اسے اپناتا ہے، پسند کرتا ہے تو اس قوم کی برائیاں اسے ہلکی لگنے لگ جاتی ہیں لہٰذا مومن کو بہر حال اپنی الگ شناخت رکھنا ضروری ہے۔ دنیا میں اپنا الگ تشخص رکھنا ضروری ہے۔ ہم دنیا میں اپنا تشخص الگ رکھیں گے تب بات بنے گی آخرت میں راحتیں نصیب ہوں گی۔ فرمایا جا رہا ہے کہ کافر کی تہذیب کے سارے انداز اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اس لیے مومن کو کافر کے انداز زیب نہیں دیتے۔

کافر قولاً، فعلاً، عملاً اللہ کی راہ سے روکتا ہے:

کفر کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اپنی زبان سے اپنے عمل سے اپنے اندازِ زیست سے اللہ کی راہ سے روکتا

ہے۔ یہاں تک کہ مکرم ومحترم مسجد (مسجدِ حرام) کی طرف جانے سے روکتا ہے۔ اللہ کے گھر سے، بیت اللہ سے روکتا ہے۔ دنیا میں یہ مقدس ترین مقام ہے۔ یہاں مسافر اور مقیم دونوں کا حق برابر ہے۔ جیسے مقیم کو روزی ملتی ہے مسافر کو بھی کسی شئے کی کمی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ جیسے مقیم خود کو اپنے گھر میں بستا محسوس کرتا ہے مسافر بھی وہاں خود کو اپنے گھر میں ہی محسوس کرتا ہے۔ مسافر کو ہر رعایت ویسے ہی ملتی ہے جیسے مقیم کو۔ یہ دنیا میں واحد گھر ہے جہاں مسافر اور مقیم ایک جیسے ہیں۔ یہی قانون تمام مساجد پر لاگو ہوتا ہے۔ معمولی فروعی اختلاف کی وجہ سے کسی کو مسجد میں عبادت سے نہیں روکا جاسکتا۔ مسجد اللہ کی ہے۔ کسی مسلمان کو عبادت سے روکنا جائز نہیں۔

بیت اللہ کی عظمت کے خلاف کام عذابِ الیم کا سبب ہے:

بیت اللہ کوئی عام جگہ نہیں۔ یہ دنیا کا مرکز ہی نہیں، تجلیاتِ باری کا مرکز ہے، روئے زمین کے لوگوں کے لیے قبلہ ہے، سجدے کی سمت ہے۔ بیت اللہ شریف وہ مرکزی مقام ہے جہاں سے ساری زمین پھیلائی گئی۔ اس مقام پر ہر آن اللہ کی تجلیات برستی رہتی ہیں۔ ایسے مقام پر جو کوئی اللہ کے حکم کے خلاف، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیمات کے خلاف کوئی عمل کرنا چاہے گا تو اس سے بڑے کسی ظلم کا تصور نہیں۔

یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم بیت اللہ جا کر حج اور عمرہ کے فرائض وواجبات سنن اور مستحبات کو چھوڑ کر رسومات کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ جو لغو کام اور رسومات عہد جاہلیت میں ہوتی تھیں آج کلمہ گو ویسی ہی رسومات میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ مسلمان کو تو یہ زیب نہیں دیتا۔ کاش حاجی وہاں جانے سے پہلے وہاں کے احترام اور آداب کے بارے کسی عالم سے پوچھ لیں، کتابیں ملتی ہیں انہیں پڑھ لیں۔ صرف متوجہ الی اللہ ہو کر طواف کر لیں۔ کوئی دعا یاد نہیں تو کلمہ طیبہ دہراتے رہیں۔ درود شریف پڑھتے رہیں جو سب سے زیادہ مقبول دعا ہے۔

فرمایا، کفر کی رسومات مت اپناؤ۔ کفر کی ساری رسومات اللہ سے روکنے والی ہیں۔ اللہ کے گھر میں مسافر اور مقامی ایک جیسے ہیں۔ وہاں جو بھی برائی کرتا ہے یا رسومات پر عمل کرتا ہے۔ کافروں کی رسومات وہاں انجام دیتا ہے تو ایسے بندے کو بہت دردناک عذاب چکھنا پڑے گا۔

سورۃ الحج رکوع 4 آیات 26 تا 33

اَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَاِذۡ بَوَّاۡنَا لِاِبۡرٰهِيۡمَ مَكَانَ الۡبَيۡتِ اَنۡ لَّا تُشۡرِكۡ بِىۡ شَيۡـًٔـا وَّطَهِّرۡ بَيۡتِىَ
لِلطَّآئِفِيۡنَ وَالۡقَآئِمِيۡنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوۡدِ ﴿۲۶﴾ وَاَذِّنۡ فِى النَّاسِ بِالۡحَجِّ يَاۡتُوۡكَ
رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاۡتِيۡنَ مِنۡ كُلِّ فَجٍّ عَمِيۡقٍ ﴿۲۷﴾ لِّيَشۡهَدُوۡا مَنَافِعَ لَهُمۡ
وَيَذۡكُرُوا اسۡمَ اللّٰهِ فِىۡۤ اَيَّامٍ مَّعۡلُوۡمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمۡ مِّنۡۢ بَهِيۡمَةِ
الۡاَنۡعَامِ‌ ۚ فَكُلُوۡا مِنۡهَا وَاَطۡعِمُوا الۡبَآئِسَ الۡفَقِيۡرَ ﴿۲۸﴾ ثُمَّ لۡيَـقۡضُوۡا تَفَثَهُمۡ
وَلۡيُوۡفُوۡا نُذُوۡرَهُمۡ وَلۡيَطَّوَّفُوۡا بِالۡبَيۡتِ الۡعَتِيۡقِ ﴿۲۹﴾ ذٰ لِكَ ۚ وَمَنۡ يُّعَظِّمۡ
حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيۡرٌ لَّهٗ عِنۡدَ رَبِّهٖ‌ ؕ وَاُحِلَّتۡ لَـكُمُ الۡاَنۡعَامُ اِلَّا مَا يُتۡلٰى
عَلَيۡكُمۡ‌ فَاجۡتَنِبُوا الرِّجۡسَ مِنَ الۡاَوۡثَانِ وَاجۡتَنِبُوۡا قَوۡلَ الزُّوۡرِۙ ﴿۳۰﴾
حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيۡرَ مُشۡرِكِيۡنَ بِهٖ‌ ؕ وَمَنۡ يُّشۡرِكۡ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ
فَتَخۡطَفُهُ الطَّيۡرُ اَوۡ تَهۡوِىۡ بِهِ الرِّيۡحُ فِىۡ مَكَانٍ سَحِيۡقٍ ﴿۳۱﴾ ذٰ لِكَ ۚ وَمَنۡ يُّعَظِّمۡ
شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنۡ تَقۡوَى الۡقُلُوۡبِ ﴿۳۲﴾ لَكُمۡ فِيۡهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ
مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَاۤ اِلَى الۡبَيۡتِ الۡعَتِيۡقِ ﴿۳۳﴾

اور جب ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو خانہ کعبہ کی جگہ بتا دی (اور فرمایا) کہ میرے ساتھ کسی کو شریک مت کرنا اور میرے اس گھر کو طواف کرنے والوں اور (نماز میں) قیام اور رکوع (اور) سجدہ کرنے والوں کے لیے (حسّی اور معنوی طور پر) پاک رکھنا ﴿۲۶﴾ اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دیجیے لوگ (حج کے لیے) آپ کے پاس

پیدل (بھی) اور دُبلے دُبلے اونٹوں پر جو دُور دراز راستوں سے چلے آتے ہوں آ موجود ہوں گے ﴿۲۷﴾ تا کہ وہ اپنے (دنیا و آخرت کے) فائدے کے لیے حاضر ہوں اور (قربانی کے) معلوم دنوں ان (مخصوص) چوپایوں پر جو اس (اللہ) نے ان کو عطا فرمائے ہیں (بوقتِ ذبح) اللہ کا نام لیں پس اس میں سے تم خود بھی کھاؤ اور فقیر درماندہ کو بھی کھلاؤ ﴿۲۸﴾ پھر (لوگوں کو) چاہیے کہ اپنا میل کچیل دُور کریں اور اپنی نذریں پوری کریں اور خانہ کعبہ (امان دیا گیا گھر) کا طواف کریں ﴿۲۹﴾ یہ (ہمارا حکم ہے) اور جو شخص اللہ کی حرمتوں کی (ادب کی چیزوں کی جو اللہ نے مقرر فرمائیں ہیں) تعظیم کرے تو یہ اس کے پروردگار کے نزدیک اس کے لیے بہت بہتر ہے اور تمہارے لیے مویشی حلال کر دیے گئے ہیں سوائے ان کے جو تم کو پڑھ کر سنائے جاتے ہیں، سو بتوں کی پلیدی سے دور رہو اور جھوٹی بات سے دور رہو ﴿۳۰﴾ صرف ایک اللہ کے لیے یکسو ہو کر، اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہرا کر۔ اور جو اللہ کے ساتھ شرک کرے گا تو گویا وہ آسمان سے گر پڑا پھر پرندوں نے اس کی بوٹیاں نوچ لیں یا اس کو ہوا نے کسی دور دراز جگہ میں جا پٹکا ﴿۳۱﴾ یہ بات ہے۔ اور جو اللہ کی نشانیوں کی تعظیم کرے تو یقیناً یہ (فعل) دلوں کی پرہیزگاری میں سے ہے ﴿۳۲﴾ ان (قربانی کے جانوروں) میں تمہارے لیے ایک مقررہ وقت تک فائدے ہیں پھر انہیں قدیم گھر (بیت اللہ) تک پہنچنا (اور ذبح ہونا) ہے ﴿۳۳﴾

تفسیر و معارف

بیت اللہ شریف:

فرمایا: وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اور جب ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو خانہ کعبہ کی جگہ بتا دی۔ اس سے پتا چلتا ہے بیت اللہ کی پہلے سے ہی کوئی مخصوص جگہ تھی جس کی خبر اللہ کریم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دی اور پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وہاں بیت اللہ کی بنیاد رکھی۔ سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے اللہ

کے حکم سے بیت اللہ کو تعمیر کیا تھا۔ یہ زمین کا مرکزی نقطہ ہے اور مہبط تجلیاتِ ذاتی ہے کہ یہاں تجلیاتِ ذاتی کا ظہور ہوتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے جو بیت اللہ تعمیر کیا تھا وہ ایک مستطیل عمارت تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے بچپن میں جب قریش نے بیت اللہ تعمیر کیا تو اس پوری مستطیل عمارت پر چھت ڈالنے کے لیے سرمایہ اکٹھا نہ ہو سکا چنانچہ انہوں نے کچھ حصّے پر چھت ڈال دی اور کچھ حصّہ چھت کے بغیر رہنے دیا۔ جو حصّہ چھوڑ دیا اس کے گرد دیوار بنا دی اس حصّے کو حطیم کہتے ہیں۔ یہ بھی بیت اللہ کا حصّہ ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے جو بیت اللہ تعمیر فرمایا تھا وہ حطیم اور بیت اللہ سمیت ایک مستطیل عمارت تھی جس کی چھت نہیں تھی۔ اس کے دو دروازے تھے ایک داخل ہونے کا اور ایک خروج کے لیے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے تک یہ عمارت سلامت رہی اس کا طواف ہوتا رہا حج ہوتا رہا لیکن نوح علیہ السلام کے زمانے میں جو طوفان آیا اس میں بیت اللہ کی عمارت اٹھا لی گئی اور حجرِ اسود کو اللہ نے محفوظ کر لیا۔ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے سے لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے تک بیت اللہ کی عمارت نہیں تھی بلکہ وہاں ایک ڈھیری سی بن گئی تھی جس کے اوپر وہ جگہ تھی جہاں بیت اللہ تھا۔ جو قومیں عذاب میں مبتلا ہو کر تباہ ہو گئیں اُن کے انبیاؑ ہجرت کر کے بیت اللہ چلے جاتے اور وہیں رہائش پذیر ہو جایا کرتے تھے۔ بہت سے انبیاؑ کا یہیں وصال ہوا اور یہیں مدفون ہوئے۔ قدرتی طور پر ہواؤں نے اُن کے اجسادِ مبارکہ کو مٹی سے ڈھانپ دیا اور دفن کر دیا۔ زمین بھرتے بھرتے برابر ہو گئی حالانکہ ایک اچھی بھلی پہاڑی تھی جس پر بیت اللہ تھا لیکن اب وہ برابر ہو گئی ہے۔ حضرت مولانا اللہ یار خانؒ فرماتے تھے کہ مطاف کے نیچے نوّے سے زائد انبیاؑ جلوہ افروز نظر آتے ہیں۔ یہ وہ حضرات تھے جن کا وہاں وصال ہوا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے لڑکپن میں بیت اللہ کی تعمیر کے دوران حجرِ اسود رکھنے پر جھگڑا ہوا اور قبائل لڑنے پر آ گئے۔ ہر کوئی یہی چاہتا تھا کہ اس کا قبیلہ حجرِ اسود کو رکھنے کی سعادت پائے اور اُن کا سردار اسے نصب کرے۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ کل جو پہلے بیت اللہ میں داخل ہوگا وہ اس کا فیصلہ کرے گا۔ اگلے روز بیت اللہ میں سب سے پہلے داخل ہونے والے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس معاملے کا فیصلہ فرما دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی چادر مبارک بچھا دی اور حجرِ اسود کو اس کے درمیان میں رکھ دیا اور تمام قبائل کے سرداروں کو طلب فرمایا اور اُن سے کہا کہ چادر کو اوپر اٹھا کر اس سطح تک لے آئیں جہاں حجرِ اسود کو نصب کرنا تھا۔ جب چادر وہاں تک بلند ہو گئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے مبارک ہاتھوں سے اٹھا کر خود نصب فرمایا۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے یہ عمارت چوکور بنی تھی اور حطیم کو چھوڑ دیا گیا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے اُمّ المومنین حضرت عائشہ الصدیقہ رضی اللہ عنہا سے

ایک مرتبہ فرمایا کہ اگر قوم کے بارے مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں اور یہ پریشان ہوں گے تو میں بیت اللہ کی اس چوکور (ہیئت) کو ہٹا کر اسے اسی طرح مستطیل بنا دیتا جس طرح آدم علیہ السلام نے بنایا تھا۔

قریش نے جب بنایا تو انہوں نے دروازہ اونچا کر دیا اور پیچھے کا دروازہ ختم کر دیا تاکہ جس کو چاہیں داخل ہونے کی اجازت دیں اور جسے چاہیں روک دیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے دورِ خلافت کے بعد جب حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی مکہ مکرمہ پر 73ھ تک حکومت رہی تو اس میں انہوں نے بیت اللہ کو شہید کر کے پھر سے مستطیل بنا دیا اور اس میں پہلے کی طرح دو دروازے بنا دیے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی خواہش بھی اُن کی سنت ہے اور چونکہ اب پہلے والا عذر نہیں رہا کہ نو مسلم پریشان نہ ہوں چنانچہ اب اس پر عمل ہونا چاہیے۔

73ھ میں عبدالملک بن مروان کے دورِ حکومت میں حجاج بن یوسف نے مکہ مکرمہ پر حملہ کیا جس میں عبداللہ ابن زبیرؓ حرم میں لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ بیت اللہ کی عمارت کو حجاج بن یوسف کی منجنیقوں نے نقصان پہنچایا، ہڈیاں اور پتھر پھینکے گئے تو مجروح ہو گیا، پردہ مبارک جل گیا۔ اس کے بعد حجاج بن یوسف نے بیت اللہ کو شہید کر کے پھر سے چوکور بنا دیا، دروازہ اونچا کر دیا اور حطیم کو چھوڑ دیا، یہ کہہ کر کہ زبیرؓ نے اس پہ تصرف کیا تھا۔

بعد میں عبدالملک کو پتا چلا تو اس نے حجاج بن یوسف کو کہا کہ تم نے غلط کیا ہے زبیرؓ نے صحیح کیا تھا۔ یہ معاملہ دینی تھا ہمارا اُن سے سیاسی اختلاف ضرور ہے دینی نہیں۔ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی خواہش کے مطابق مستطیل بنا کر صحیح کیا تھا جبکہ تم نے غلط کیا ہے۔ عبدالملک نے ارادہ کیا کہ وہ کعبہ کو پھر سے شہید کر کے اسے مستطیل بنا دے تو علما نے روک دیا کہ اب اسے نہ چھیڑا جائے کہ اللہ کو ایسا ہی منظور تھا۔ اگر اب اسے شہید کیا گیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ ہر بادشاہ اسے توڑنا شروع کر دے۔ کوئی چوکور بنائے بعد میں آنے والا گرا کر مستطیل بنا دے تو اسے بادشاہوں کے لیے بازیچہ اطفال نہ بنایا جائے۔ چنانچہ کعبہ کو اسی حال میں رہنے دیا گیا۔

طواف سے متعلق ایک مسئلہ:

حطیم چونکہ بیت اللہ کا حصہ ہے اس لیے طواف حطیم کے باہر کیا جاتا ہے۔ دورانِ طواف اگر کوئی حاجی حطیم کی دیوار پر اپنا ہاتھ رکھ دے تو کہا جاتا ہے کہ اس کا طواف خراب ہو گیا اس لیے کہ اس کا ہاتھ بیت اللہ کے اندر چلا گیا جبکہ طواف بیت اللہ کے گرد کرنا ہے اندر نہیں کرنا۔

ابراہیم علیہ السلام، اللہ کے عظیم پیغمبرؑ:

حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے وہ عظیم پیغمبر تھے جن کی ساری زندگی انتہائی کٹھن مجاہدوں میں گزری۔ سب سے پہلے توحید باری پر والد سے اختلاف ہوا، قوم سے اختلاف ہوا اور پھر شہنشاہ جو خود کو خدا کہلواتا تھا اس سے بھی اختلاف ہوا۔ چنانچہ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈال دیا لیکن اللہ کریم نے آگ سے حفاظت فرمائی اور آپ علیہ السلام دوسری جگہ ہجرت فرما گئے، دوران ہجرت سفر کی صعوبتیں برداشت کیں۔ پردیس میں گھر بسانا پڑا پھر بڑھاپے میں اسمٰعیلؑ جیسا فرزند نصیب ہوا تو اس کو قربان کرنے کا حکم ملا۔ الغرض اُن کی ساری زندگی آزمائش میں گزری اور آپؑ اللہ کا شکر ادا کرتے رہے۔ اس عظیم ہستی کو اللہ کریم فرماتے ہیں ہم نے بیت اللہ کی جگہ بتا دی یعنی بیت اللہ کو پانا بندۂ مومن کے لیے بہت بڑی عظمت ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اتنی مشقتوں کے بعد ملا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو وہ جگہ بتائی اور حکم دیا کہ معصوم بچے کو والدہ کے ہمراہ وہاں ویرانے میں چھوڑ آئیں تو آپؑ نے حکم پورا کیا۔ اللہ کریم نے فرمایا کہ جب ہم نے بیت اللہ جیسی نعمت کی جگہ بتا دی تو اب: اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِیْ شَیْـًٔا۔۔۔ کسی کو میرے ساتھ شریک مت کرنا۔ کبھی میری ذات میں یا صفات میں کسی کو شریک کرنے کا خیال بھی نہ آنے پائے، رائی کے دانے کے برابر بھی شرک نہ کیا جائے۔

دیکھا گیا ہے کہ ذاتِ باری میں کم ہی شرک ہوتا ہے، لوگ صفاتِ باری میں زیادہ شرک کر لیتے ہیں۔ اللہ کریم فرماتے ہیں میری ذات میں، میری کسی صفت میں کسی کو شریک نہ کرو۔ ایک واقعہ ضمناً عرض کر دوں، ہمارے گاؤں میں ایک بزرگ تھے جو کسی پیر صاحب کے مرید تھے۔ اُن کے پیر صاحب کا وصال ہو چکا تھا، اللہ کے نیک بندے ہوں گے لیکن ان مرید صاحب کی عقیدت کا انداز درست نہیں تھا۔ ان صاحب نے ایک گدھی رکھی ہوئی تھی جو بہت قیمتی تھی۔ گرمیوں میں عموماً جب گندم کی فصل اٹھالی جاتی ہے اور اگلی فصل ابھی کاشت نہیں ہوتی تو لوگ اس مدت میں اپنے مویشیوں کو آوارہ پھرنے دیتے ہیں۔ اُن صاحب نے بھی اپنے مویشی کھول رکھے تھے جن میں اُن کی وہ قیمتی گدھی بھی شامل تھی۔ شام ہوئی تو مویشی تو لوٹ کر آ گئے لیکن وہ گدھی نہ آئی چنانچہ چند نوجوان لڑکے اس کی تلاش میں نکل گئے اور ادھر اُدھر دیکھ کر عشاء کے وقت واپس آ گئے اور انہیں خبر دی کہ گدھی نہیں ملی۔ وہ کہنے لگے کہ تم جا کر سو جاؤ میرے حضرت صاحب تلاش کر کے لے آئیں گے، تم فکر نہ کرو میرے پیر صاحب تلاش کر لیں گے۔ یہ تھی اُن صاحب کی اپنے پیر سے عقیدت۔ ایسی عقیدت چھوٹا سا شرک بن جاتا ہے۔ بابا جی کو چاہیے تھا، کہتے کہ اللہ کریم ہمارے مال کو ہم تک پہنچا دے گا اُسے ضائع نہیں کرے گا تو کتنی خوبصورت بات ہوتی!

اللہ کریم فرماتے ہیں: اَنۡ لَّا تُشۡرِكۡ بِىۡ شَيۡـئًا ۔۔۔ میری کسی صفت میں میری ذات میں کسی کو شریک مت کرو۔ رزق دینا، حفاظت کرنا، تمہارا مال تم تک پہنچانا، یہ میرا کام ہے۔ یاد رہے پیر کا کام ہمارے جان و مال کی حفاظت کرنا نہیں ہے وہ اللہ کا کام ہے۔ پیر کا کام ہے اللہ کی راہ دکھانا۔ ہمارے عقائد میں جو کجی ہے اُسے نکال کر سیدھا کر دے اور ہمارے کردار میں جو ٹیڑھا پن ہے اُسے نکال کر سیدھا کر دے۔ اس کے علاوہ ہمیں پیر سے کچھ نہیں لینا۔ جو لینا ہے اللہ ربّ العزت سے لینا ہے۔ پیر وہ ہوتا ہے جو خود واصل باللہ ہو اور دوسروں کو وصولِ حق کی طرف لے جا سکے۔ روزی دینا پیر کا کام نہیں ہے وہ تو خود مخلوق ہے اور تمام مخلوق اللہ سے مانگ کر کھا رہی ہے، دوسروں کو کیا دے گی، کبھی مانگنے والا بھی کسی کو کچھ دیتا ہے؟ سو فرمایا، میرے ساتھ رائی کے برابر بھی شرک نہ کرو کہ کم سے کم شرک جس کا تصور کیا جا سکتا ہے وہ بھی قابلِ قبول نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے: وَّطَهِّرۡ بَيۡتِىَ لِلطَّآئِفِيۡنَ وَالۡقَآئِمِيۡنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوۡدِ۞ میرے اس گھر کو طواف کرنے والوں اور (نماز میں) قیام اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے (حسّی اور معنوی طور پر) پاک رکھنا۔

دل کی طہارت کا بھی اہتمام کرو:

فرمایا، میرے گھر کو ہر قسم کی نجاست سے پاک رکھو، وہ عقیدے کی ہو یا عمل کی، ہر طرح کی نجاست سے بیت اللہ کو پاک رکھو۔ اسی لیے وہاں کافر کا داخلہ منع ہے کہ اس میں عقیدے کی نجاست ہے۔ اسی طرح کوئی ظاہری نجاست بھی وہاں نہیں ہونی چاہیے۔ باطنی نجاست لے کر جانا بھی منع ہے۔ عمرہ، حج کرنے والے حجاج کرام کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ دل میں نجاستیں ہوں تو بیت اللہ جا کر کچھ نہیں ہوتا۔ وہاں جانے سے پہلے دل کی نجاستیں صاف کریں اور عمرہ ادا کرنے کو رسم نہ بنائیں کہ سال میں دو عمرے کر لیے لیکن رہے ویسے کے ویسے ہی۔ بیت اللہ جانے سے پہلے اپنی سوچوں تک کو صاف کرو، اپنے ارادوں کو صاف کرو، عمل کی تطہیر کرو اور پھر بیت اللہ میں داخل ہو کہ اللہ کریم فرما رہے ہیں کہ میرے گھر کو صاف رکھو یہاں کسی طرح کی نجاست نہ آنے پائے۔

ہر مسلمان کی آرزو یہی ہوتی ہے کہ اس کا دل اللہ کا گھر بن جائے اس میں اللہ بس جائے اللہ فرماتا ہے پھر اسے صاف رکھو، پاک رکھو۔ اسے بغض، نفرتوں اور لالچ سے پاک رکھو۔ اس میں کسی سے برائی کرنے کے خیال تک سے بچو، کسی سے کچھ چھین لینے کا خیال تک نہ لاؤ۔ تمام برائیاں دل سے نکالو، اسے پاک رکھو اور اس کا علاج بھی دے دیا فرمایا: اَلَا بِذِكۡرِ اللّٰهِ تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡبُ ؕ۞ (الرعد:28) خوب سمجھ لو کہ دل اللہ کے ذکر سے سکون پاتے ہیں۔ یہ بھی بڑی عجیب بات ہے کہ یہ نہیں فرمایا کہ دل اللہ کے ذکر سے روشن ہو جاتے، پاک ہو جاتے ہیں بلکہ فرمایا کہ سکون

پاتے ہیں۔اس لیے کہ ہر خرابی ایک کانٹا ہے جو دل کو بے قرار کرتی ہے۔اگر ایک چھوٹا سا کانٹا ہاتھ یا پیر میں چبھ جائے تو ہمیں بے قرار کر دیتا ہے۔اسی طرح ہر برائی دل میں کانٹے کی طرح چبھتی رہتی ہے اُسے بے قرار کر دیتی ہے، دل تڑپتے رہتے ہیں جلتے رہتے ہیں اور پریشان ہوتے رہتے ہیں۔آج جس سے پوچھو وہ کہتا ہے دل بڑا پریشان ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ اس میں کانٹے چبھے ہوئے ہیں، یہ تمہارے ارادوں کے، تمہارے کردار کے، تمہاری خواہشوں کے کانٹے ہیں۔اللہ کریم فرماتے ہیں اسے پاک رکھو اس میں صرف اللہ ہو اور کچھ نہ ہو تو سکون پا جائے گا۔بیت اللہ جب جاؤ تو بیت اللہ کو صاف رکھو اس میں گندگی نہ ہو۔اب بیت اللہ میں ظاہر ہے کہ کوئی باہر سے گندگی، پتھر یا کوئی کچھرہ اٹھا کر تو نہیں ڈالے گا نہ ہی ساتھ لے کر جائے گا البتہ اگر دل پتھر ہوں، میلے ہوں اُن میں کچرہ ہو تو وہ بھی اللہ کریم کو پسند نہیں۔اللہ کریم سب مسلمانوں کو وہاں کی حاضری نصیب کریں۔عمرہ یا حج پر جانے والے یہ خیال رکھیں کہ اللہ کا حکم ہے کہ میرے گھر کو پاک رکھو اور کوئی رائی کے برابر شرک کا بھی تصور نہ کرو۔

اللہ کریم نے آواز پہنچا دی:

فرمایا: وَاَذِّنۡ فِی النَّاسِ بِالۡحَجِّ ۔۔۔اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دیجیے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرمایا کہ لوگوں کو حج کی دعوت دیں۔عرض کی بارالٰہا! اس ویرانے میں جہاں میں نے اہلیہ اور بچے کو چھوڑا پھر آپ نے ایک قبیلے کو یہاں بسا دیا۔یہاں لوگ بستے ہیں مگر دور دور فاصلوں پر مکان ہیں۔میں آواز لگاؤں گا تو اذان سے زیادہ بلند تو نہیں ہو گی تو اس ویرانے میں کون سنے گا، کون آئے گا؟ فرمایا آپ (علیہ السلام) پکاریئے آواز پہنچانا میرا کام ہے۔

آج تو انسان نے خود ایسے اسباب ایجاد کر لیے ہیں اس لیے مانتا ہے کہ سیٹلائٹ کے ذریعے ایک آن میں آواز کو روئے زمین پر پھیلایا جا سکتا ہے۔انسان نے آج ایسا کر لیا ہے تو وہ جو سب کا خالق ہے اس نے صدیوں پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا کہ آپ آواز لگایئے ہر بندے تک پہنچ جائے گی۔مفسرینِ کرام لکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آواز اللہ کریم نے صرف دنیا تک ہی نہیں پہنچائی بلکہ عالمِ ارواح میں بھی پہنچائی۔ عالمِ رواح میں جس روح نے کہا 'لبیك اللّٰھُمَّ لبیك' اس کو حج نصیب ہو گا اور جس نے یہ نہیں کہا اُسے حج نصیب نہیں ہو گا۔اب یہ حاجی کو احساس ہونا چاہیے کہ میری روح تک اللہ کریم نے آواز پہنچائی اور میں ہزاروں سال بعد دنیا میں آیا اور میری وہ لبیک مجھے بیت اللہ لے کر جا رہی ہے۔کہیں میں بیت اللہ میں کوئی برائی تو نہیں لے کر جا رہا؟ اپنے دل میں یا عمل میں کوئی خرابی تو نہیں لے کر جا رہا۔حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آواز لگائی اور اللہ نے عالمِ ارواح تک

پہنچا دی اور زمین پر بھی ہر طرف پہنچا دی۔ پہلے زمانے میں تو لوگ اعتراض کرتے تھے کہ آواز ساری زمین تک کیسے پہنچ سکتی ہے۔ اتنا نہیں سوچتے کہ جو زمین پر ساری مخلوق پیدا کر سکتا ہے، ساری زمین پر بارش برسا سکتا ہے کیا وہ ساری زمین پر آواز نہیں پہنچا سکتا!

اللہ کریم نے فرمایا آپ علیہ السلام پکاریئے تو سہی، یَأْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّأْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ﴿٢٧﴾ لوگ (حج کے لیے) آپ کے پاس پیدل (بھی) اور دُبلے دُبلے اونٹوں پر جو دور دراز راستوں سے چلے آتے ہوں آ موجود ہوں گے۔ چنانچہ اب تک مخلوق وہاں جمع ہو رہی ہے۔ الحمدللہ۔

حقیقی فائدہ:

فرمایا، لوگ دور دراز سے کمزور سواریوں پر گرتے پڑتے پیدل، مختلف ذرائع سے پہنچیں گے تاکہ: لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ۔۔۔ وہ اپنے حقیقی منافع کے لیے حاضر ہوں یعنی بیت اللہ کی حاضری یہ ہے کہ بندہ وہاں سے آخرت لے کر لوٹے، حقیقی منافع لے کر آئے۔

ایک فقہی مسئلہ:

اس ضمن میں ایک فقہی مسئلہ بھی آ گیا کہ حج پر کوئی آتا ہے اور کاروبار کرتا ہے تو کیسا ہے؟ اگر کوئی حج پر حج کی نیت کر کے جاتا ہے اور مقدم حج کو رکھتا ہے اور ضمنی طور پر کوئی چیز خرید لیتا ہے یا بیچ دیتا ہے تو کوئی حرج نہیں ہے جو جاتا ہی خرید و فروخت کے لیے ہے کہ وہاں سے کچھ خرید لاؤں گا یہاں اپنے ملک میں بیچ دوں گا ساتھ حج بھی ہو جائے گا تو یہ غلط ہے۔

ایک مرتبہ ایسے ایک شخص سے ملاقات ہوئی مکہ مکرمہ میں جو کھلونوں کی دکان پر کھڑا تھا میں وہاں سے گزرا تو سوچا بچوں کے لیے کوئی کھلونا لے لیا جائے تو وہ مجھ سے کہنے لگا بہت سے کھلونے خرید لیں۔ میں نے کہا کہ میں اتنے کھلونوں کا کیا کروں گا؟ کہنے لگا میں بھی لے رہا ہوں میں ہر سال آتا ہوں اور یہاں سے بہت سارے کھلونے لے جاتا ہوں پاکستان میں بہت مہنگے داموں ملتے ہیں اس طرح میرے سارے اخراجات نکل آتے ہیں اور پیسے بچ بھی جاتے ہیں۔ یعنی جانے کا مقصد اگر یہ ہو کہ وہاں سے مالِ تجارت لے آئیں گے اور اخراجات اور منافع کا بندوبست ہو جائے گا تو یہ حج نہیں ہوتا۔ نیت خالص حج کی ہو، مقدم حج ادا کرنا ہو اور تمام ارکان بہت احتیاط سے ادا کرے، ضمناً پھر کوئی چیز اگر پاس ہے تو بیچ دے یا خرید لے تو اس کا کوئی حرج نہیں ہے۔ ایسا منافع جائز ہے۔

حج اور ذکر اللہ:

فرمایا: وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ۔۔۔ اور اصل بات ہے کہ اللہ کے نام کا ذکر کرتے ہیں ان خاص دنوں میں جو اللہ نے ان کو عطا فرمائے ہیں۔ اللہ کریم کا یہ احسان ہے کہ جب لوگ وہاں حاضر ہوتے ہیں تو اللہ کی یاد کا اجر کئی گنا بڑھ جاتا ہے بیت اللہ سے باہر یا ایامِ حج کے علاوہ جو اللہ کی عبادت کرتے ہیں، اللہ کا ذکر کرتے ہیں اس میں بھی ذکرِ اسمِ ذات ہے اور حج میں بھی ذکرِ اسمِ ذات کا حکم ہے۔ فرمایا: وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ۔۔۔ اللہ کے نام کا ذکر کرو۔ کچھ لوگوں کو یہ خلجان ہوتا ہے کہ قرآن میں اللہ کے ذاتی نام کے ذکر کا حکم کہاں ہے؟ قرآن تو اللہ کے ذاتی نام کے ذکر کے حکم سے بھرا پڑا ہے اسی آیت کو دیکھ لیں اس میں اسمِ ذات کا ذکر کرنے کا حکم آ گیا۔ فرمایا، اللہ کے نام کا ذکر کرتے رہو۔ بیت اللہ میں ایک مرتبہ اللہ کہنا باہر ایک لاکھ مرتبہ اللہ کہنے سے اجر میں بڑھ جاتا ہے۔ بیت اللہ میں ادا کی گئی ایک فرض نماز باہر ادا کی گئی ایک نماز سے لاکھ گنا زیادہ اجر پاتی ہے۔ ایسے ہی نوافل کا اجر بھی لاکھوں گنا زیادہ نصیب ہوتا ہے۔ ایک ریال کی خیرات کا ثواب باہر کیے گئے ایک لاکھ ریال کی خیرات سے زیادہ ثواب دلاتا ہے۔ یہ وہ منافع ہے جو لوگوں کو وہاں کمانا ہے اور وہ اس لیے آتے ہیں۔ اب اگر بندہ میلا کچیلا دل وہاں لے جائے جس میں دنیا ہی بستی ہو اور وہاں سے خالی ہاتھ لوٹے تو بڑا بدنصیب ہے۔

حج پر جانے والوں کو، عمرے پر جانے والوں کو یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ انہیں وہاں کیا کرنا ہے اور وہاں سے لانا کیا ہے۔

تاکیدِ مکرر:

فرمایا: عَلٰي مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَاۗىِٕسَ الْفَقِيْرَ ﴿۲۸﴾ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۲۹﴾ اور اُن چوپایوں پر (بوقتِ ذبح) اللہ کا نام لیں پس اس میں سے خود بھی کھاؤ اور محتاجوں کو بھی کھلاؤ۔ اللہ کے نام کا دوسروں کو بھی دو۔ ایک تاکید پھر ارشاد ہو رہی ہے کہ: ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ۔۔۔ لوگوں کو چاہیے کہ اپنے میل کچیل دور کریں گویا پھر سے تاکید کی جا رہی ہے کہ محض بیت اللہ آنے کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ وہ آئے جو دنیا کی دولت کمانے کی بجائے، بانٹنے آئے۔ جسے یہ توفیق ہو اُسے چاہیے کہ اپنے کھانے کا اہتمام بھی کرے اور جہاں کوئی بھوکا فقیر ہو اُسے بھی کھلائے اور چاہیے یہ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ۔۔۔ کہ ہر طرح کی نجاست سے جان چھڑا کر آئے۔ وہاں جانے والا ہر حاجی کپڑے تو پاک لے ہی جاتا ہے، جوتے بھی صاف اور خاص پہن لیتا ہے تو پھر یہ کون سے میل کچیل کو صاف کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے؟

فرمایا حقیقی میل اگر عقیدے میں ہے تو اُسے صاف کرو اگر کردار میں ہے تو اُسے صاف کرو اگر افکار میں ہے تو اُسے صاف کرو اگر دل میں ہے تو اُسے صاف کرو۔ جب یہاں آئے ہو اور مقصد تجلیات باری سے حصّہ لینا ہے تو پھر برتن تو صاف کر کے آؤ۔

اگر کوئی غلیظ برتن لے کر جائے اور کسی کو کہے کہ اس میں دودھ ڈال دو تو دینے والا بھی سوچے گا کہ دودھ اور اس ناپاک برتن میں۔ یہ کیسے ممکن ہے! بیت اللہ جانے والے کو سوچنا چاہیے کہ وہ چاہتا تو یہ ہے کہ اُسے تجلیاتِ باری نصیب ہوں لیکن دل میں حسد، بغض، کینہ، حرص، تکبر، ریا اور نہ جانے کیا کیا خباثتیں بھر رکھی ہیں۔ سو فرمایا کہ ہر طرح کی ناپاکی سے الگ ہو جاؤ کسی طرح کی بھی غلاظت نہ رہے۔ وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ ۔۔۔ جو نذریں کی ہیں، اللہ سے جو وعدے کیے ہیں وہ پورے کرو جو نذریں مانی ہیں وہ پوری کرو اور پاک صاف ہو کر وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ﴿٢٩﴾ اللہ کے گھر کا طواف کرو، اس کے گھر کے گرد چکر لگاؤ۔ پھر دیکھو تمہیں کیا سرور ملتا ہے، تمہیں کیا قربِ الٰہی نصیب ہوتا ہے، دیکھو تم پر کیسی کیفیات وارد ہوتی ہیں!

ہمارا عالم یہ ہے کہ ہم باقی سب کر لیتے ہیں، طواف بھی کر لیتے ہیں لیکن ہماری توجہ عقیدے، نظریے اور کردار کی خرابی، افکار کی خرابی کی طرف نہیں ہوتی۔ ہم نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ میں بیت اللہ تو آ گیا ہوں لیکن اللہ کے ساتھ میرا عقیدہ کیا ہے، کیا میں اللہ ہی کو ربّ العالمین سمجھتا ہوں یا لوگوں کو حاجت روا سمجھتا ہوں۔

ہمارے ملک میں لوگوں نے ایک رواج بنا رکھا ہے کہ افسران سرکاری خرچے پر حج کرنے جاتے ہیں۔ یہ سرکاری خرچہ کیا ہے؟ یہ ماوشما، غریب جو حکومت کو ٹیکس دیتے ہیں جو کیس کروڑ عوام کی امانت ہے، یہ سرکاری خرچہ ہے۔ جو اس پرائے رزق کو اڑانے وہاں جائیں گے وہ وہاں سے کیا پائیں گے؟ سرکاری خرچ پر جانے والو! یہ پیسے غریبوں کے، عوام کے ہوتے ہیں۔ وہاں جا کر پکارتے رہنا 'لبیك لبیك'، کوئی جواب نہیں آئے گا۔ جیسے گئے ہو اس سے بدتر ہو کر واپس آ جاؤ گے۔ جو کبر جاتے ہوئے تھا۔ دس گنا، سو گنا، لاکھ گنا ہو چکا ہو گا لہٰذا یہ بہت ضروری ہے کہ اپنی محنت کی حلال کمائی سے جاؤ۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی حدیث مبارکہ کا مفہوم ہے کہ ایک شخص بڑا لمبا سفر طے کر کے بیت اللہ آئے گا۔ اس کا لباس خاک آلود ہو گا، بال خاک آلود ہوں گے بدن تھکاوٹ سے چور چور ہو گا طواف کرے گا، تلبیہ پکارے گا لبیك اللھم لبیك، لیکن اُسے کوئی جواب نہیں آئے گا۔ عرض کی گئی، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم! اتنی مشکل سے وہ وہاں پہنچے گا اور اتنے درد سے پکارے گا تو جواب کیوں نہیں آئے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا اس کا لباس

حرام کا ہوگا، اس کا کھانا حرام کا ہوگا اس کا پینا حرام کا ہوگا اس لیے اُسے کوئی جواب نہیں ملے گا۔

فرمایا، ساری شرائط پوری کر کے اپنے کھانے کا اہتمام کرو اور ساتھ غریبوں کو بھی دو۔ اپنے اندر سے ناپاکیاں دور کر کے خود کو صاف کرلو پھر اپنی نذریں پوری کرو اور پھر اللہ کے گھر کا طواف کرو پھر تمہیں پتا چلے گا کہ حج کیا ہوتا ہے، اس سے کیا ملتا ہے، عمرے سے کیا ملتا ہے! اس زمین کے ٹکڑے میں کیا ہے، اس پتھر کے مکان میں کیا فضیلت ہے! یہاں اللہ کریم کی تجلیات کیسی ہیں! یہ سارا اہتمام کرو تو پھر یہ نعمتیں پاؤ گے۔

رخصت اور عزیمت دونوں پر عمل ضروری ہے:

یہ مزے کی بات ہے کہ جن پر حج فرض نہیں ہے انہیں حج پر جانے کا شوق ہے اور جن پر فرض ہے اُن کے پاس فرصت نہیں ہے۔ جن لوگوں پر فرض نہیں ہے انہیں چاہیے کہ یہاں جو فرائض ان کے ذمے ہیں وہ پورے کریں۔ اللہ کریم یہاں حج کا ثواب دینے پر قادر ہیں۔ اجر کسی خاص زمین سے منسلک نہیں ہے۔ حج پر جانے کی استطاعت اگر رزقِ حلال سے نصیب نہیں ہے تو جو نماز روزہ اس پر فرض ہے۔ والدین، بیوی، بچوں کے حقوق فرض ہیں، قوم و ملک سے وفاداری ہے یہ پورے کرلے، لیکن وہ کہتا ہے کہ ان کی خیر ہے بس کسی طرح حج پر چلا جاؤں۔ کیا اس کو یہ گمان ہے کہ اس کے نہ جانے سے کعبہ ویران پڑا ہے یہ جائے گا تب ہی آباد ہوگا؟ اللہ کے احکام کی پابندی ضروری ہے، رخصت اور عزیمت دونوں پر عمل ضروری ہے۔ مثلاً رمضان میں بعض لوگوں کو رخصت حاصل ہے کہ وہ روزہ نہ رکھیں۔ کوئی ضعیف العمر ہے، معذور ہے، دائم المریض ہے تو انہیں یہ رعایت حاصل ہے کہ وہ فدیہ ادا کریں اور روزہ نہ رکھیں۔ جس کی صحتمند ہونے کی امید ہو وہ بعد میں روزہ رکھے۔ لوگوں کو وہم ہوتا ہے کہ اگر روزے چھوٹ گئے تو ہم مارے گئے۔ بھئی کہاں مارے گئے چھوڑنے کی اجازت بھی تو اسی نے دی ہے جس نے رکھنے کا حکم دیا ہے۔ اللہ کی اطاعت مقصود ہے عزیمت میں بھی اور رخصت میں بھی کہ اسی نے رخصت دی ہے لہٰذا مریض ہے تو قضا کرے اور اگر ایسا مرض ہے کہ صحتمند ہونے کی امید نہیں، بزرگ ہے تو فدیہ ادا کر دے، اجر مل جائے گا۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم رسمیں پوری کریں۔

سفر میں نماز کے فرض آدھے ہو جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک شخص کہنے لگا کہ اس کے پاس ایر کنڈیشنڈ گاڑی ہے ڈرائیور ہے چنانچہ وہ جب سفر پر نکلتا ہے تو وہ نہایت آرام سے بیٹھا ہوتا ہے لہٰذا وہ چار کی بجائے آٹھ رکعت پڑھتا ہے۔ اُسے بتایا کہ اللہ کریم نے دو ہی فرض کیے ہیں دو کی چھٹی دی ہے تو وہاں چھٹی کرنا ہی عبادت ہے۔

حکومت جب چھٹیاں دیتی ہے تو لطف اندوز نہیں ہوتے؟ پھر کیوں نہیں کہتے کہ ضرور دفتر جاؤں گا جبکہ دفتر

بند ہے۔ حکومت کی چھٹیوں پر عمل کر کے خوش ہوتے ہو تو اللہ کی چھٹیوں پر عمل کر کے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ جو کھڑا ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتا اللہ نے اسے اجازت دی ہے کہ بیٹھ کر پڑھ لے۔ بیٹھ کر پڑھنے سے بھی اسے اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا کھڑے ہو کر پڑھنے والوں کو ملے گا۔ اس میں افسوس کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اللہ کی دی ہوئی رخصتوں پر عمل کرنا بھی اتنی ہی اطاعت ہے جتنی اس کی دی ہوئی عزیمت پر عمل کرنا ہے۔

احکام شرعی کا احترام، اللہ کے ہاں پسندیدہ ہے:

فرمایا: ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ يُعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ۔۔۔ جو شخص اللہ کی حرمتوں کی تعظیم کرے تو یہ اس کے پروردگار کے نزدیک اس کے لیے بہت بہتر ہے۔ جو اللہ کریم کی مقرر کردہ چیزوں کا احترام کرتا ہے اور اس لیے کرتا ہے کہ یہ اللہ کا حکم ہے تو اللہ کے نزدیک یہ اس کے لیے بہت بہتر بات ہے کہ آخر اُسے لوٹ کر اپنے ربّ کریم کے پاس ہی جانا ہے اور جب ربّ العالمین کی بارگاہ میں حاضر ہوگا تو اطاعت کا انعام پائے گا۔ احکامِ شرعی جتنے بھی ہیں اُن میں یقیناً مادّی اور دنیوی فوائد بھی موجود ہیں۔ مثلاً نماز ادا کرنے والے کے سارے بدن کی، پاؤں کی انگلیوں سے لے کر گردن، آنکھوں تک کی ورزش ہو جاتی ہے لیکن یہ سب ضمنی فوائد ہیں۔ اگر کوئی اس غرض سے نماز پڑھے کہ اس کی ورزش ہو جائے گی تو اس کی نماز نہیں ہوگی۔ اللہ کریم کے ہر حکم میں بے شمار دنیوی فوائد بھی ہیں لیکن اطاعت اس لیے کرنی چاہیے کہ یہ اللہ کا حکم ہے اور زائد فوائد اللہ کریم کے انعامات ہیں۔ مومن کے لیے کسی کام کے کرنے کی بنیادی بات یا دلیل یہ ہے کہ یہ اللہ کا حکم ہے، میرے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے مجھے پہنچایا ہے اور یہی طریقہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے مجھے سکھایا ہے۔ ہر کام کی بنیادی دلیل یہی ہے کہ وہ کام اللہ کا حکم ہونا چاہیے، اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف سے مقرر ہونا چاہیے۔

بدعت گمراہی ہے:

یہاں سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ بعض امور ہم اپنی طرف سے بڑھا لیتے ہیں کہ یہ بھی ثواب ہے تو یہ دین میں دخل اندازی ہو جاتی ہے۔ جو کام شریعت، سُنّت سے ثابت نہیں اُسے ثواب قرار دینا، اُسے باعثِ ثواب سمجھ کر کرنا بہت زیادتی کی بات ہے اور گناہ ہے۔ اسی عمل کو بدعت کہتے ہیں۔ جیسا کہ ارشادِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام ہے كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٍ وَ كُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّار (متفق علیہ) ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں لے جائے گی۔

دین کے معاملے میں بنیادی شرط یہ ہے کہ دین مُنَزَّلْ مِنَ اللہ ہے اور پوری زندگی کا نصاب ہے۔ ہر کام کے کرنے کا طریقہ شریعت میں، سُنّت میں موجود ہے اور مومن کے پاس کسی بھی کام کے باعثِ ثواب

ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے۔ ورنہ یہ کیا بات ہے کہ پتھروں کا بنا ہوا ایک مکان ہے جس کے گرد چکر لگائے جاتے ہیں۔ اتنا سفر کر کے اتنے اخراجات اٹھائے جاتے ہیں۔ سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے وہاں جاتے ہیں۔ آخر وہاں کیا ہے؟ پتھروں کا ایک مکان ہے جس کے گرد گھوم رہے ہیں، اس سے کیا ہوگا؟ ایسا کرنے کی دلیل ہے: وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ﴿٢٩﴾ اور خانہ کعبہ کا طواف کریں کہ اسے اللہ نے مقرر کر دیا ہے اور یہاں حاضری کا حکم دیا ہے کہ جسے توفیق ہو وہ اللہ کے لیے اس کے گھر کے چکر لگائے لہٰذا ہم طواف کر کے اللہ کریم کی اطاعت کر رہے ہیں۔

حِلّت وحرمت:

جانور بھی اُسی کی مخلوق ہیں انہیں وجود اُس نے دیا، ذی روح بنایا، پیدا وہ کرتا ہے، غذا وہ دیتا ہے انہیں پالتا ہے لیکن تمہاری خدمت میں دے دیے ہیں۔ کسی پر سواری کرتے ہو کسی کو ہل میں جوتتے ہو، کسی سے مزدوری کراتے ہو اور کسی کو ذبح کر کے کھاتے ہو۔ فرمایا: وَأُحِلَّتْ لَكُمُ الْأَنْعَامُ إِلَّا مَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ ۔۔۔تمہارے لیے مویشی حلال کر دیے گئے ہیں سوائے ان کے جو تم کو پڑھ کر سنائے جاتے ہیں۔ یہ انعاماتِ الٰہی ہیں کہ آپ جانور ذبح کرتے ہیں اور آپ کو ثواب ہوتا ہے، کمال ہے جانور کی جان جاتی ہے ذبح آپ کرتے ہیں اور ثواب پاتے ہیں۔ اللہ کریم نے وہ جانور بتا دیے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے واضح کر دیے ہیں جو حرام ہیں۔ اُن کو چھوڑ کر باقی سب حلال ہیں۔ اسی لیے علمائے کرام فرماتے ہیں کہ بنیادی طور پر ہر چیز میں حِلّت ہے ہر چیز حلال ہے جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ یہ شریعت نے حرام کر دی ہے کیونکہ ہر چیز اللہ کریم نے انسان کی خدمت کے لیے بنائی ہے۔

اسی طرح جانوروں میں تمام جانور حلال ہیں سوائے اُن جانوروں، پرندوں اور چرندوں کے جن کو اللہ نے حرام قرار دے دیا ہے تو یہ اللہ کا کتنا بڑا انعام ہے کہ تمہیں اتنا اختیار دیا ہے کہ تم اس کی پیدا کردہ مخلوق سے خدمت بھی لیتے ہو حتیٰ کہ ذبح کر کے کھا بھی لیتے ہو۔

ایک ضمنی بات:

یہ اصول کہ ہر چیز میں حِلّت ہے جب تک اس کی حرمت شریعت سے ثابت نہ ہو جائے ہمارے عدالتی نظام میں بھی ہے۔ اصول یہ ہے کہ ہر آدمی شریف ہے جب تک کہ یہ ثابت نہ ہو جائے کہ اس نے خطا کی ہے۔ بدقسمتی سے اب ہمارا رویہ یہ ہو چکا ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہر آدمی بے دین ہے، بدکار ہے جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ وہ

شریف آدمی ہے۔ یہ اصول اور ضابطے ہم نے الٹ دیے ہیں جبکہ اصل ضابطہ شرعی کے مطابق ہر بندہ نیک، شریف اور بے قصور ہے جب تک اس کے کردار و اقوال سے ثابت نہ ہو جائے کہ وہ بدکار ہے۔

'اجتناب' کی حقیقت:

فرمایا: فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ ۔۔۔سو بتوں کی پلیدی سے دور رہو فَاجْتَنِبُوا کا معنی اجتناب ہے لیکن اردو میں اجتناب میں وہ شدت نہیں جو عربی میں ہے۔ عربی میں اجتناب حرام سے شدید تر ہے۔ ایک مرتبہ ٹیلی وژن پر بحث ہو رہی تھی کہ قرآن میں شراب کو حرام نہیں کہا گیا تو ثابت کیا جائے کہ یہ حرام ہے اور دکھایا جائے کہ قرآن میں شراب کے ساتھ حرام کا لفظ کہاں لکھا ہے۔ اصل میں ہم حرام کا معنی سمجھتے ہی نہیں ہیں۔ حرام کا معنی ہے کسی چیز سے منع کر دیا جائے تو وہ کرنا حرام ہوتا ہے۔ شراب کے لیے تو اللہ کریم نے فَاجْتَنِبُوا کا لفظ استعمال کیا ہے جو حرام سے شدید تر ہے۔ جیسے یہاں ارشاد ہوا ہے کہ بتوں کی پلیدی سے دور رہو تو اس سے مراد صرف یہی نہیں ہے کہ اس سے دور رہا جائے بلکہ اجتناب یہ ہے کہ بت بنانے سے دور رہو، بتوں کے کاروبار سے دور رہو۔ یعنی بُت سے متعلقہ ہر چیز حرام ہے۔ جب اجتناب کا لفظ 'شراب' کے ساتھ آیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ شراب بنانا، شراب کے لیے انگور یا دوسری چیزیں اُگانا اور انہیں شراب بنانے کے لیے بھیجنا، شراب پر مزدوری کرنا، شراب کو اٹھا کر دوسروں تک پہنچانا، یہ سب حرام ہے۔ تمام متعلقہ امور حرام ہیں۔ اگر شراب کے ساتھ حرام کا لفظ آتا تو اس کا مطلب ہوتا کہ صرف شراب پینا حرام ہے باقی خریدنا بیچنا وغیرہ نہیں لیکن اجتناب کے حکم نے اس کے سارے متعلقات بھی حرام کر دیے۔

یہاں بتوں کے ساتھ اجتناب کا لفظ آیا ہے، معبودانِ باطلہ کے ساتھ آیا ہے چنانچہ معبودانِ باطلہ کے ساتھ رغبت رکھنا، انہیں تراشنا، اُن کی شہرت کرنا، اُن کے کمال بیان کرنا، اُن کے قریب جانا، انہیں بیچنا یہ سارے کام حرام ہیں۔ بتوں کی پلیدی سے اجتناب کرنے سے مراد ہے کہ ہر اس کام سے اجتناب کرو جس کا فائدہ کسی بُت کو ہوتا ہو تو اس میں بتوں کی پلیدی شامل ہو جاتی ہے اور ہر پلیدی سے اجتناب فرض ہو گیا ضروری ہو گیا اور نصِ قرآنی سے ثابت ہو گیا۔

اسی طرح فرمایا: وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّوْرِ ﴿۳۰﴾ اور جھوٹی بات سے دور رہو۔ جھوٹ سے اجتناب کرو، کوئی ایسا ذو معنی جملہ بھی نہ بولو جس سے سننے والے کو دھوکا لگے اور وہ جھوٹ میں مبتلا ہو جائے۔ جھوٹ کے متعلقات سے بھی اجتناب کرو۔ یہاں بتوں کے ساتھ جھوٹ سے اجتناب کو اس لیے جوڑا گیا ہے کہ شرک بھی ایک بہت بڑا جھوٹ

ہے۔ دنیا میں سب سے بڑا جھوٹ جو بولا جاتا ہے وہ اللہ کے ساتھ شرک ہے۔ جب کوئی بندہ جھوٹ بولے گا تو وہ شرک کی ہی چھوٹی موٹی قسم بن جائے گا۔ جھوٹ سے بھی اجتناب کا حکم ہے کہ جھوٹ کے ہر شعبے سے لاتعلق رہو۔ گفتار میں، کردار میں، نشیب و فراز میں، اُٹھنے بیٹھنے میں، تہذیب میں، اخلاق میں، کھانے پینے میں کمانے اور خرچ کرنے میں کہیں جھوٹ کا شائبہ نہ ہو۔

شرک سے بچو:

فرمایا: حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ۔۔۔ صرف ایک اللہ کے لیے یکسو ہو کر، اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہرا کر۔

حُنَفَآءَ لِلّٰهِ۔۔۔ کا ترجمہ اردو میں تو یہ لکھا ہے کہ اللہ کے لیے یکسو ہو جاؤ لیکن سادہ سی زبان میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ٹک سیدھے ہو جاؤ۔ کوئی ٹیڑھ پن نہ رہے اور سیدھا پن کیا ہے؟ سیدھا پن یہ ہے کہ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ۔۔۔ اللہ کی ذات یا اس کی صفات میں کسی طرح کے کسی شرک کا گمان بھی نہ ہو۔ اللہ، اللہ ہے، خالق ہے ربّ العالمین ہے، اللہ کے علاوہ جو کچھ بھی ہے سب مخلوق ہے۔ مخلوق نہ اللہ کی ذات میں شریک ہو سکتی ہے نہ صفات میں شریک ہو سکتی ہے۔ اللہ کی ذات بھی بے مثل ہے بے مثال ہے اور اس کی صفات بھی بے مثل و بے مثال ہیں۔ فرمایا اس معاملے میں بہت ہی احتیاط کرو، نہایت محتاط رہو۔

شرک کا وبال:

شرک ایسا جرم ہے کہ جو شرک میں گرا وہ تباہ و برباد ہو گیا اس کے پاس کچھ نہیں بچا۔ فرمایا: وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ﴿٣١﴾ جو اللہ کے ساتھ شرک کرے گا تو گویا وہ آسمان سے گر پڑا پھر پرندوں نے اس کی بوٹیاں نوچ لیں یا اس کو ہوا نے کسی دور دراز جگہ میں جا پٹکا۔ اللہ کی ذات یا صفات میں کسی قسم کا شرک کرنے والے کی مثال ایسی ہے جس طرح کوئی آسمان پر بستا ہو یعنی شرفِ انسانیت اور پھر ایمان کا نصیب ہونا اتنی بڑی عظمت ہے جیسے کوئی دنیا میں رہنے والا آسمان پر بستا ہو۔ دینِ اسلام اتنی بڑی عظمت عطا کرتا ہے اور ایسے بندے کے خیالوں میں بھی اللہ بستا ہو، اس کے دل کی دھڑکن میں بھی اللہ بستا ہو، جس کی نگاہوں میں بھی اللہ بستا ہو، جس کی بول چال، میل ملاپ لین دین، کاروبار، سونے جاگنے ہر جگہ اللہ کی حکمرانی ہو تو گویا وہ آسمانوں میں فرشتوں میں بس رہا ہے۔ اللہ کی طرف سے ایمان کا عطا ہونا اور توفیقِ اطاعت ارزاں ہونا یہ بہت عظیم نعمت ہے کہ جو اس سے محروم ہے وہ گویا زمین پر ہے اور جو اس کا حامل ہے وہ

آسمان پر ہے۔ اگر ایسا شخص اللہ کی ذات یا اس کی صفات میں شرک کر بیٹھے تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے اُسے آسمانوں سے پھینک دیا جائے اور مردار خور پرندے اُسے نوچ کر کھا جائیں یا تیز ہوائیں اُسے دور ویرانے میں جا پھینکیں اور اس کا وجود ریزہ ریزہ ہو کر تباہ ہو جائے۔ گویا سب سے بڑا نقصان جس کا تصور کیا جا سکتا ہے وہ شرک ہے۔ چنانچہ شرک سے اجتناب لازمی ہے۔ ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ ہم حلال کھائیں، سچ بولیں، عبادت میں محنت کریں، فرائض، واجب، سُنّت کے علاوہ نوافل کی بھی پابندی کریں اور خوب مجاہدہ کریں۔ یہ سب اللہ کی عطا ہے لیکن اگر ذات وصفات میں شرک کا خیال آ جائے تو انسان بلندیوں سے پستیوں میں جا گرتا ہے۔ شرک ایسی تباہی ہے کہ ایمان کو بھی کھا جاتا ہے اور ساری عبادتیں بھی ضائع چلی جاتی ہیں۔ شرک کرنے والا ردّ کر دیا جاتا ہے اور تباہ و برباد ہو کر بے نشان ہو کر مٹ جاتا ہے۔

توحید کیا ہے؟

توحید کیا ہے؟ آسانیاں ہوں، رزق کی فراوانی ہو تو بھی عظمتِ الٰہی کا احساس رہے اور انسان تکبر نہ کرے۔ اگر دکھ، مصیبت، مفلسی آ جائے تو اللہ کے بتائے ہوئے جائز طریقے سے علاج کرے۔ جن امور کو جائز قرار دیا ہے وہ اختیار کرے لیکن کسی دوسرے کے سامنے سجدے نہ کرنے لگ جائے۔ دوسروں سے امیدیں نہ وابستہ کرے کہ اگر زبان سے یہ بھی کہا لیکن دل میں غیر اللہ سے امید وابستہ کر لی تو وہ کریم تو جانتا ہے اور یہ شرک تو ہو گیا۔

شعائر اللہ کا احترام:

فرمایا: ذٰلِكَ ۗ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴿۳۲﴾ اسی طرح جو اللہ کی نشانیوں کی عزت کرتے ہیں یقیناً اُن کے دلوں میں پرہیزگاری ہے۔ فرمایا، جن چیزوں کو اللہ نے اپنے دین کی نشانیاں بنایا ہے، احکامِ شریعت، شعائر اللہ، اتباعِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلّم میں جتنے کام ہیں وہ اللہ کی نشانیاں ہیں۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے ہر وہ کام ارشاد فرمایا جو اللہ کی طرف سے ہے لہٰذا احکامِ شریعت شعائر اللہ ہیں۔ سارے احکام بھی اور سارے وہ مقامات بھی جن کو اللہ نے عظمت دی ہے، شعائر اللہ ہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۔۔۔ (البقرۃ:158) صفا اور مروہ کی دو پہاڑیاں بھی میرے شعائر، میری نشانیوں میں سے ہیں۔

صفا اور مروہ دو پہاڑیاں ہیں، اُن میں کمال یہ ہے کہ حضرت حاجرہ پریشان ہو کر اُن پر دوڑیں۔ اللہ کریم نے فرمایا جو بھی میرے در کی زیارت کو آئے گا اسی طرح ان پر دوڑے۔ اس دوڑ کا اللہ کریم کو کیا فائدہ

ہوتا ہے، اللہ تو بے نیاز ہے، البتہ دوڑنے والے کو بہت کچھ مل جاتا ہے۔ اللہ کریم دوڑنے والے پر اس کی حیثیت کے مطابق اس طرح کی رحمتیں برساتے ہیں جس طرح کی رحمتیں حضرت حاجرہ پر، اُن کی شان کے مطابق برسائیں۔ اسی طرح بیت اللہ کیا ہے؟ چند پتھروں کا ایک کچا کوٹھا (کمرہ) لیکن اللہ نے اس کو عظمت دے دی ہے، فرمایا یہ میری تجلیات کا مہبط ہے اور کائنات میں میری عبادت کے لیے قبلہ ہے۔ گویا کسی چیز کی حرمت کا مدار اس کی ہیئت پر نہیں ہے بلکہ اللہ کے حکم پر ہے۔

تعظیم کیا ہے؟ تعظیم یہ ہے کہ قول اور عمل سے کسی بھی طرح اس کی توہین کا کوئی پہلو نہ نکلے۔ نہ منہ سے کوئی ایسا جملہ نکلے جس میں اس مقام کی توہین کا شائبہ ہو نہ ہی کوئی ایسا کام کرے جس سے توہین کا احتمال ہو۔ جو شعائر اللہ کی عظمت کا خیال رکھتے ہیں، تعظیم کرتے ہیں فرمایا: فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴿۳۲﴾ حقیقتاً یہ وہ ہیں جن کے دل پرہیز گار ہیں۔

قربانی کے جانور:

قربانی میں جانور ذبح کرنے کا حکم دیا تو کیا اللہ کو جانوروں کے خون یا گوشت کی ضرورت ہے؟ فرمایا، نہیں۔ دل کا تقویٰ نصیب ہو جانا مقصود ہے۔ فرمایا: لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿۳۳﴾ ان قربانی کے جانوروں میں تمہارے لیے ایک مقررہ مدت تک فائدے میں پھر انہیں قدیم گھر (بیت اللہ) تک جانا ہے۔ قربانی کے جانور جو تم حج پر اللہ کے گھر جا کر قربان کرتے ہو یا روئے زمین پر کہیں قربانی کرتے ہو تو اس سے اللہ کو تمہاری قلبی کیفیات مطلوب ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عید الاضحیٰ کے موقع پر مدینہ منورہ میں قربانیاں کیں تو روئے زمین پر مسلمان قربانی کی یاد میں جانور ذبح کرتے ہیں۔

قربانی کے لیے جانور آپ کا پسندیدہ ہو، خوبصورت ہو جس کے گلے پر چھری چلے تو آپ کے سینے میں کچھ محسوس ہو۔ اللہ کریم دیکھیں گے کہ کس دل سے کیسا جانور قربان کر رہے ہو۔ ہم تو قربانی کے لیے خانہ پُری کرتے ہیں کہ کسی کو رقم پکڑا دی اس میں چاہے کیسا ہی جانور ملے بس رکن پورا ہو گیا۔

آج ہم میں ایک طبقہ تو وہ ہے جو جیسا تیسا جانور بھی ملے خانہ پُری کرتے ہیں اور فقہ سے مسئلہ تلاش کر کے کہ دانت ٹوٹے ہوئے نہ ہوں، سینگ سلامت ہوں، کان کٹے ہوئے نہ ہوں اور چل کر ذبح کے مقام تک جا سکے خواہ وہ مقام دس قدم دور ہو تو قربانی کر دیتے ہیں۔ یوں وہ شرط پوری کرتے ہیں کہ چلو قربانی تو ہو گئی۔ کیا صرف جانور کی قربانی کرنا تھی یا کوئی اجر بھی لینا تھا؟ دوسرا طبقہ وہ ہے جو پانچ پانچ لاکھ کا سات سات لاکھ کا جانور

اس لیے خریدتے ہیں کہ نمود و نمائش ہو خوب واہ واہ ہو۔ اگر کوئی جائز وسائل سے اللہ کی رضا کے لیے اتنی رقم خرچ کرتا ہے تو اچھی بات ہے لیکن احتیاط کرے کہ اس طرف نہ نکل جائے کہ سوچے یہ میرے لیے Honour کی بات ہے کہ میں نے ڈیڑھ لاکھ کا دنبہ خریدا یا پانچ لاکھ کا بیل خریدا ہے۔ یہ کسی کی شہرت یا Honour کی بات نہیں ہے یہ ایک خوبصورت چیز آپ اپنی طرف سے اللہ کریم کی بارگاہ میں پیش کرتے ہیں، اس کی رضا کے حصول کے لیے لہٰذا اسے رسم نہ سمجھا جائے۔

فرمایا کہ ایک وقت تک تم قربانی کے جانوروں سے استفادہ بھی کر سکتے ہو۔ اگر وہ شیر دار ہیں تو دودھ پی سکتے ہو، سواری کے ہیں تو سواری کر سکتے ہو لیکن ایک خاص وقت تک فرمایا: ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿٣٣﴾ وہ حرم پہنچ جائیں، اب اُن کی منزل اللہ کا گھر ہے، وہ گھر جو دوزخ سے رہائی کی نوید سناتا ہے۔ جس گھر کی شان یہ ہے کہ جو وہاں کیفیاتِ قلبی کے ساتھ، خلوص کے ساتھ پہنچ گیا اُسے دوزخ سے رہائی مل گئی۔ بظاہر تو ایک کمرہ ہے، ایک کوٹھا سا ہے جو آج بھی اسی طرح کچے پتھروں کا گھر بنا ہوا ہے لیکن اس گھر کا کمال ہے کہ یہ اللہ کا گھر ہے تجلیاتِ ذاتی کا مہبط ہے۔ فرمایا، یہ بیت العتیق ہے۔ عتق سے مراد ہے گردن کا رہا ہو جانا سو جو یہاں پہنچا وہ دوزخ سے آزاد ہو گیا۔

سورۃ الحج رکوع 5 آیات 34 تا 38

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ؕ فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗۤ اَسْلِمُوْا ؕ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ﴿۳۴﴾ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَاۤ اَصَابَهُمْ وَالْمُقِيْمِى الصَّلٰوةِ ۙ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۳۶﴾ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ؕ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ﴿۳۸﴾

اور ہم نے ہر امت کے لیے قربانی کا ایک طریق مقرر فرما دیا تا کہ جو مویشی چار پائے اس (اللہ) نے ان کو عطا فرمائے ہیں ان پر (بوقتِ ذبح) اللہ کا نام لیں سو تمہارا معبود ہے، اکیلا معبود۔ تو اُسی کے فرماں بردار رہو اور عاجزی کرنے والوں کو خوش خبری سنا دیں ﴿۳۴﴾ وہ ایسے ہیں کہ جب (ان کے سامنے) اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جو (مشکل) ان پر پڑتی ہے اس پر صبر کرتے ہیں اور نماز کی پابندی کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا فرمایا ہے

اس میں سے (بقدرِ توفیق اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں ﴿۳۵﴾ اور قربانی کے اونٹوں کو بھی ہم نے تمہارے لیے اللہ کی نشانیاں مقرر فرمایا ہے (اسی طرح دوسرے قربانی کے جانور) اس میں تمہارے لیے فائدے ہیں سو ان پر قطار بنا کر (ذبح کرتے وقت) اللہ کا نام لیا کرو (کہ اونٹ کو کھڑا کر کے بھی ذبح کیا جاتا ہے) پھر جب وہ اپنی کروٹ پر گر پڑیں تو ان میں سے کھاؤ اور قناعت کرنے والوں اور محتاجوں کو بھی کھلاؤ اسی طرح ہم نے ان (جانوروں) کو تمہارے تابع کر دیا ہے تاکہ تم (اس پر اللہ کا) شکر ادا کرو ﴿۳۶﴾ اللہ کے پاس نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون ولیکن اس کے پاس تمہارا تقویٰ (پرہیز گاری) پہنچتا ہے۔ اس طرح اس (اللہ) نے ان (جانوروں) کو تمہارے لیے مسخر کر دیا تاکہ تم اللہ کی بزرگی بیان کرو اس پر جو کہ اس نے تمہیں توفق عطا فرمائی اور اخلاص والوں کو خوش خبری سنا دیجیے ﴿۳۷﴾ بے شک اللہ ایمان والوں سے (ان کے دشمنوں کو) ہٹاتے رہتے ہیں یقیناً اللہ کسی خیانت کرنے والے کفرانِ نعمت کرنے والے کو نہیں چاہتے ﴿۳۸﴾

تفسیر و معارف

قربانی، ایک مستقل عبادت:

فرمایا: وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۔۔۔ اور ہم نے ہر امت کے لیے قربانی کا ایک طریق مقرر فرما دیا تاکہ جو مویشی چار پائے اس (اللہ) نے ان کو عطا فرمائے ہیں ان پر بوقتِ ذبح اللہ کا نام لیں۔

قربانی ایک مستقل عبادت ہے جو ایک بہت عظیم الشان قربانی کی یاد دلاتی ہے، جس کی بنیاد سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا اپنے فرزند اسمٰعیل علیہ السلام کو قربان کرنے پر ہے۔ قربانی کا فلسفہ ان دو انبیائے کرام کے واقعہ میں پنہاں ہے۔ قرآنِ حکیم میں دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ کریم نے اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام کو ضعفِ پیری میں اسمٰعیل علیہ السلام جیسا فرزند عطا فرمایا اور ابھی اسمٰعیل علیہ السلام شیر خوار ہی تھے کہ اپنے خلیلؑ کو حکم دیا کہ بچے کو اس کی والدہ کے ہمراہ

ایک ویرانے میں چھوڑ آؤ تو آپؑ نے حکم کی تعمیل کی پھر جب اسمٰعیل علیہ السلام: فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ۔۔۔(الصفٰت:102) چلنے پھرنے کے قابل ہوئے، تو ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ اسمٰعیل علیہ السلام کو میری راہ میں ذبح کردو، قربان کردو۔ ذرا اندازہ کریں اس قربانی کا کہ ایک باپ ہو جو ضعف العمری کی حدیں پھلانگ چکا ہو، اس بڑھاپے میں اسے بیٹا نصیب ہو اور وہ بھی اسمٰعیل علیہ السلام جیسا جو اللہ کا اولوالعزم رسول ہو اور باپ کو حکم دیا جائے کہ اسے میری راہ میں ذبح کردو! سوچیں! جب ابراہیم علیہ السلام نے اسمٰعیل علیہ السلام کو قربان کرنے کے لیے لٹایا ہوگا، آپؑ کی اور اپنی آنکھوں پر پٹی باندھی ہوگی کہ شفقتِ پدری درمیان میں نہ آئے اور تعمیلِ ارشاد پر بیٹے کی گردن پر چھری چلائی ہوگی تو باپ کے دل پر کیا گزری ہوگی!

اگر انسان اس طرح سوچے تو اسے سمجھ آتی ہے کہ یہ کتنا مشکل کام تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چھری بیٹے کی گردن پر چلادی، گردن کٹ گئی، خون کے فوارے ابل پڑے۔ ابراہیم علیہ السلام سمجھ رہے تھے کہ اسمٰعیل علیہ السلام کی گردن کٹ چکی اور پٹی کھول دی تو دیکھا کہ ایک دنبہ ذبح ہوا پڑا تھا اور اسمٰعیل علیہ السلام پاس کھڑے مسکرا رہے تھے۔ ابراہیم علیہ السلام (چھری چلانے کا عمل) کر گزرے لیکن اس قادرِ کریم نے اسمٰعیل علیہ السلام کو بچالیا اور ان کی جگہ مینڈھا بھیج دیا۔ ہم اپنی حیثیت دیکھیں کہ ہمیں تو کوئی دکھ نہیں اٹھانا پڑا اور لیکن سنّت پر عمل کرنے سے ہمیں بھی ان رحمتوں میں سے حصّہ عطا ہو گیا۔ اگر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی آزمائشوں بھری زندگی کو دیکھا جائے، اس پر غور کیا جائے تو سمجھ آتی ہے کہ قربانی کیا ہوتی ہے! خلوص سے قربانی کی جائے تو قربانی کے ہر عمل پر اللہ کی رحمت متوجہ ہوتی ہے تو جب ہم ایک بکرا یا ایک دنبہ۔ ایک گائے یا بچھڑا یا اونٹ ذبح کرتے ہیں تو ہم پر ہماری حیثیت کے مطابق اس رحمتِ الٰہی میں سے حصّہ ملتا ہے جو رحمتِ الٰہی ابراہیم علیہ السلام پر آپؑ کی شان کے مطابق نازل ہوئی تھی۔ اگر قربانی کا یہ فلسفہ سمجھ میں آجائے تو کیا کسی کا دل چاہے گا کہ وہ محض خانہ پُری کرے؟ اس کا تو دل چاہے گا کہ وہ قربانی کرے۔

یہاں ارشاد ہو رہا ہے کہ اللہ نے پہلی امتوں پر بھی یہ احسان فرمایا۔ ہر امت کے لیے قربانی کا ایک طریق مقرر کردیا۔ ہر قوم کا ایک منسلک تھا، ایک طرزِ حیات اور نظام تھا۔ جس طرح دین میں باقی عبادات ہیں اسی طرح قربانی بھی عبادت ہے، اللہ کی طرف سے مقرر فرمائی گئی ہے۔ اللہ کریم کو سُنّتِ ابراہیمی اتنی مقبول تھی کہ اللہ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم کی شریعت میں اسے جاری فرما دیا۔ یاد رہے، ہم قربانی اس لیے کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے بھی سُنّتِ ابراہیمی پر عمل کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم ہر سال قربانی فرماتے رہے اور ایک سال تو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے سو اونٹ اللہ کی راہ میں قربان کیے۔

فرمایا: لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ۔۔۔ یعنی جو جانور تمہیں عطا ہوئے ہیں ان پر بوقت ذبح اللہ کا نام لو تو وہ حلال

ہیں اور اللہ کی بارگاہ میں مقبول ہیں ۔ ہر عبادت کی طرح قربانی میں بھی اخلاص کی ضرورت ہے۔ سب سے بہتر یہ ہے کہ قربانی کے لیے ایسا جانور منتخب کیا جائے جو صحت مند ہو، خوبصورت ہو۔ خود کو بھی پیارا لگے اور دیکھنے والوں کو بھی اچھا لگے پھر اسے اللہ کی رضا کے لیے اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے۔ بہتر یہ ہے کہ خود ذبح کیا جائے۔ جس طرح ابراہیم علیہ السلام نے خود چھری چلائی تھی اسی طرح قربانی کرنے والا بھی خود ذبح کرے اگر ممکن ہو۔ علماء فرماتے ہیں کہ اگر خود ذبح نہیں کر سکتا تو کم از کم اپنے سامنے ذبح کرائے۔ عبادات حصولِ رضائے الٰہی کا سبب ہیں خانہ پری کے لیے نہیں۔ اللہ ہمیں معاف فرمادے اور ہماری عبادات قبول فرمالے تو اس کا احسان ہے ورنہ ہم تو خانہ پری ہی کرتے ہیں۔ قربانی تو سال میں ایک بار ہی ہوتی ہے اسے بھی یا تو بوجھ سمجھتے ہیں یا اپنی نمود و نمائش کا ذریعہ بنالیتے ہیں۔ ہم تو اکثر نمازیں بھی خانہ پری کے لیے ادا کرتے ہیں۔ وضو کے لیے آئے تو جلدی جلدی پانی کے چھینٹے اُڑائے، کوئی حصہ خشک رہ گیا کوئی گیلا ہو گیا، یہ وضو ہو گیا۔ مسجد میں آئے رکوع میں گئے اور سیدھے سجدے میں گر گئے، قومہ چھوڑ دیا۔ سجدے میں گئے تو جلسہ چھوڑ دیا، دو ٹھونگیں ماریں اور نماز ختم، دو منٹ میں فارغ ہو گئے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی ان کے پیچھے بندوق لیے انہیں بھگانے کے لیے لگا ہے۔ اگر آرام سے نماز پڑھ لیتے تو چند منٹ اور لگ جاتے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ مسجد سے باہر نکل کر سگریٹ سلگا لیں گے یا اخبار بینی شروع کر دیں گے یا گپ شپ میں وقت ضائع کر دیں گے۔ اسی گھنٹے میں سے جو سڑک پر گپ شپ میں ضائع کیا اگر یہ دس منٹ نماز کو دے دیں تسلی سے پڑھیں اور اس یقین کے ساتھ پڑھیں کہ میں اپنی ابدی رہائش گاہ کے لیے اپنے کھانے پینے، لباس اور رہائش کا سامان بھیج رہا ہوں وہاں جا کر میں نے اسے برتنا ہے تو کتنا مناسب ہے۔ دنیا میں اگر ہمیں کہیں نقل مکانی کرنی پڑے اور ہمیں کہا جائے کہ آپ اپنا سامان پہلے پیک کر کے بھیج دیں تو کیا ہم ٹوٹی ہوئی چار پائیاں، پرانے کپڑے اور ٹوٹے ہوئے برتن اپنے لیے آگے بھیجیں گے؟ عبادات تو یہ ہیں کہ اپنا سامان اپنے لیے جنت میں بھیج دیں اور وہاں جا کر رہنا ہے تو سوچیں کہ یہ سامان کیسا ہونا چاہیے۔ عبادات بڑے سکون بڑی تسلی سے کی جانی چاہیں اور ایک ایک رکن دھیان سے ادا کرنا چاہیے۔

قربانی اور آج کے نام نہاد دانشور:

ہمارے ہاں ایک نام نہاد دانشور نے ایک مرتبہ قربانی کے موقع پر بڑی تقریر کی کہ عید الاضحیٰ کے موقع پر جتنے جانور ذبح کیے جاتے ہیں ان سب کی رقم جمع کی جائے تو ہر شہر میں ایک یونیورسٹی بن سکتی ہے۔ اس کا جواب یہ تھا کہ اس فارمولے کے تحت رقم جمع کرنے کے اور بھی طریقے ہیں مثلاً یہ کہ جتنے لوگ قیمتی لباس پہنتے ہیں اگر وہ سب جمع کیے جائیں تو شاید ہر گاؤں میں یونیورسٹی بن جائے گی۔ اسی طرح روزانہ بڑے بڑے گھروں میں جتنے اعلیٰ پکوان

پکتے ہیں اگر وہ بند کروادیں اور یہ سارا جمع کیا جائے تو شاید گھر گھر یونیورسٹی بن جائے۔ان گھروں کے ایک وقت کے کھانے کے اخراجات غریب گھرانے کے چھ مہینے کے راشن کے خرچہ کے برابر ہوتے ہیں۔

حق یہ ہے کہ ہر چیز اپنے مقام پر ہوتی ہے، پیسے خرچ کرنا یا بچانا مراد نہیں ہے۔ مراد یہ ہے کہ آپ کا قلبی تعلق عظمتِ الٰہی کے ساتھ کیسا ہے اور کتنا ہے، آپ کس انداز سے اپنے پروردگار کو راضی کرنا چاہتے ہیں اور اسے راضی کرنے کے لیے کیا پیش کرنا چاہتے ہیں؟

اللہ واحد ہے، احد ہے:

یادرکھو یہ طے شدہ بات ہے: فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۔۔۔تمہارا معبود صرف ایک ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے قُلْ هُوَاللّٰهُ اَحَدٌ (الاخلاص:1) فرمادیجیے اللہ احد ہے۔اگر ایک انگلی کھڑی کرتے ہیں تو اُسے بھی واحد کہہ سکتے ہیں، بظاہر تو یہ واحد ہے لیکن اس کے بہت سے اجزا ہیں ناخن ہے، گوشت ہے، ہڈیاں ہیں اور کھال بھی ہے۔احد اس چیز کو کہا جاتا ہے جس میں کوئی جز نہیں ہو۔اللہ وَحْدَهٗ لَا شَرِيكَ ہی نہیں اللہ احد ہے، اس کا کوئی جز نہیں ہے۔ اس کا کوئی شریک، کوئی ہم پلہ نہیں ہے، کوئی دوسرا الوہیت کا مستحق نہیں ہے، کوئی ہے ہی نہیں۔اللہ واحد ہے لہٰذا: فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا ۔۔۔صرف اسی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرو۔اسی کی فرمانبرداری میں زندگی گزارو اور اُسی کی اطاعت میں تمہیں موت آئے۔والدین کے احترام کی قرآن میں بڑی تاکید ہے لیکن اللہ کی نافرمانی کر کے ان کی اطاعت جائز نہیں قرآن کریم میں والدین کے لیے فرمایا: فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا ۔۔۔(بنی اسرائیل:23) کہ والدین کے سامنے اونچی آواز میں بات نہ کرو اور دل میں بھی اُن سے بیزاری کا خیال نہ لاؤ یعنی اتنی پابندی ہے کہ دل میں بھی نفرت یا بیزاری نہ آئے۔یعنی والدین کے لیے دل میں بھی یہ خیال نہ آئے کہ یہ بوڑھے گلے پڑ گئے ہیں۔زبان سے ہرگز ایسی بات نہ کرے اور دل میں بھی ایسا خیال نہ گزرے اور اُن کی خدمت دل وجان سے کرو لیکن اللہ کے کسی حکم کی فرمانبرداری سے روکیں تو وہاں والدین کی اطاعت ضروری نہیں، اللہ کی اطاعت ضروری ہے۔اُن کا ادب، احترام اپنی جگہ لیکن اطاعت اللہ کی ہوگی والدین کا حکم بھی تب مانا جائے گا جب وہ اللہ کے حکم کے دائرہ کار میں ہوگا۔اللہ کے حکم کے خلاف والدین کی بات بھی نہیں سنی جائے گی۔چنانچہ فرمایا: فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا ۔۔۔اسی وَحْدَهٗ لَا شَرِيكَ کی بات مانو، اسی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرو اور دنیا میں جو طریقِ حیات جو نظام اس نے دیا ہے اُس پر عمل پیرا رہو۔

عاجزی کرنے والے:

فرمایا: وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ﴿٣٤﴾ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے سامنے عاجزی اور نیازمندی سے اس کی

اطاعت کرنے والے کو خوشخبری دے دیں، دنیا میں ہی انہیں بشارت دے دیجیے، یہ "مُخْبِتِيْنَ" اور اللہ کی اطاعت کرنے والے لوگ کیسے ہیں؟ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ ۔۔۔ وہ ایسے ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے، اللہ کی بات آجائے، اللہ کا حکم آجائے، اللہ کی بات کی جائے اللہ کا ارشاد سنایا جائے تو یہ یہ صرف کانوں سے ہی نہیں سنتے بلکہ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ ۔۔۔ ان کے دل بھی لرز جاتے ہیں کہ کیسی عظیم ہستی کا پیغام ہے اور میں کتنی حقیری مخلوق ہوں میری حیثیت ہی کیا ہے۔

اس بات کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر یہاں کوئی سرکاری ہرکارہ آجائے اور ہم سب میں سے ایک بندے کو اٹھا کر یہ کہہ دے کہ مجھے وزیراعظم نے پیغام دے کر بھیجا ہے تو اس بندے کے دل میں کتنی خوشی آجائے گی۔ پیغام کیا ہے، کیا نہیں ہے؟ اس کی بات الگ ہے محض وزیراعظم کے قاصد کا آنا اور ایک بندے کو مخاطب کرنا کہ اس کے لیے وزیراعظم نے آپ کے لیے پیغام دے کر بھیجا ہے تو اس بندے کے دل میں کتنی خوشی آجائے گی۔ پیغام کیا ہے، کیا نہیں ہے؟ اس کی بات الگ ہے محض وزیراعظم کے قاصد کا آنا اور ایک بندے کو مخاطب کرنا کہ اس کے لیے وزیراعظم نے پیغام بھیجا ہے، اس بات کی وہ بندہ کتنی اہمیت محسوس کرے گا، خوشی سے پھولا نہیں سمائے گا تو اللہ کریم کی طرف سے پیغام پہنچے اس کے دل کا کیا حال ہونا چاہیے! ایسا تب ہوتا ہے جب دل عظمتِ الٰہی سے آشنا ہو۔

دل ہی عظمتِ الٰہی کو پا سکتا ہے؟

فرمایا کہ یہ تو وہ لوگ ہیں جن کے سامنے جب اللہ کی بات رکھی جاتی ہے، احکام الٰہی کی، اللہ کے دین کی، اللہ کی بات ہوتی ہے تو: وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ ۔۔۔ وہ صرف کانوں سے نہیں سنتے اُن کے تو دل بدل جاتے ہیں اور پھر اُن کا اللہ سے ایسا رشتہ بن جاتا ہے کہ: وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَآ اَصَابَهُمْ ۔۔۔ اطاعت الٰہی میں جو مشکل ان پر آتی ہے اس پر وہ صبر کرتے ہیں۔ اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے مشکل آئے تو چپ کر جاتے ہیں کیونکہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ میرا اللہ جانتا ہے میرے حال سے واقف ہے اور اسی پر میرا بھروسہ ہے۔

انسان کی آزمائش دو ہی صورتوں میں ہے۔ دوسری جگہ ارشاد باری ہے: وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۔۔۔ (الفجر:16) کہ اس پر روزی تنگ کر دیتا ہے۔ اس پر بھوک وافلاس بھیج دیتا ہے، بیماری آجاتی ہے، صحت چھن جاتی ہے، کمزور کر دیتا ہے۔ عہدہ چھن جاتا ہے گویا رزق تنگ ہو جاتا ہے تو آزمائش یہ ہے کہ کیا پھر بھی وہ اللہ پر ہی اعتماد کرتا ہے یا لوگوں کی طرف بھاگتا ہے۔ کسی دروازے پر خوشامد کرتا ہے، کسی سے بھیک مانگتا ہے

اللہ کریم فرماتے ہیں کہ جو میرے بندے ہیں جب اُن کے سامنے میرا نام آتا ہے، میرا ذکر ہوتا ہے میری بات ہوتی ہے تو اس کو سُن کر اُن کے دل لرز اٹھتے ہیں۔ اُن کے دل عظمتِ الٰہی کو محسوس کرتے ہیں۔ جب کوئی مصیبت آتی ہے تو اس کا حل اللہ کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق ڈھونڈتے ہیں بے صبر ہو کر غیروں کو سجدے کرنے نہیں لگ جاتے۔

فرمایا، جو میرے بندے ہیں ان کے سامنے جب میرا نام آتا ہے، میرا ذکر ہوتا ہے تو اس کو سن کر اُن کے دل لرز اٹھتے ہیں یعنی ان کے دل عظمتِ الٰہی کو محسوس کرتے ہیں۔ دل کس طرح محسوس کرتا ہے؟ دل انسانی وجود کا حکمران ہے جب دل پر کیفیت آتی ہے تو اعضاء و جوارح بھی اس کو محسوس کرتے ہیں اور اس کا حکم بجالاتے ہیں۔ کیسی عجیب بات ہے کہ لوگ اس بات پر اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں بھلا دل کیسے محسوس کرتا ہے؟ دل کیسے سن لیتا ہے یا دل نے کیسے ذکر کیا؟ دنیا کے کاموں میں تو ہم کہتے ہیں کہ میں نے انعام جیتا، میرا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ میرا بھائی فوت ہو گیا میرا دل غم سے پھٹنے لگا۔ اب کوئی پوچھے تمہارے دل نے خوشی اور غم کیسے محسوس کیا؟ دنیا کے کاموں میں محسوس کر لیتے ہو جب دین کی بات آتی ہے تو کہتے ہو، دل کا کیا کام ہے۔

آج تو سائنس یہ کہتی ہے کہ دل سنتا بھی ہے، دیکھتا بھی ہے، سوچتا بھی ہے اور دل ہی فیصلے بھی کرتا ہے۔ دماغ، جسم پر دل کے فیصلے نافذ کرتا ہے، اعضاء و جوارح کو حکم دیتا ہے اور وہ حرکت میں آتے ہیں۔ دماغ کوئی فیصلہ کرے تو وہ دل کے سامنے پیش ہوتا ہے۔ دل پسند کرے تو نافذ ہوتا ہے۔ اگر دل اُسے مسترد کر دے تو دماغ خاموش ہو جاتا ہے۔ جو فیصلہ دل کرتا ہے دماغ کو پسند آئے یا نہ آئے، وہ نافذ ہو جاتا ہے۔ دماغ اس کے متعلق اعضا کو احکام دیتا ہے۔ یہ سب اس لیے کہ حکمران دل ہے دماغ اس کے تابع ہے۔ گویا پورا بدن ایک سلطنت ہے جس میں دس کھرب Cells رہتے ہیں۔ ان دس کھرب Cells سے مختلف اعضا (Organs) بنے ہوئے ہیں اور ہر عضو (Organ) کا کام الگ ہے۔ ہر جسم میں ایک کائنات بستی ہے اور پورا وجود ایک نظامِ سلطنت کی طرح چلتا ہے، صوبوں، ضلعوں اور تحصیلوں میں بٹا ہوا ہے۔ اللہ کریم چاہتے ہیں کہ وجودِ انسانی کی کائنات کا جو سربراہ ہے وہ مجھ سے محبت کرے کہ وہ سربراہ جب عظمتِ الٰہی پا لے گا تو باقی کائنات یعنی اعضا و جوارح پر بھی اس کا اثر آ جائے گا۔ وہ سربراہ دل ہے۔ جب دل پر کیفیت آتی ہے تو اعضا و جوارح بھی اسی طرح کا کام کرتے ہیں جس طرح کا دل کہتا ہے۔ جب ہم محبتِ الٰہی کا دعویٰ کرتے ہیں اور پھر جھوٹ بولتے ہیں، گناہ کرتے ہیں تو ہمارا دعویٰ جھوٹا ہوتا ہے۔ اگر ہمارا دعویٰ سچا ہوتا تو یہ سارا ملک اس کے تابع ہو جاتا اور اگر ملک بغاوت کرتا ہے تو دعویٰ جھوٹا ہے۔ اللہ کے سامنے عاجزی کرنے والے تو وہ لوگ ہیں جن کے سامنے جب اللہ کی بات آئے تو اُن کے دل لرز اٹھتے ہیں، اُن کے ملک کا سربراہ کانپ اٹھتا ہے۔

اقامتِ صلوٰۃ:

وَالْمُقِيمِي الصَّلٰوةِ۔۔۔ یہ نیک لوگ اللہ کی عبادت میں سرگرم ہوتے ہیں۔ یہ لوگ صلوٰۃ صرف ادا ہی نہیں کرتے بلکہ قائم کرتے ہیں۔ یاد رہے ادائے صلوٰۃ اور ہے اقامتِ صلوٰۃ اور ہے، یہ دو الگ کام ہیں۔ ادائے صلوٰۃ، صلوٰۃ ادا کرنا ہے جبکہ اقامت میں صلوٰۃ کی تمام شرائط پوری کرنا ہیں۔ وقت پر آنا با جماعت پڑھنا، لباس پاک ہو اچھا ہو اور وضو ٹھیک طریقے سے کیا ہو۔ نماز کے ارکان کا اہتمام کیا جائے، پابندی کی جائے اور ایسا طرزِ عمل اپنایا جائے کہ دوسرے بھی دیکھ کر نماز کی طرف راغب ہوں۔

یہاں دیہات میں دیکھا گیا ہے کہ پانچ سات پکے نمازی ہوتے ہیں باقی کسی نے عید کی نماز پڑھ لی کوئی جمعہ پڑھنے آ گیا۔ پھر مسجد پر ایسا قبضہ کرتے ہیں کہ اگر کوئی جدید طرز کے فیشن یا لباس میں یا کوئی نو وارد مسجد میں آ جائے تو پہلے تو اس کی وضع قطع پر تنقید کریں گے۔ اس کے لباس پر بات کریں گے اور اگر اس کی داڑھی مُنڈھی ہوئی ہو تو اس پر سرزنش کریں گے۔ اسی پر بس نہیں کرتے پھر وضو پر بھی تنقید ہوتی ہے، نماز پر ٹوکیں گے حتیٰ کہ اسے بھگا کر دم لیں گے۔ اتنا نہیں کر سکتے کہ اگر ایک نیا بندہ آ گیا ہے اس کا احترام کریں اُسے پیار سے سمجھائیں کہ یہاں کا انتظام کیسا ہے پانی کہاں سے ملے گا، وضو کہاں بیٹھ کر کرنا ہے وغیرہ لیکن اکثر ایسا نہیں ہوتا۔ یہ اقامتِ صلوٰۃ نہیں ہے یہ تو نمازیوں کو بھگانے والی بات ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ یہ ہے کہ آپ کے طرزِ عمل سے دوسروں کو بھی تحریک ہو اور وہ بھی نماز میں شامل ہوں۔

ایک واقعہ:

تیمور لنگ اپنی سوانح حیات میں لکھتا ہے کہ میں ایک شہر میں تھا، وہاں میں نے ایک عجیب بات دیکھی کہ جب صلوٰۃ کا وقت ہوا تو سب لوگوں نے لباس تبدیل کر کے بہت خوبصورت کپڑے پہنے اور نکل پڑے تو میں نے اُن سے پوچھا کہ کیا آج عید کا موقع ہے؟ انہوں نے کہا سلطانِ معظم! ہم اللہ کی بارگاہ میں حاضری کے لیے جا رہے ہیں، مسجد میں باجماعت پڑھیں گے اور ہر نماز عید جیسی ہوتی ہے۔ اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے۔ ہمارے گھر میں جو بہترین لباس ہے وہ پہنتے ہیں تو کہنے لگا میں بھی صلوٰۃ کی تیاری کر رہا تھا لیکن مجھے بہت شرمندگی ہوئی کہ میں نے تو آج تک ایسا سوچا ہی نہیں۔ پھر میں نے حکم دیا کہ ایک مسجد بناؤ جو جوڑی اور اکھیڑی جا سکے اور ہمیشہ میرے سفر پر ساتھ رہے اس میں باجماعت صلوٰۃ ادا ہو۔ اس کے بعد سے میں نے ہر صلوٰۃ بہترین لباس پہن کر ادا کرنا شروع کی کہ یہ ٹھیک کہتے ہیں۔

انفاق:

اللہ کے سامنے عاجزی کرنے والے یہ لوگ، وَمِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ يُنۡفِقُوۡنَ ﴿٣٥﴾ جو نعمتیں ہم نے ان کو دی ہیں اُن کو ہماری منشا کے مطابق خرچ کرتے ہیں۔ جو چیز انسان کو ملتی ہے وہ اللہ کی دی ہوئی اور اس کا دیا ہوا رزق ہے۔ کسی کے پاس عقل وخرد ہے، علم وعمل ہے کسی کے پاس جسمانی قوت ہے یا بڑا عہدہ ہے یا خزانے ہیں توکسی کے پاس دعائیں تو ہیں۔ کچھ بھی نہیں ہے تو دوسروں کی بھلائی کی سوچ تو ہے۔ جو نعمتیں ہمارے پاس ہیں دیکھنے، سننے، جینے کی سب اس کی عطا ہیں۔ ہمارے وجود کا ایک ایک Cell اللہ کی طرف سے دیا گیا ہے۔ انفاق سے مراد ہے اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو اللہ کے حکم کے مطابق خرچ کرنا اور یہ صرف دولت پر لاگو نہیں ہوتا بلکہ بندے کے ہر وصف پر لاگو ہوتا ہے۔ اگر کوئی عالم ہے تو علم کو کس طرح تقسیم کرتا ہے۔ ادیب ودانشور ہے تو اپنی دانش کس طرح تقسیم کرتا ہے۔ حاکم ہے تو اپنے فرائض کس طرح ادا کرتا ہے، رعیت ہے تو اپنے حقوق وفرائض کس طرح ادا کرتا ہے۔ ہر بندہ جہاں ہے جو اس کے پاس اللہ کی نعمتیں ہیں اُن کو جب اللہ کے حکم کے مطابق خرچ کرتا ہے تو یہ انفاق ہے۔ فرمایا، میرے بندے تو وہ ہیں کہ میں نے انہیں جو جو نعمتیں دی ہیں وہ میری منشا کے مطابق خرچ کرتے ہیں میری رضا کو پانے کے لیے کرتے ہیں۔

قربانی کے جانور عظمتِ الٰہی کی نشانیاں:

فرمایا: وَالۡبُدۡنَ جَعَلۡنٰهَا لَكُمۡ مِّنۡ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمۡ فِيۡهَا خَيۡرٌ ۔۔۔ اور قربانی کے اونٹوں کو بھی ہم نے تمہارے لیے اللہ کی نشانیاں مقرر فرمایا ہے (اسی طرح دوسرے قربانی کے جانور) اس میں تمہارے لیے فائدے ہیں۔ ان میں تمہارے لیے بھلائی ہی بھلائی ہے، فائدہ ہی فائدہ ہے۔ عرب میں عموماً قربانی کے لیے اونٹ منتخب کیا جاتا تھا دوسرے جانور بھی دیے جاتے تھے اور آج بھی دیے جاتے ہیں لیکن اونٹ چونکہ سب سے بڑا سب سے نمایاں ہے تو سب کو جامع کر کے ارشاد فرمادیا۔ اس سے مراد قربانی کے جانور ہی ہیں کہ ہم نے قربانی کے جانوروں کو بھی تمہارے لیے عظمتِ الٰہی کی نشانیاں بنادیا ہے۔ وہ بھی اللہ کی مخلوق ہیں اور یہ اللہ کا احسان ہے انسان کو زمین پر بھیجا تو ساری زمینی مخلوق کو اس کی خدمت پر لگادیا۔ زمین پر جو کچھ پیدا ہوتا ہے انسان کی خاطر ہے۔ یہ جانور بھی انسان کی خدمت کے لیے بنائے گئے ہیں اور اس کی ملک میں دیے گئے ہیں۔ جب تم اپنی ملکیت سے، اپنے رزق میں سے خوبصورت اور پیارے جانور اللہ کی راہ میں قربانی کرنے کے لیے نکالتے ہو تو یہ نہ سمجھو کہ وہ ضائع جائیں گے۔ اُن جانوروں کو تو عظمتِ الٰہی کی نشانیاں بنادیا جاتا ہے۔

قربانی کا گوشت:

فرمایا: فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ۔۔۔سواُن پر قطار بنا کر (ذبح کرتے وقت) اللہ کا نام لیا کرو (کہ اونٹ کو کھڑا کر کے بھی ذبح کیا جاتا ہے) پھر جب وہ اپنی کروٹ پر گر پڑیں تو ان میں سے کھاؤ اور قناعت کرنے والوں اور محتاجوں کو بھی کھلاؤ۔

اللہ کریم وہ مہربان ہستی ہے جس نے ان کو پیدا کیا اور انسان کو ایسا درجہ دیا کہ اللہ کی حلال کردہ مخلوق کو قربان کرتا ہے چنانچہ جب ان جانوروں کو قطار در قطار کھڑا کر کے یا لِٹا کر ذبح کرتے ہو تو اللہ وحدہٗ لاشریک کا نام لیا کرو۔ یہ عجیب بات ہے کہ جان تو جانور کی جاتی ہے، قربان جانور ہوتا ہے لیکن ثواب جانور قربان کرنے والے کو ہوتا ہے۔ جانور نے بھی قربان ہو کر اپنا مقصدِ حیات پا لیا کہ وہ بنا ہی انسان کی خدمت کے لیے تھا۔ ذبح کرنے والے نے اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کر کے، اپنے جانور کا اللہ کی راہ میں خون بہا کر اس کا گوشت تقسیم کر کے اپنا اجر لے لیا۔ اس میں سے خود بھی کھاؤ، جو لوگ قناعت کر کے صبر کر کے بیٹھ گئے ہیں کسی سے مانگتے نہیں، کسی کے در پر نہیں جاتے، انہیں بھی دو اور غرباء اور مساکین کو بھی دو۔ یہاں چونکہ تین باتیں ارشاد ہوئی ہیں کہ خود بھی کھاؤ، قناعت کرنے والوں کو بھی دو اور غریبوں کو بھی دو تو علما فرماتے ہیں کہ اگر قربانی کے گوشت کا تیسرا حصہ غریبوں میں بانٹ دیا جائے تو بہت اچھا ہے ورنہ ضروری نہیں ہے جتنا خود چاہتا ہے کھا سکتا ہے۔ عزیز و اقارب، رشتہ دار، بہن بھائیوں کو دے، جو عزیز مانگتے نہیں اُن کو دے اور غریبوں کو بھی اس میں شامل کر لے۔

بعض لوگوں نے ترازو رکھا ہوتا ہے اور ناپ تول کر تین حصے بناتے رہتے ہیں۔ ایسی کوئی پابندی نہیں ہے، اندازے سے تقسیم کر لیا جائے۔

مقامِ شکر:

فرمایا: كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴿۳۶﴾ اسی طرح ہم نے ان (جانوروں) کو تمہارے تابع کر دیا ہے تا کہ تم (اس پر اللہ کا) شکر کرو۔

اللہ کریم نے ان جانوروں کو پیدا کر کے تمہاری مِلک میں دے دیا، تمہارا رزق بنا دیا اور پھر تمہیں توفیق دی کہ تم اپنے جانوروں میں سے خوبصورت اچھے جانور نکال کر اللہ کی راہ میں ذبح کرتے ہو۔ یہ ایک رسم نہیں ہے کہ اس کی خانہ پُری کی جائے۔

اگر کسی کے پاس استطاعت نہیں ہے تو وہ قربانی نہ کرے لیکن جو حج پر جاتے ہیں اُن کے لیے حج کے

اخراجات میں قربانی بھی ہے۔ حج بھی اُسی پر فرض ہے جس کے پاس پورے اخراجات ہیں۔ جو حج کے علاوہ عید الاضحیٰ پر گھروں میں قربانی کرتے ہیں اگر اُن کے پاس تھوڑے پیسے ہیں تو ضروری نہیں ہے کہ وہ کسی مریل سے جانور میں حصہ ڈال کر خانہ پُری کریں آخر اللہ کی راہ میں قربانی کرنی ہے۔ اچھا، خوبصورت جانور تلاش کرو، اگر ہمت نہیں ہے استطاعت نہیں ہے تو نہ کرو جس کی استطاعت نہیں اس پر فرض نہیں۔ البتہ حج پر قربانی ضروری ہے اور حج کے اخراجات میں شامل ہے۔ پھر کیا یہ شکر کا مقام نہیں ہے کہ تمہیں بیٹے ذبح کرنے کا حکم نہیں دیا، تمہیں بھائی ذبح کرنے کا حکم نہیں دیا۔ اللہ کی تو ساری مخلوق ایک سی ہے اس نے ان کو تمہارے تابع کر دیا کہ وہ تمہاری طرف سے قربان ہو کر تمہاری قربانی کا حق ادا کرتے ہیں۔ انسان کو سوچنا چاہیے کہ یہ جانور بھی اس کی طرح اللہ کی مخلوق ہیں لیکن اللہ نے اس مخلوق کو انسان کے لیے مسخر کر دیا ہے اور انسان ان سے سواری کا کام بھی لیتا ہے مزدوری کا بھی۔ اسے ہل میں بھی جوتتا ہے اور پھر اسے اللہ کے نام پر قربان کر دیتا ہے۔ اس کو ذبح کر کے گوشت تقسیم کر دیتا ہے۔ گویا ذبح ہو کر اُس جانور نے بھی اپنی زندگی کا مقصد پا لیا کہ وہ بنا ہی اس لیے تھا کہ انسان کے کام آئے تو انسان کو بھی یہ احساس ہونا چاہیے کہ اللہ نے اُسے کتنی عظمت دی ہے۔ وہ سوچے کہ میں ایک مخلوق کی جان لے کر ثواب لے رہا ہوں اللہ نے اسے میرے لیے اتنا مسخر کر دیا ہے اور مجھے اتنی توفیق دی ہے، میری مِلک میں جانور دیے جو میں اللہ کو راضی کرنے کے لیے اس کی راہ میں قربان کرنا چاہتا ہوں۔ قربانی اللہ کے لیے ہے، اللہ کی طرف متوجہ رہو اس لیے قربانی نہ کرو کہ لوگ کیا کہیں گے کہ اس نے قربانی بھی نہیں کی۔

اللہ کریم فرماتے ہیں یہ تو اس لیے ہے کہ تم اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے توفیق بخشی، موقع بخشا صحت بخشی، مال دیا۔ جب ہم اللہ کی راہ میں قربانی کریں گے، تو امید کی جاسکتی ہے کہ ان رحمتوں کا کوئی حصہ ہمارے دل پر بھی وارد ہوگا جو رحمتیں حضرت ابراہیم علیہ السلام پر نازل ہوئیں جب انہوں نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی گردن پر چھری رکھی۔ جب وہ کیفیتیں پائیں گے تو پھر ہمارے دل سے بھی ہمارے دماغ سے بھی اللہ کا شکر نکلے گا۔ پھر ہم اللہ کے شکر گزار بن سکیں گے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے خلیل اور اولوالعزم رسول تھے، اُن کی شان بہت بلند تھی وہ بہت حلیم الطبع محبت کرنے والے تھے۔ قرآن حکیم میں دوسری جگہ ان کی تعریف یوں بیان ہوتی ہے: يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ ۞ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ (توبہ: 114) ابراہیم (علیہ السلام) بہت محبت کرنے والے بڑے حِلم والے تھے۔ گناہگاروں کے لیے مجھ سے جھگڑا کر رہے ہیں کہ اللہ انہیں معاف کر دے ایسی ہستی کو حکم ہوا کہ بیٹا قربان کر دو۔ بیٹا بھی اسمٰعیل علیہ السلام جیسا، اور آپؑ نے تکبیر پڑھ کر بسم اللہ اللہ اکبر پڑھ کر گردن پر چھری چلا دی۔ یہ تکبیر بھی سنتِ ابراہیمی ہے۔ جو رحمت کے پھول حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اُن کی شان کے مطابق برسے ہم ایک جانور کو اللہ کی راہ میں قربان کر کے امید

رکھتے ہیں کہ ہم پر بھی ان پھولوں کی کوئی پتی برسے۔ یہ شکر گزاری کا مقام ہے۔

کیفیاتِ قلبی مطلوب ہیں:

ہر عمل پر اللہ کی طرف سے اُس عمل کی مخصوص رحمت متوجہ ہوتی ہے۔ اگر کوئی اللہ کا ذکر کرتا ہے تو اور طرح کی رحمت متوجہ ہوتی ہے، تسبیحات پڑھتا ہے تو دوسری طرح کی رحمت پاتا ہے، تلاوت، رکوع سجود کرتا ہے تو اور طرح کی رحمت متوجہ ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر عمل میں نور ہوتا ہے یا ظلمت ہوتی ہے۔ اتباعِ رسالت (صلی اللہ علیہ وسلّم) میں کیے گئے ہر عمل میں نور ہوتا ہے۔ یہ سب باتیں قرآن میں وضاحت سے ارشاد ہوگئیں۔ آج جدید سائنس یہاں پہنچی ہے کہ پانی کے قطرے میں جو ذرات ہوتے ہیں اُن کی تصاویر بنالی ہیں، برف کے ذرّات کی تصاویر بنالی ہیں اور یہ دیکھا گیا کہ ایک قطرے میں ہزاروں ذرّات ہیں اور ہر ذرّے میں ایک خوبصورت تصویر ہے۔ جدید تحقیقات میں اب انہوں نے انسان کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ کی تصاویر بنالی ہیں۔ وہ Energy وہ حرارت جو لفظ کے ساتھ نکلتی ہے اس Energy کو تصویر میں ڈھالا ہے۔ چنانچہ یہ دیکھا گیا کہ جو اچھے الفاظ منہ سے نکلتے ہیں اس کی خوبصورت تصاویر ہیں جبکہ برے الفاظ کی تصویر مسخ شدہ اور دھندلی دھواں دار سی ہے۔ اس پر سائنسدان لکھتا ہے کہ یہ الفاظ جیسے ہوتے ہیں ویسا ہی اثر سننے والے پر مرتب کرتے ہیں۔ اگر خوبصورت ہیں تو اس کے دل کو بھی خوش کرتے ہیں اور اگر خراب ہوں تو اُسے بھی غصہ دلاتے ہیں۔ ہر عمل کی بھی ایک تصویر بنتی ہے جس کے اثرات دوسرے بندے کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ یہی بات یہاں ارشاد ہو رہی ہے کہ اس کیفیت، اس خلوص اس دردِ دل سے قربانی کرو۔ اپنے جانوروں میں سے یا اگر خریدنا ہے تو خوبصورت سا صحتمند جانور خریدو اور اللہ کی راہ میں قربان کرو۔ فرمایا: لَنۡ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوۡمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰـكِنۡ يَّنَالُهُ التَّقۡوٰى مِنۡكُمۡ ۔۔۔ اللہ کے پاس نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون ولیکن اللہ کے پاس تمہارا تقویٰ (پرہیزگاری) پہنچتا ہے۔ کیفیت جو تمہارے دل پر قربانی کرتے وقت وارد ہوتی ہے جسے تقویٰ کہا گیا ہے اس کی اللہ کے نزدیک ایک عظمت ہے۔ اللہ کریم کو جانوروں کا خون بہانے کی ضرورت نہیں ہے۔ گوشت اور خون اللہ کی بارگاہ میں نہیں جاتے۔ اللہ کی بارگاہ میں تمہارے دل کی یہ کیفیت جاتی ہے کہ تم اس غرض سے قربانی کر رہے ہو کہ فلسفہ قربانی تمہارے ذہن اور دل میں ہے اور تم وہ کیفیت وصول کرنا چاہتے ہو۔ تقویٰ اس کیفیت کو کہتے ہیں کہ بندے کا تعلق اللہ سے بندگی کا استوار ہو جائے اور پھر وہ ہر کام کرنے سے پہلے سوچنے لگ جائے کہ اگر یہ کام کیا تو کہیں اللہ کریم ناراض نہ ہو جائیں لہٰذا وہ کام نہیں کرتا۔ یہ رشتہ تقویٰ کہلاتا ہے۔ فرمایا قربانی بھی یہ دلی تعلق بنانے کا ایک ذریعہ ہے اور قربانی سے جو تقویٰ تمہیں نصیب ہوتا ہے وہ اللہ کی بارگاہ میں مقبول ہے۔

ہدایت، احسانِ عظیم ہے:

فرمایا: كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ۔۔۔اس طرح اس (اللہ) نے ان (جانوروں) کو تمہارے لیے مسخر کر دیا تا کہ تم اللہ کی بزرگی بیان کرو اس بات پر کہ اس نے تمہیں ہدایت نصیب فرمائی۔ اللہ نے کتنی مخلوق کو تمہاری خدمت پر لگا دیا اس بات کو سوچو اور اللہ کی بڑائی بیان کرو کہ اس نے تمہیں ہدایت دی اور تمہیں اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم کی اُمت میں پیدا کیا اور کلمہ توحید نصیب فرمایا۔ اللہ ہمیں معاف فرمائے اور ہماری یہ نقل جو ہم کرتے ہیں قبول فرمالے۔ ہم نے دین بھی وراثتاً پالیا اور عبادات کو رسماً ادا کرتے رہتے ہیں۔ ہم صلوٰۃ بھی اس لیے ادا کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے گھر پیدا ہوئے تو ادا کرنی چاہیے، روزہ رکھنا چاہیے۔ ایسا کرنے والے بھی بڑے خوش نصیب ہیں جبکہ اکثریت کو تو اس کا بھی خیال نہیں ہے۔

ہم نے کبھی یہ سوچنے کا تکلف نہیں کیا کہ دنیا میں جو باقی مذاہب ہیں اُن سے اسلام کا موازنہ کریں تو ہمیں اس کا حسن نظر آئے گا۔ ہمارے پاس ہیرا ہے جبکہ لوگوں کے پاس اس کی نقلیں ہیں تو کبھی وہ ہیرا ان نقلوں میں رکھ کے دیکھیں تو ہمیں پتا چلے کہ واقعی ہمارے پاس بہت بڑی نعمت ہے۔ ہم اگر اپنے عقیدۂ توحید کو دنیا کے دوسرے عقائد کے مقابل رکھیں تو پتا چلتا ہے کہ یہ کتنا خوبصورت ہے۔ بت پرستی اور توحید میں کتنا فرق ہے، اللہ کی عبادت اور بندوں کی پوجا میں کتنا فرق ہے، اپنی امیدیں غیر اللہ سے وابستہ کرنے اور ہر دم اللہ سے پیوستہ رہنے میں کتنا فرق ہے!

ہر امید اللہ ہی سے رکھنی چاہیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادِ عالی کا مفہوم ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ اگر جوتی کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو اللہ سے مانگو۔ ہمارے لباس کا سب سے ادنیٰ حصّہ ہے جوتی کا تسمہ اور اللہ اپنی تمام تر عظمت کے باوجود کتنا کریم ہے کہ اتنی عظیم بارگاہ سے ہمیں چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی بانٹ رہا ہے۔

ذرا سوچیئے کہ کوئی دنیوی حکمران یا بادشاہ ہو اور ہم سے خوش بھی ہو تو کیا جوتا پھٹ جائے تو ہم اس سے مانگنے جائیں گے؟ ہماری عزت بھی کرتا ہو ہم سے ملتا بھی ہو پھر بھی ہمیں یہ سوچ کر شرم آجائے گی کہ بادشاہ سے اب ہم جوتا مانگیں! وہ کریم فرماتا ہے، میں کائنات کا حقیقی بادشاہ ہوں اور تمہاری ساری ضرورتوں کا ذمّہ دار میں ہوں، مجھ سے مانگو میرے ساتھ تعلق رکھو، مجھ سے باتیں کرو اپنے دکھ سکھ بیان کرو۔ تم جتنا مانگتے ہو میں خوش ہوتا ہوں۔ دنیا میں کسی سے بار بار مانگو تو وہ ناراض ہو جاتا ہے۔ اللہ ایسا کریم ہے کہ وہ نہ مانگنے پر خفا ہوتا ہے کہ مجھ سے کیوں نہیں مانگتے۔ فرمایا، یہ چیزیں تمہارے تابع کر دیں ہیں: لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ۔۔۔ تمہیں عظمتِ الٰہی کا احساس ہو۔ اللہ کے احسانات کو سمجھو اور پھر اللہ کی بڑائی بیان کرو۔ تمہارے الفاظ سے عظمتِ الٰہی کا اظہار ہو، تمہارے کردار سے عظمتِ الٰہی کا اظہار ہو اور تمہارے افکار سے عظمتِ الٰہی کا اظہار ہو اس بات پر کہ اس نے تمہیں ہدایت بخشی ہے۔

آج کے دور میں جو عمومی گمراہی کا دور ہے اس میں ہدایت عطا کرنا اللہ کا بہت بڑا انعام ہے۔

محسنین کے لیے بشارت:

فرمایا: وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۷﴾ اے میرے حبیب! (صلی اللہ علیہ وسلم) جو خلوصِ دل سے میرے احکام اور شریعت پر عمل کرتے ہیں انہیں دنیا میں ہی خوشخبری سنا دیں۔ جنہیں اخلاص سے عمل نصیب ہو جائے، احسان نصیب ہو جائے انہیں میری رضا کی خوشخبری سنا دو، جنت کی بشارت دو۔

محسن کون ہوتے ہیں، احسان کیا ہے؟ حدیث جبرائیل علیہ السلام میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احسان کی وضاحت فرمائی ہے: قَالَ اَنْ تَعْبُدَ اللهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ او کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (صحیح بخاری) فرمایا، احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی اطاعت، اللہ کی عبادت اس طرح کر گویا تو اللہ کو روبرو دیکھ رہا ہے اور اگر تم میں یہ کیفیت نہیں ہے کہ تم اللہ کی حضوری کا تصور کر سکو تو پھر یقیناً کم از کم یہ یقین رکھو کہ وہ ضرور تمہیں دیکھ رہا ہے۔

احسان کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا اللہ کو سامنے دیکھ رہے ہو اگر یہ نہیں کر سکتے تو کم از کم یہ احساس ضرور رہے کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ جو لوگ اس انداز سے اللہ کی اطاعت کرتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرتے ہیں انہیں خوشخبری سنا دیں۔

ہم سب کچھ کرتے تو اللہ کریم کے سامنے ہی ہیں لیکن ہمیں اس حقیقت کو ماننے کے لیے تیار بھی تو ہونا چاہیے، سمجھنے کے لیے بھی تیار ہوں۔ ہمارا سونا جاگنا، اٹھنا، بیٹھنا، نیکی گناہ، سب ویسے بھی اس کے سامنے ہی ہو رہا ہے، ہر چیز وہ خود دیکھ رہا ہے ہر بات وہ خود سن رہا ہے ہر خیال وہ خود جانتا ہے۔ جو خیال ہمارے دلوں میں ابھی آیا بھی نہیں، کبھی آئے گا وہ اُسے بھی جانتا ہے اور جو آ کر گزر چکا جو ہم بھول چکے اُسے بھی جانتا ہے۔ ہمیں یہ ادراک ہو جائے کہ واقعی ہم اللہ کے روبرو جی رہے ہیں، یہی احسان ہے اور ایسے لوگوں کو جنہیں یہ احسان نصیب ہو جائے اُن کے لیے رضائے الٰہی اور جنت کی بشارت ہے۔

اللہ مومنین کی حفاظت فرماتے ہیں:

دراصل جو محسنین ہیں یعنی جو خلوص سے دین پر عمل کرتے ہیں ان پر کوئی دشمن غالب نہیں آتا، فرمایا: اِنَّ اللهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ اِنَّ اللهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ﴿۳۸﴾ بے شک اللہ ایمان والوں سے (ان کے دشمنوں کو) ہٹاتے رہتے ہیں یقیناً اللہ کسی خیانت کرنے والے کفرانِ نعمت کرنے والے کو نہیں چاہتے۔ اللہ ایسا

کریم ہے کہ ہمیشہ مسلمانوں کی حفاظت فرماتا ہے اُن کے دشمنوں کو ان سے ہٹاتا رہتا ہے چنانچہ مسلمان ہمیشہ کامیاب ہوتے ہیں کفر ناکام ہوتا ہے۔ اللہ کریم کفر کی طاقتوں کو مسلمانوں سے دور فرماتا رہتا ہے اس لیے کہ اللہ خیانت کرنے والوں، کفر اور کفرانِ نعمت کرنے والے ناشکروں کو پسند نہیں فرماتا۔ کیا وہ اپنے ناپسندیدہ لوگوں کو اپنے محبوب لوگوں پر غالب کر دے گا؟ ایسا ہرگز نہیں ہوگا، کبھی نہیں ہوگا۔

قرآن کا فرمان تو درست ہے یہ عہدِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام میں بھی واضح رہا۔ خلفائے راشدین کے عہد میں بھی معلوم دنیا کے تین حصّے فتح ہو گئے۔ کفر کو شکست در شکست ہوتی گئی۔ مگر آج کیا ہو رہا ہے؟ ہر طرف سے مسلمانوں پر ظلم وزیادتی کی خبریں آرہی ہیں۔ برما میں مسلمانوں کو بدھوں نے مار دیا، افغانستان میں مسلمان مر رہے ہیں، پاکستان میں مسلمان مر رہے ہیں۔ مسجد میں قتل ہو رہے ہیں، بازار میں مارے جا رہے ہیں، ہر طرف دھماکے ہو رہے ہیں اور دشمن طاقتیں دندنا رہی ہیں۔ آج کل فلسطین میں مسلمانوں کے قتلِ عام کا بازار گرم ہے تو سوال اٹھتا ہے کہ آج اللہ مسلمانوں کی کیوں مدد نہیں کرتے؟ اس کا آسان سا جواب ہے کہ جب تک مسلمان اسلام پر قائم رہے کوئی ان کا بال بھی بیکا نہیں کر سکا۔ اگر مسلمان ہی کافروں کے شعائر اپنا لیں، اُن کی غذا کافروں جیسی ہو جائے، حلال حرام، پاک ناپاک کی تمیز اٹھ جائے، سود کھانا شروع کر دیں، اُن جیسا کردار اور حلیہ اپنا لے تو پھر حفاظتِ الٰہیہ نصیب نہیں ہوتی کہ اس کا وعدہ تو مومنین کے ساتھ ہے۔ یہ وعدہ نقلی مسلمانوں کے لیے نہیں ہے، قومی مسلمانوں کے لیے نہیں ہے، دلی طور پر مسلمان ہونے والوں کے لیے ہے۔ آج تو اکثریت قومی مسلمانوں کی ہے کہ مسلمان گھرانوں میں پیدا ہوئے لیکن عملی زندگی میں کافروں جیسا نظر آنا چاہتے ہیں۔ آج کے مسلمان کی سوچ یہ ہے کہ کافرانہ حلیہ اور طرزِ بود و باش اپنانے سے وہ معزز ہوگا، اُن کا معاشی اور معاشرتی نظام اپنا کر خوشحال ہوگا چنانچہ جب ہم نے مسلمان ہوتے ہوئے کافر کی پیروی اختیار کر لی تو پھر اللہ کیونکر ہماری مدد کرے گا؟ اللہ کفر کی مدد کیوں کرے گا جبکہ کفر کے لیے تو اللہ کریم فرما رہے ہیں کہ اللہ خیانت کرنے والوں کو ہرگز پسند نہیں کرتے۔ سب سے بڑی خیانت اللہ کے ساتھ شرک کرنا ہے۔ سب سے بڑی بددیانتی ہے کہ کفر کیا جائے اور اس سے بھی بڑی بددیانتی یہ ہے کہ کلمہ پڑھ کر پھر کافروں جیسے کام کیے جائیں۔ یہ سب سے بڑی ناشکری بھی ہے تو ناشکروں کو تو اللہ کی مدد نہیں پہنچتی۔ اللہ کی مدد تو شکر گزاروں کو پہنچتی ہے، اس کے مخلص بندوں کو پہنچتی ہے۔ آج مسلمانوں کا مسئلہ یہی ہے کہ وہ ذہنی اور ظاہری ہی نہیں بلکہ دلی طور پر بھی کفار کی پیروی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ نام دین محمد رکھتے ہیں اور عمل دینِ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے خلاف کرتے ہیں تو اجر تو کام پر مرتب ہوتا ہے۔

کسی کے سامنے لذیذ کھانوں کے نام لیتے رہیں اس سے اس کا پیٹ نہیں بھرتا جبکہ اسے باسی روٹی بھی کھلا دیں تو اس کا پیٹ بھر جائے گا کہ نتائج عمل پر مرتب ہوتے ہیں زبانی دعوؤں پر نہیں۔ مسلمان کا کردار اگر کافروں کی پیروی بن گیا ہے تو پھر آپس میں کافر کافر لڑتے رہیں جس کے پاس دنیوی وسائل زیادہ ہوں گے وہ دوسرے کو مارتا رہے گا۔ اگر آج ہم رسوا ہیں تو ہم اپنے آپ کو دیکھیں کہ ہم کہاں کھڑے ہیں؟ ہماری سوچ کافروں جیسی ہے۔ سودخوری، بدکاری، دھوکہ دہی ہر کافرانہ شعار ہم نے اپنا لیا ہے۔ یعنی آج مسلمان اتنے گر گئے ہیں کہ کردار میں کافروں سے بھی پست ہو گئے ہیں اور پھر اللہ سے شکوہ بھی کرتے ہیں کہ وہ ہماری مدد کیوں نہیں کرتا!

جہاد کے نام پر ہر گھر پر ایک جھنڈا لگ جاتا ہے کہ چندہ دو کہ فلسطین میں لوگ مر رہے ہیں کوئی پوچھے کہ لوگ فلسطین میں مر رہے ہیں چندہ یہ مانگ رہے ہیں! کوئی مرے یا پیدا ہو، خوشی ہو یا غم انہیں چندہ چاہیے۔ اتنا ہی جہاد کا شوق ہے تو وہاں جا کر لڑیں لیکن وہ صرف پیسے مانگتے ہیں کہ ہمیں چندہ دو ہم آگے پہنچا دیں گے۔

تاریخِ اسلام کا درخشاں باب:

تاریخِ اسلام گواہ ہے کہ عہد نبوی علیٰ صاحب الصلوٰۃ والسلام سے لے کر آج تک جن ریاستوں میں اللہ کا دین نافذ رہا وہ ہمیشہ غالب رہیں۔ ایسے مسلمان حکمران بھی رہے جن میں دینداری تھی جو خلوص سے دین پر عمل کرتے تھے اور اللہ اُن کی مدد فرماتے تو بڑے بڑے کافر رسوا ہو جاتے تھے۔ یہ تاریخی حقیقت ہے۔

تاتاریوں نے تمام شمال مغربی اسلامی ریاستیں تباہ کر دیں یہاں تک کہ ہلاکو خان نے پشاور فتح کر لیا اور اس کی افواج نوشہرہ تک آئیں۔ دراصل ہلاکو خان خوارزم شاہ کے بیٹے کا تعاقب کرتا ہوا نوشہرہ تک پہنچا۔ خوارزم شاہ نے تو تاتاریوں سے صلح کر کے سارا ملک اُن کے حوالے کر دیا تھا پھر بھی مارا گیا تھا جبکہ اس کا بیٹا مجاہد تھا اور لڑتا رہا اور ہلاکو خان اس کے تعاقب میں پشاور اور نوشہرہ تک آیا۔ بالآخر وہ مجاہد گھوڑے پر سوار نوشہرہ سے نکلا اور اس نے اپنا گھوڑا دریائے سندھ میں ڈال دیا پیچھے ہلاکو خان کے سپاہی بھی پہنچ گئے۔ انہوں نے اس پر تیر برسانے کے لیے کمانیں کھینچی تو ہلاکو خان نے انہیں روک دیا۔ اس نے کہا کہ دہلی میں سلطان التمش کی حکومت ہے یہ دریا اس کی حکومت اور ہمارے مقبوضہ علاقے میں سرحد ہے۔ اس پر تیر نہ چلاؤ اگر وہ بگڑ گیا کہ اس کے علاقے میں کسی پر تیر کیوں چلایا گیا تو وہ ہمیں بھگا کر کابل سے بھی پیچھے دھکیل دے گا۔

سلطان التمش کیسا بادشاہ تھا جس سے ہلاکو خان بھی لرزتا تھا؟ سلطان التمش خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا شاگرد تھا، صوفی تھا، سلوک سیکھتا تھا، اللہ اللہ سیکھتا تھا۔ جب خواجہ صاحبؒ کا وصال ہوا تو انہوں نے

وصیت فرمائی کہ میرا جنازہ وہ شخص پڑھائے جس نے کبھی تہجد نہ چھوڑی ہو کبھی بے وضو آسمان نہ دیکھا ہو یعنی کبھی بے وضو باہر نہ نکلا ہو۔

جب جنازہ رکھا گیا تو مشائخ پیرانِ کرام، علما اور ہر طرح کے دیندار لوگ بھی موجود تھے اُن کے مریدین بھی تھے ایک جمِ غفیر تھا۔ خادم نے وصیت پڑھ کر سنائی تو سناٹا چھا گیا۔ کافی دیر انتظار کے بعد کسی سردار نے کہا کہ حضرت لگتا ہے کہ آپ کا جنازہ کوئی نہیں پڑھائے گا، لگتا ہے آپ کو ایسے ہی رکھا جائے گا۔ سلطان التمش ایک طرف سے سب کو چیرتا ہوا باہر نکلا اور کہنے لگا حضرت یہ باتیں تو آپ کے اور میرے درمیان تھیں آپ نے سب کو بتا دیا۔ اس نے کہا کہ جنازہ میں پڑھاتا ہوں۔ جس حکمران نے بے وضو کبھی آسمان نہ دیکھا ہو، فرض تو فرض کبھی تہجد نہ چھوڑی ہو کیا اس کے عہد میں اسلام نہیں تھا؟ اسلام کی ہیبت اتنی تھی کہ ہلاکو خان نے اپنے تیر اندازوں کو روک دیا کہ بندہ تو مطلوب ہے لیکن التمش کی حکومتی سرحد میں داخل ہو گیا ہے اس پر تیر نہ چلایا جائے۔ حالانکہ وہ کتنی اسلامی ریاستوں کو تاراج کر چکا تھا لیکن سلطان التمش کی سرحد پر اس کا ہاتھ لرز گیا۔

اسی زمانے میں تاتاریوں کا ایک معروف جرنیل قبلائی خان بھی تھا جو غالباً ہلاکو خان کا بھتیجا تھا اور بہت مانا ہوا جرنیل تھا۔ مصر میں اسلامی ریاست تھی، سلطان بیبرس کی حکومت تھی جو ایک مسلمان حکمران تھا۔ قبلائی خان کے لشکر نے حملہ کیا تو سلطان بیبرس نے مقابلہ کیا اس کو قتل کیا، اس کے لشکر کو تباہ کرنے کے بعد قبلائی خان کی لاش کے ٹکڑے شہر کے دروازوں پر لٹکا دیے تاکہ لوگوں کو پتا چل جائے کہ تاتاری ناقابلِ تسخیر نہیں ہیں۔ اس کے بعد تاتاریوں کو کبھی مصر پر حملہ کی جرأت نہ ہوئی۔ یہ ہے ہماری تاریخ کے درخشاں باب جن سے ہم بے بہرہ ہیں۔

سورۃ الحج رکوع 6 آیات 39 تا 48

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ﴿۳۹﴾
الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَلَوْلَا
دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ
وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ؕ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
لَقَوِىٌّ عَزِيْزٌ ﴿۴۰﴾ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا
الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۴۱﴾
وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّثَمُوْدُ ۙ﴿۴۲﴾ وَقَوْمُ
اِبْرٰهِيْمَ وَقَوْمُ لُوْطٍ ۙ﴿۴۳﴾ وَّاَصْحٰبُ مَدْيَنَ ۚ وَكُذِّبَ مُوْسٰى فَاَمْلَيْتُ
لِلْكٰفِرِيْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۚ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۴۴﴾ فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا
وَهِىَ ظَالِمَةٌ فَهِىَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ ﴿۴۵﴾
اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَاۤ اَوْ اٰذَانٌ
يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى
الصُّدُوْرِ ﴿۴۶﴾ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ؕ وَاِنَّ يَوْمًا
عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴿۴۷﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِىَ
ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ وَاِلَىَّ الْمَصِيْرُ ﴿۴۸﴾

(اب) ان (مسلمانوں) کو (لڑنے کی) اجازت دے دی گئی جن سے (کافروں کی طرف سے) لڑائی کی جاتی ہے اس لیے کہ ان پر (بہت) ظلم کیا گیا اور یقیناً اللہ ان کی مدد پہ قادر ہے ﴿۳۹﴾ جو لوگ اپنے گھروں سے بے وجہ نکالے گئے محض اتنی سی (بات) پر کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے۔ اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے سے نہ ہٹاتے رہتے تو (راہبوں، درویشوں کے) صومعے (خلوت خانے) اور گرجا گھر اور (یہودیوں کے) عبادت خانے اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے ضرور ویران ہو چکی ہوتیں۔ اور اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اس (کے دین) کی مدد کرے گا۔ بے شک اللہ بہت قوت والے، غالب ہیں ﴿۴۰﴾ یہ لوگ (ایسے ہیں کہ) اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دے دیں تو نماز کی پابندی کریں اور زکوۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برُے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے ﴿۴۱﴾ اور اگر یہ لوگ آپ کو جھٹلاتے ہیں (تو آپ غم نہ کریں) کہ بے شک ان سے پہلے قومِ نوحؑ اور عاد اور ثمود نے (بھی) جھٹلایا تھا ﴿۴۲﴾ اور قومِ ابراہیمؑ اور قومِ لوطؑ نے (بھی) ﴿۴۳﴾ اور مدین کے رہنے والوں نے (بھی)۔ اور موسیٰ (علیہ السلام) کو (بھی) جھٹلایا گیا پس ہم نے کافروں کو مہلت دی پھر ان کو پکڑ لیا تو (دیکھ لیجیے) میرا عذاب کیسا ہوا ﴿۴۴﴾ غرض کتنی ہی بستیاں ہیں جن کو ہم نے ہلاک کیا کہ وہ ظالم (غلط کار) تھیں پس وہ اپنی چھتوں پر گری پڑی ہیں اور (بہت سے) کنویں بے کار اور (بہت سے) مضبوط محل (ویران پڑے ہیں) ﴿۴۵﴾ تو کیا یہ زمین (ان علاقوں) میں چلے پھرے نہیں کہ ان کے دل ایسے ہوتے کہ ان سے سمجھ جاتے اور کان (ایسے) ہوتے کہ ان سے سُن سکتے بات یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں ولیکن دل جو سینوں کے اندر ہیں وہ اندھے ہو جایا کرتے ہیں ﴿۴۶﴾ اور یہ لوگ آپ سے جلدی عذاب کا تقاضا کر رہے ہیں اور اللہ ہرگز اپنے وعدے کے خلاف نہ کریں گے۔ اور بے شک آپ کے پروردگار کے

نزدیک ایک دن تم لوگوں کے شمار کے مطابق ایک ہزار سال کا ہے ﴿۴۷﴾ اور بہت سی ایسی بستیاں ہیں جن کو ہم مہلت دیتے رہے اور وہ غلط کار تھیں پھر ہم نے ان کو پکڑ لیا اور (سب کو) میری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے ﴿۴۸﴾

تفسیر و معارف

اسلام نے ہمیشہ دفاعی جنگ لڑی ہے:

مغربی دنیا نے اس بات کا بہت چرچا کیا ہے کہ مسلمانوں نے بزورِ شمشیر اسلام پھیلایا جبکہ اسلام نے روز اوّل سے صرف دفاعی جنگ لڑی ہے۔ مسلمان کسی ملک پر قبضہ کرنے کی نیت سے کبھی حملہ آور نہیں ہوئے۔ مکہ مکرمہ میں تیرہ برس مسلمانوں کو دفاع کی اجازت بھی نہ تھی ظلم کے جواب میں لڑنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ دنیا کی واحد قوم ہے جس نے تیرہ برس دنیا کا ہر دکھ سہا لیکن اُف تک نہیں کی۔ ان پر کیا کیا ظلم نہیں ڈھائے گئے، گرم لوہے کی سلاخوں سے داغے گئے، گرم ریت پر لٹا کر اوپر پتھر رکھے گئے، شہید کیے گئے اور ہر ممکن ایذا دی گئی لیکن کسی نے جواب میں ہاتھ نہیں اٹھایا۔ کیسی عجیب قوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمادیا کہ تمہیں ہاتھ نہیں اٹھانا، اور ایک دن یا دس دن کی بات نہیں پورے تیرہ برس مسلمانوں نے ہر دکھ سہا لیکن اُف نہیں کی، ہاتھ نہیں اٹھایا۔

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

انسانوں کو جوش دِلا کر بھڑکا کر لڑا دینا اور بات ہے اور شعوری طور پر انہیں اس بات پر مطمئن کر دینا کہ تمہیں اللہ اجر دے گا تم ہر دکھ اللہ کے لیے سہہ جاؤ لیکن ہاتھ نہ اٹھاؤ، یہ فلسفہ صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے نافذ کیا۔ یہ بات دنیا کے لیے ناقابلِ فہم اور ناممکن ہے۔

مسلمان مکہ میں بے حد ستائے گئے حتیٰ کہ شہر سے نکال دیے گئے۔ اُن سے جائیدادیں اور مال و متاع چھین لیے گئے گھر خالی کرا لیے گئے۔ باغات، زمینیں مکان، مال و دولت سب چھوڑ کر فقیر ہو کے نکل گئے۔ مدینہ جاگزیں ہوئے تو مکہ والوں نے منصوبہ بندی کر دی کہ اب انہیں مدینہ جا کر مارا جائے تو اللہ کریم نے فرمایا کہ اب تم دفاع کرو۔ تیرہ برس کی آزمائش میں اللہ کے بندوں نے اپنا خلوص ثابت کیا تو ارشاد ہوا: اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا۔۔۔ اب ان (مسلمانوں) کو لڑنے کی اجازت دے دی گئی ہے جن سے (کافروں

کی طرف سے) لڑائی کی جاتی ہے اس لیے کہ ان پر بہت ظلم کیا گیا۔ مسلمانو! اب تمہیں اپنے دفاع کی، جہاد کی اجازت ہے اس لیے کہ تمہارے ساتھ ان لوگوں نے ظلم کی انتہا کر دی اور اب یہاں بھی چین سے نہیں رہنے دیتے تو اب مسلمان اپنے دفاع میں شمشیر بکف ہو جائیں۔

رہی یہ بات کہ مسلمان مدینہ منورہ میں تھوڑے سے ہیں جبکہ اہل مکہ طاقتور ہیں اُن کی حمایت میں مختلف قبائل بھی اُن کے ساتھ ہیں اور دنیا پر بھی کفر پھیلا ہوا ہے تو اللہ کریم فرماتے ہیں، وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۝۳۹ اور یقیناً اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔ کسی بات کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں مسلمان اگر تھوڑے بھی ہیں تو میرے بندے ہیں میں ان کے ساتھ ہوں۔ تم دفاع کرو میں تمہاری مدد پر قادر ہوں تمہاری فتح دینے پر قادر ہوں، میں تمہاری مدد کروں گا۔

غزوۂ بدر میں ہی اللہ کی مدد سب نے دیکھ لی! اسلام تب سے دفاعی جنگیں لڑنے لگا۔ قیصر و کسریٰ پر بھی مسلمان حملہ آور نہیں ہوئے تھے بلکہ انہوں نے حملہ آور ہونے کی کوشش کی اور مسلمانوں نے دفاعی جنگ لڑی جس کے نتیجے میں اُن کی سلطنتیں چلی گئیں۔ مسلمانوں نے جتنی ریاستیں فتح کیں وہ سب مسلمانوں پر حملہ آور ہوئیں اور مسلمانوں نے اپنے دفاع میں جنگ لڑی اور فتح پائی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کے آخری حصے میں انہوں نے فرمایا کہ اب جبکہ کوئی قوم ہم پر حملہ نہیں کرتی تو ہم کسی پر حملہ نہیں کریں گے چنانچہ فتوحات روک دی گئیں۔ فرمایا، جو لوگ ہم پر حملہ آور ہوتے تھے وہ ختم ہو گئے، اللہ نے بے پناہ علاقہ زیر کر دیا ہے جس میں بے پناہ مخلوق ہے لہٰذا ان کے حقوق پورے کرنے کی طرف توجہ دی جائے۔

عہد فاروقیؓ میں 26 لاکھ مربع میل علاقہ فتح ہوا لیکن فتوحاتِ اسلامی میں کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی گئی کسی سے چھینا جھپٹی نہیں کی گئی اور تمام جنگیں اپنے دفاع میں لڑی گئیں۔

حقیقی انقلاب:

آج لوگ انقلاب کے نعرے لگاتے ہیں، باتیں کرتے ہیں لیکن ان لوگوں کو انقلاب کی حقیقت کا علم نہیں ہے، یہ نہیں جانتے کہ انقلاب کیا چیز ہے۔

انقلاب وہ ہے جو آقائے نامدار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برپا کیا۔ انقلاب وہ ہے جو اصحابِ بدر نے بدر میں برپا کیا کہ بڑے بڑے متکبر و جابر حکمرانوں اور نظاموں کو تہس نہس کر کے عدل و انصاف کے نظام کو، اللہ کے دین کو نافذ کر دیا۔ مسلمانوں نے چند برسوں میں چین سے افریقہ تک کا علاقہ فتح کر لیا تھا۔ امریکہ کا مغربی حصہ ہسپانوی

مسلمانوں نے کولمبس سے پانچ سو برس پہلے فتح کرلیا تھا۔

آج تو کہیں چیونٹی مر جائے تو کہتے ہیں انقلاب آ گیا۔ انقلاب نام ہے اس تبدیلی کا جو آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلّم نے برپا کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت سے پہلے روئے زمین درندوں کا جنگل بن چکا تھا۔ ہر انسان دوسرے انسان کا دشمن تھا ہر طاقتور ہر کمزور کا استحصال کرنے میں مصروف تھا کسی کمزور کی جان، مال اور آبرو محفوظ نہ تھی کہ ایک انقلاب آیا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے برپا کیا۔ تیئس برس کی محدود مدت میں، جس میں سے تیرہ برس تو مکہ مکرمہ میں تبلیغ میں گزرے۔ مدینہ منورہ ہجرت کے بعد جب جہاد کی اجازت ملی تو دس برسوں میں پورے جزیرہ نمائے عرب پر عملاً اسلام نافذ ہو چکا تھا۔ ہر ایک کے حقوق محفوظ ہوئے اور امن قائم ہو گیا تھا۔ عدل اور انصاف ہر انسان کو میسّر ہو گیا۔ جزیرہ نمائے عرب پر اسلامی ریاست قائم ہو چکی تھی اور اس کی بنیادیں بے حد مضبوط تھیں اور اس کے قوانین انسانی مزاج سے اتنے ہم آہنگ تھے کہ روئے زمین کی اقوام تک جب اس کی خبر پہنچی تو لوگ اسے قبول کرتے گئے۔ مدینہ میں دس سال قیام کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلّم دنیا سے پردہ فرما گئے۔ خلافتِ راشدہ کے تیئس برسوں میں معلوم دنیا کے تین چوتھائی حصّوں پر اسلامی ریاست قائم ہو گئی اور جتنی فتوحات ہوئیں یہ سب دفاعی جنگوں کے نتیجے میں ہوئیں۔ ایک وسیع علاقہ جس کی سرحد ایک طرف چین سے ملتی تھی تو دوسری طرف افریقہ میں تھی۔ ایک طرف آدھا ہندوستان اس میں شامل ہو چکا تھا جبکہ دوسری طرف یورپ کو چھو رہی تھی۔ اس ساری ریاست میں اسلام نافذ تھا۔

عہدِ فاروقیؓ میں چھبیس یا ستائیس لاکھ مربع میل کا علاقہ فتح ہوا جبکہ تاریخ میں جن فاتحین عالم کے نام آتے ہیں اُن میں سے کسی نے پچاس ہزار مربع میل فتح کیا اور کسی نے ایک لاکھ کسی نے دو اور کسی نے تین لاکھ مربع میل فتح کیا۔ ایک فاتح کا حال ملتا ہے کہ اس نے سات لاکھ مربع میل علاقہ فتح کیا۔ تاریخ میں فاتحین عالم میں سب سے اوپر جو نام ہے وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ہے۔ پھر صرف یہی نہیں کہ مسلمانوں نے اتنا علاقہ فتح کیا بلکہ کمال یہ ہے مسلمان جہاں جہاں سے گزرتے گئے عدل پھیلاتے گئے۔ خلافتِ راشدہ میں اسلامی ریاست کے طول و عرض سے کسی بوڑھے کی آہ سنائی دیتی ہے نہ کسی عورت کی چیخ، نہ ہی کسی کے آنسو دکھائی دیتے ہیں کہ اس پر ظلم ہوا۔ اقوامِ عالم جب فاتح بن کر مفتوحہ علاقے میں داخل ہوتی ہیں تو اس کا نقشہ قرآن کریم نے یوں کھینچا ہے: اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۔۔۔(النمل:34) کہ بادشاہ جب بحیثیتِ فاتح کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو اسے تہہ و بالا کر دیتے ہیں، اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے ہیں اور بڑے بڑے معزز لوگ رسوا ہو جاتے ہیں۔

اسلام کی فتوحات اس کے بالکل برعکس تھیں۔اتنی عظیم الشان ریاست میں بحیثیت فاتح امن قائم رکھنا، عدل مہیا کرنا ہر ایک کی جان مال اور آبرو کو تحفظ مہیا کرنا، غیر مسلم شہریوں کو بھی ہر طرح کا تحفظ دینا یہ اسلامی ریاست کا خاصہ تھا۔ یہ حقیقی انقلاب تھا جو دنیا پر برپا ہوا۔ یہ اس لیے ہوا کہ جس اللہ نے مسلمانوں کو جہاد کی اجازت دی وہ اللہ اُن کی مدد پر بھی قادر تھا اور اسی نے انہیں فتوحات سے نوازا۔

ایک تاریخی جھوٹ:

امریکہ کی دریافت کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ اُسے کولمبس نے دریافت کیا جو ایک تاریخی جھوٹ ہے۔ ہسپانیہ کے مسلمانوں نے کولمبس سے پانچ سو برس پہلے مغربی امریکہ پر اسلام پھیلایا تھا۔ ملکہ ازابیلا نے کولمبس کو ہسپانیہ کے مسلمانوں کے قتل عام کے بعد مغربی امریکہ بھیجا تھا تاکہ وہاں جاکر مسلمانوں کا قتل عام کرے۔ کولمبس تو گیا ہی اس مقصد کے لیے تھا۔ مغربی امریکہ کا وہ حصہ آج بھی اگر دیکھیں تو اُن شہروں کے نام بھی اسلامی ہیں گلیوں اور محلوں کے نام اسلامی ہیں۔ لوگوں کے گھروں کی بناوٹ اسلامی طرز پر ہے بلکہ وہاں مکہ سٹریٹ اور مدینہ سٹریٹ ابھی تک موجود ہے۔

یہ تاریخی جھوٹ ہے کہ کولمبس ہندوستان ڈھونڈنے نکلا تھا اور امریکہ جا پہنچا۔ کیسا قابل جرنیل تھا جانا ہندوستان تھا، جا پہنچا امریکہ! کیا وہ اندھا تھا کہ الٹا جہاز چلاتا رہا؟ اسے اگر ہندوستان جانا تھا تو افریقہ کے نیچے سے ہوکر شمال جانا تھا تو کیا وہ الٹا جہاز چلاتا رہا؟ اُسے جانا ہی امریکہ تھا اور اُسے ملکہ نے، جو مسلمانوں کی سخت دشمن تھی، بھیجا تھا تاکہ مسلمانوں کا قتلِ عام کرے۔ کولمبس نے مسلمانوں کا قتل عام بھی کیا اور ساتھ امریکیوں کے قبائل کو بھی تہس نہس کر دیا۔

مسلمانوں کو ہجرت پر کیوں مجبور کیا گیا؟

فرمایا: اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ۔۔۔ جو لوگ اپنے گھروں سے بے وجہ نکالے گئے۔ محض ان پر ظلم کیا گیا اور انہیں گھروں سے نکلنے پر مجبور کیا گیا۔ ان کا جرم کیا تھا؟ فرمایا: اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ۔۔۔ محض اتنی سی بات پر کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ ہمارا پالنہار ہے، ہماری تمام ضرورتیں پوری کرنے والا ہمارا رب ہے لہٰذا ہم صرف اللہ کے سامنے عاجزی کریں گے۔ ہم صرف اللہ کی اطاعت کریں گے اسی کا حکم مانیں گے۔ اللہ ہی ساری کائنات کا رب ہے اور ہماری ساری ضروریات کا کفیل ہے۔

اللہ کا اپنا نظام:

اللہ کریم کا اپنا نظام ہے کہ جب ظلم بڑھتا ہے، زیادتی بڑھتی ہے تو اس کے ردّ کا بھی سبب بنا دیتے ہیں۔ فرمایا: وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ ۔۔۔اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے سے نہ ہٹاتے رہتے تو لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۔۔۔تو (راہبوں، درویشوں کے) صومعے (خلوت خانے) اور گرجا گھر اور (یہودیوں کے) عبادت خانے اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے ضرور ویران ہو چکی ہوتیں۔

دینِ موسویؑ اور دینِ عیسویؑ بھی اپنے وقت میں اسلام تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کا دین جب تک رہا یہودیوں کے عبادت خانے بھی مساجد ہی تھے اور جب تک عیسیٰ علیہ السلام کے دین میں تحریف نہیں ہوئی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ عالی نہیں ہوئی تھی اُن کے عبادت خانے بھی مساجد ہی کا حکم رکھتے تھے۔ اسی لیے تینوں کا ذکر فرمایا کہ اپنے اپنے دور میں تینوں اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کے مراکز تھے ورنہ عبادت خانے تو مجوسیوں کے بھی ہوتے ہیں، بُت پرستوں کے بھی ہیں لیکن انہیں شمار نہیں کیا گیا۔ اس لیے کہ وہ کسی زمانے میں بھی حق پر نہیں تھے اور یہ چونکہ ادیان سابقہ اور اللہ کے سچے برحق انبیاؑ کی تعلیمات تھیں۔ چنانچہ جب تک ان کے ادیان میں تحریف نہیں کی گئی تب تک ان کی عبادت گاہیں بھی اللہ کی عبادت کے مراکز تھے۔

فرمایا، اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کی وجہ سے دور نہ فرماتے رہتے تو ظلم اس قدر بڑھ جائے کہ صرف شہروں سے بڑھ کر دیہاتوں اور دیہاتوں سے گھروں تک ہی تباہی نہ آتی بلکہ اللہ کی عبادت گاہیں بھی محفوظ نہ رہتیں۔ یہ ظلم کی انتہا ہوتی ہے۔

وطنِ عزیز میں بھی یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ پہلے دہشت گردی کا آغاز دھماکوں سے ہوا جو ہوٹلوں میں ہوئے، بازاروں میں ہوئے، سرکاری دفاتر میں ہوئے پھر رفتہ رفتہ وہ مساجد تک پہنچ گئے۔ یہ انتہا ہوتی ہے کہ بالآخر مساجد اور عبادت گاہیں بھی محفوظ نہ رہیں اور مسجد کی تعریف قرآن کریم نے فرمائی ہے کہ مساجد سجدہ سے بنا ہے تو مسجد سجدہ گاہ ہے۔ اس میں ہر وقت رکوع اور سجود ہوتا ہے۔ صلوٰۃ پنجگانہ ادا ہوتی ہے، نوافل پڑھنے والے رات دن اسے آباد رکھتے ہیں لیکن مسجد کی جو نشانی اللہ کریم نے بتائی ہے وہ، وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۔۔۔وہ مساجد جن میں کثرت سے اللہ کا ذکر ہوتا ہے۔ فرمایا مساجد وہ ہیں جہاں اللہ کے نام کا ذکر کثرت سے ہوتا ہے، جہاں اللہ کے نام کی تکرار علی الدوام کی جائے۔ انسانی زندگی میں سب سے زیادہ کام کیا، کیا جاتا ہے؟ دو کام ایسے ہیں جو ہر فرد زندگی میں

سب سے زیادہ کرتا ہے ایک دل کی دھڑکن اور دوسرا سانس کی آمدوشد۔

سب سے پہلے شکمِ مادر میں دل بنتا ہے اور یہ بنتے ہی دھڑکنا شروع کر دیتا ہے اور اس کی دھڑکن سے جو خون اس گوشت کے لوتھڑے کو پہنچتا ہے اس سے آگے باقی اعضاو جوارح بنتے چلے جاتے ہیں۔ ہاتھ پاؤں، آنکھ، کان، ہڈیاں، دماغ بنتا ہے۔ دل ان سب سے پہلے دھڑکنا شروع کرتا ہے اور آخری سانس کے رخصت ہونے تک دھڑکتا رہتا ہے تو زندگی میں جو کام ہم نے سب سے زیادہ کیا وہ دل کی دھڑکن تھی۔ ہم سو رہے ہیں وہ دھڑک رہا ہے۔ ہم بے ہوش ہو گئے لیکن وہ دھڑک رہا ہے ہم بہت مصروف ہوں یا فارغ ہوں دل دھڑکتا ہی رہتا ہے۔ دوسرا کام ہے سانس لینا، جیسے ہی پیدا ہوئے ہم نے سانس لینا شروع کر دیا اور جب سانس رک گئی تو ہم بھی نہ رہے۔ اہل اللہ نے ذکرِ اسمِ ذات کو ان دونوں سے جوڑ دیا کہ سانس آئے تو اللہ کا نام لے، خارج ہو تو اللہ کا نام لے، اس عمل کا نام اہل تصوف نے پاس انفاس رکھا۔ سانس اللہ کے نام کے ساتھ چلے اور دل کی دھڑکن بھی اللہ کے نام لے۔

مساجد کی آبادی یہ ہے کہ اس میں ایسے لوگ ہوں جن کی دھڑکن میں بھی اللہ کا ذاتی نام ہو اور جن کی سانس میں بھی اللہ کا نام رچا بسا ہو کہ مسجد کی تعریف ہی یہ فرمائی ہے کہ یُذْکَرُ فِیْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِیْرًا۔۔۔ اس میں اللہ اللہ کا ذکر کثرت سے کیا جائے۔ گویا کوئی انسان جتنے زندگی میں کام کرتا ہے اُن سب سے زیادہ اللہ کے نام کا ذکر کرے۔

یاد رہے کہ ہر کام خواہ دین کا ہو یا دنیا کا جب وہ شریعت کے مطابق کیا جائے تو وہ دین بن جاتا ہے اور عبادت شمار ہوتا ہے۔ چونکہ اس میں اللہ کا ذکر موجود ہے کہ اس نے وہ کام اس طریقے سے اس لیے کیا کہ وہ اللہ کا حکم تھا چنانچہ وہ عملی ذکر ہے۔ زبان سے تسبیحات پڑھتا ہے، تلاوت کرتا ہے، درود شریف پڑھتا ہے، نیکی کی بات کرتا ہے، بھلائی کی تلقین کرتا ہے، کسی کو برائی سے روکتا ہے دین کی تبلیغ کرتا ہے یہ سارا ذکرِ لسانی ہے۔ قرآن جس ذکر کا مطالبہ کرتا ہے وہ ذکرِ قلبی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا یہ معجزہ تھا کہ جو سامنے آیا وہ خلقِ ہدایت کا ستارہ بن گیا وہ صحابی ہو گیا۔ صحابہؓ میں بھی یہ کمال تھا کہ اُن کی صحبت میں آنے والا تابعی ہو گیا اور تابعین میں بھی یہ کمال تھا کہ اُن کی نگاہ میں آنے والا تبع تابعی ہو گیا۔ یہ تین بہترین زمانے خیر القرون کہلاتے ہیں۔ اس کے بعد یہ نہیں کہ برکات میں کمی ہو گئی بلکہ وجودوں میں کمی آ گئی ظلمت آ گئی لہٰذا محنت و مجاہدہ کرنے کی ضرورت پیش آئی تا کہ اپنے آپ کو اس قابل بنایا جائے کہ ان برکات کا حصّہ ہم بھی حاصل کر سکیں چنانچہ ہمیں اپنے دلوں کو اسمِ ذات سے رگڑنا پڑا انہیں صاف کرنا پڑا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشادِ عالی ہے لِكُلِّ شَيْءٍ صِقَالَةٌ وَاصِقَالَةُ الْقُلُوْبِ ذِكْرُ اللّٰهِ او کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم۔ ہر چیز کو چمکانے کی پالش ہوتی ہے اور دلوں کی پالش اللہ کا ذکر ہے۔ مساجد کی تو تعریف ہی یہ ہے کہ وہاں کثرت سے

اسمِ ذات کا ذکر ہوتا ہے۔

نصرت الٰہی کے حقدار:

اللہ کریم نے ایک قانون ارشاد فرما دیا، وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ۔۔۔اور اللہ ان کی مدد کرتے ہیں جو اللہ کی مدد کرتے ہیں۔ اللہ تو وحدہٗ لاشریک ہیں، قائم بالذات ہیں، کسی کے تعاون کے محتاج نہیں اللہ کا یہ فرمانا اس کے کرم کا ایک انداز ہے۔ ایک انسان اپنی انسانی حد تک محنت کرے گا، سجدہ کرے گا، دعا مانگ لے گا، حلال کھانے کی کوشش کرے گا، حرام سے بچنے کی کوشش کرے گا۔ یہ سب وہ اپنی امکانی حد تک ہی کرے گا اور اللہ کریم فرماتے ہیں میں اس کی مدد اپنی شان کے مطابق کروں گا کہ: اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۴۰﴾ بے شک اللہ بہت طاقت والے بھی ہیں اور غالب بھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو میری اور میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتا ہے وہ میرے دین کی مدد کرتا ہے اور جو میرے دین کی مدد کرتا ہے وہ میری مدد کر رہا ہے۔ یاد رہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو چیزیں عطا فرمائیں، ایک ایمان باللہ، ایمان بالرسالت اور یقین کی کیفیت جو دل کو عطا کی اور دوسری چیز جو عطا فرمائی وہ ایک مکمل نظامِ حیات تھا جس میں جینے مرنے، سونے جاگنے، تعلقات و معاملات، معاشیات، سیاسیات تعلیم و تعلم، عدلیہ غرضیکہ زندگی کے تمام شعبوں کا احاطہ کیا گیا اور ان کے اصول عطا کیے۔ صحابہ کرامؓ نے دل و جان سے اسے اپنایا وہ اس قدر اطاعت شعار تھے تو نصرت الٰہی ان کے ساتھ تھی۔ مدینہ منورہ میں جب حرمتِ شراب کی آیت نازل ہوئی تو چونکہ شراب تو اہل عرب کی گھٹی میں تھی تو چند گھروں کے علاوہ ہر گھر میں شراب کے بڑے بڑے مٹکے رکھے ہوئے ہوتے تھے۔ لوگ پانی کی جگہ شراب پیتے تھے۔ شراب کی تجارت کی جاتی اور ان بیوپاریوں کے پاس شراب کا ذخیرہ ہوتا تھا تو جب حرمت کی آیت نازل ہوئی اس وقت بھی شراب سے لدے ہوئے قافلے مدینہ میں کھڑے تھے۔ لیکن جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کی حرمت کا اعلان فرما دیا تو ہر ایک نے اپنے مٹکے توڑ دیے تاجروں نے شراب سے بھرے مشکیزے پھاڑ دیے۔ جو قافلے شراب کے مشکیزوں سے لدے کھڑے تھے وہیں اونٹوں پر لدے ہوئے مشکیزے چاک کر دیے گئے، مدینہ منورہ کی تاریخ میں اتنی شراب گلیوں میں بہائی گئی کہ مہینوں بعد بھی جب بارش ہوتی تو زمین پر بلبلے سے بنتے اور جھاگ سی بن جاتی تھی۔ کسی نے یہ نہیں کہا کہ شراب چھوڑنا مشکل ہے۔ آنِ واحد میں حکم ملا اور انہوں نے ساری شراب ضائع کر دی۔ آج ہماری ایک عجیب سوچ ہو گئی ہے کہ ہم صحابہ کرامؓ کی اطاعت و جاں نثاری کو نہیں دیکھتے بلکہ صرف کرامت سمجھتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک جلسے میں ایک مولانا تقریر فرما رہے تھے اور جہاد کو محض کرامات سے منسوب کر رہے تھے۔ فرماتے ہیں کہ ایک جہاد میں مسلمانوں نے قلعے کا محاصرہ کر رکھا تھا، صبح

جب مسلمانوں نے (مسواک) کیے تو کافر قلعہ چھوڑ کر بھاگ گئے کہ یہ لوگ تو لکڑیاں کھا رہے ہیں ہمیں بھی کھا جائیں گے۔ اسی طرح ایک اور جہاد کا تذکرہ فرماتے ہوئے مولانا کہنے لگے کہ صحابہؓ فلاں جگہ گئے اور انہوں نے نعرہ تکبیر بلند کیا تو قلعہ زمین بوس ہو گیا اور کافر بھاگ گئے۔ مولانا کے بعد جب میری باری آئی تو میں نے کہا کہ اُن لوگوں نے اللہ کی راہ میں جانیں قربان کیں۔ اللہ کریم فرماتے ہیں یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ۔۔۔ (التوبہ:111)

میں نے عرض کی کہ صحابہ کرامؓ نے مجاہدہ کیا اللہ کی راہ میں لڑے جانیں پیش کیں، کفار کو قتل کیا، مقابلے کیے معرکہ بدر میں بھی چودہ صحابہؓ شہید ہوئے جبکہ ستر کفار کو واصل جہنم کیا، ستر کفار کو قیدی بنایا۔ شہدا کی ایک طویل فہرست ہے۔ عہدِ رسالت پناہی میں سید الشہدا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ سے لے کر عہدِ خلافت تک شہدا کی فہرست پڑھی جائے تو سمجھ آتی ہے کہ انہوں نے اپنی جانیں نثار کیں، پھونک مارنے سے قلعے فتح نہیں ہوئے۔ یہ سراسر زیادتی ہے کہ اُن کے کردار کو محض کرامات کہہ دیا جائے اور آج کا مسلمان یہ کہہ کر دامن بچالے کہ صحابہؓ کے پاس کرامات تھیں اور چونکہ ہمارے پاس کرامت نہیں تو ہم عمل کیسے کر سکتے ہیں؟

صحابہ کرامؓ کا عالم یہ تھا کہ وہ سراپا اطاعت میں ڈھل گئے تھے اُن کے ہاں کیوں اور کیسے کا سوال نہیں تھا بس ایک ہی بات تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے کیا فرمایا ہے اسی طرح عمل کیا جائے۔ اُن لوگوں کی شان کیا ہوگی کہ وہ کام کرنے لگیں اور اللہ کریم فرشتے بھیج دیں کہ یہ تمہارے ساتھ ہیں، ان لوگوں کا کیا مقام ہوگا! اللہ کریم نے اُن کی مدد فرمائی اور وہ دنیا پر چھا گئے۔ اللہ کریم کی نصرت اُن لوگوں کے ساتھ تھی جو لوگ اپنے گھروں سے ناحق نکالے گئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی خادمہ حضرت اُم ایمنؓ ایک عمر رسیدہ خاتون تھیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم سے بے پناہ محبت کرتی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم ہجرت فرما گئے تو حضرت اُم ایمنؓ مکہ مکرمہ میں ہی رہ گئیں۔ حضرت ام ایمنؓ چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی خادمہ تھیں ہمہ وقت خدمت میں رہنے والی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے چلے جانے سے بہت بے قرار ہو گئیں اور تن تنہا اللہ کے آسرے پر مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہو گئیں۔ جب تھوڑا سفر طے کیا، مکہ مکرمہ سے بھی دور آ گئیں اور مدینہ منورہ بھی بہت دور تھا، سخت گرمی اور دھوپ تھی اور جو پانی ساتھ لائی تھیں ختم ہو چکا تھا۔ اب بہت پریشان حال ہو گئیں، پیاس سے نڈھال تھیں دن بھی ڈھل رہا تھا کہ فرماتی ہیں میں نے شپ شپ کی آواز سنی جیسے کوئی بھاری سا پرندہ قریب سے گزر رہا ہو تو میں نے اوپر دیکھا تو ایک ڈول نیچے آ رہا تھا اور میرے پاس آ کر رک گیا۔ فرماتی ہیں، میں نے دیکھا وہ لذیذ ٹھنڈے پانی سے بھرا ہوا ہے تو میں نے ڈول پکڑ لیا اور خوب سیر ہو کر پانی پیا تو میری بھوک بھی دور ہو گئی اور پیاس بھی دور ہو گئی۔ مدینہ منورہ پہنچ کر جتنا عرصہ زندہ رہیں فرمایا کرتی تھیں کہ مجھے پیاس نہیں لگتی۔ سخت گرمیوں میں روزے رکھا کرتی تھیں اور روزہ رکھ کر سخت گرمی

میں مکہ مکرمہ طواف کے لیے بھی جایا کرتی تھیں اور کہتی تھیں کہ مجھے اب پیاس نہیں لگتی پانی پیوں یا نہ پیوں، اللہ نے کیا خوب اُن کی مدد کی۔

نصرتِ الٰہی اور آج کے مسلمان:

آج لوگ بڑے تکبر سے سوال کرتے ہیں کہ دنیا میں ستاون ممالک میں مسلمانوں کی حکومت ہے لیکن پھر بھی ہر جگہ مسلمانوں کو مار پڑ رہی ہے، آج کیوں اللہ اُن کی مدد نہیں کرتا؟ اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ اللہ نے یہ قانون ارشاد فرما دیا کہ اللہ اُن کی مدد کرتے ہیں جو اللہ کی مدد کرتے ہیں۔ جو اللہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت کرتا ہے وہ دراصل اللہ کے دین کی مدد کرتا ہے اور جو دین کی مدد کرتا ہے وہ اللہ کی مدد کرتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایمان باللہ کے ساتھ ایک مکمل نظامِ حیات عطا فرمایا جسے صحابہ کرامؓ نے دل وجان سے اپنایا اسی لیے اللہ کریم نے انہیں دنیا پر فتح وکامرانی سے نوازا اور عالم اسلام کی سرحدیں کہاں سے کہاں پہنچ گئیں۔ جب مسلمانوں نے یہ عادلانہ ریاست قائم کی اس وقت کے امریکہ کو مورّخ وحشی وحشی مغرب لکھتا ہے(The wild wild west) اور یورپ کے مکینوں کو Cave Men کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ یہ لوگ غاروں میں رہتے تھے اور گھر بنانا تک نہیں جانتے تھے۔ اُن قوموں نے تجزیے کر کے مسلمانوں کے طریقے اپنا لیے اور چونکہ اسلامی طریقہ جو بھی اپنائے گا اُسے دنیا کا فائدہ ضرور ہوگا۔ اگر کوئی اللہ اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم پر اللہ کی کتاب اور آخرت پر ایمان لا کر اسلامی نظامِ حیات کو اپناتا ہے تو اُسے دنیا اور آخرت دونوں میں فائدہ ہوتا ہے لیکن اگر کوئی ایمان نہیں لاتا لیکن اسلامی طریقے اپناتا ہے تو دنیا کا فائدہ اسے بھی ہوتا ہے۔ آج اگر کافر ممالک دنیا پر غالب نظر آتے ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے اسلامی اصول اپنا رکھے ہیں جبکہ مسلمانوں نے کافروں کے شعار اپنا لیے ہیں اور ایسا کرنے سے تو ایمان بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ ایمان ایک دعویٰ ہے کہ ہم اللہ کو وحدہٗ لاشریک مانتے ہیں، اللہ کے نبیؐ کو برحق مانتے ہیں لیکن اس دعوے کا گواہ ہمارا کردار ہے تو جب قوم میں حلال حرام کی تمیز اٹھ جائے اور کفار جیسے شعار اپنا لیے جائیں تو پھر نصرتِ الٰہی کی امید نہ رکھی جائے۔

نصرتِ الٰہی پانے والوں کے اندازِ حکمرانی:

اللہ کریم بے مثل بے مثال ہیں، حقیقی طاقت انہی کی شان ہے وہ غالب ہیں باقی کائنات کی ہر چیز مغلوب ہو جاتی ہے۔ اللہ کریم قائم بالذات ہیں اللہ کو کسی کی مدد یا تعاون کی احتیاج نہیں، ہاں وہ کریم ہیں اور اس کے کرم کی عجیب ادا ہے کہ بندہ اپنی بھلائی کر رہا ہے کہ ایمان لایا اور دین پر عمل کر رہا ہے لیکن اللہ کریم فرماتے ہیں کہ یہ میری مدد

کررہا ہے اوراس کی مدد میں کروں گا۔جنہیں اللہ کی مدد نصیب ہوتی ہے اُن لوگوں کی کیا پہچان ہوتی ہے،ہم انہیں دنیا میں کیسا پائیں گے؟ فرمایا: اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝۴۱ یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو دنیا میں حکومت دے دیں تونماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم کریں اور برے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔اللہ کی مدد پانے والوں کی نشانی یہ ہے کہ جب انہیں زمین پر اقتدار ملتا ہے تو یہ سب سے پہلے عباداتِ الٰہی کو قائم کرتے ہیں،ایسانظام بناتے ہیں جس میں باقاعدگی سے اذانیں ہوں اور ہر مسلمان باقاعدگی سے نمازادا کرے۔بچوں کونمازسکھائی جائے اور ہر مسلمان کونماز آتی ہو۔

اللہ کریم فرماتے ہیں جنہیں میں اقتدار دیتا ہوں،جن کی مدد کرتا ہوں اور جو میرے مقبول بندے ہیں اُن کے پاس جب اقتدار آتا ہے تو وہ سب سے پہلے بندے اور ربّ کے مابین جو معاملات ہیں ان پر توجہ دیتے ہیں کہ لوگوں کا عقیدہ صحیح ہو،اُن تک صحیح تعلیم پہنچے تاکہ اُن کے عقائد ونظریات کی اصلاح ہواور بدعات ورسومات سے لوگوں کی جان چھڑائی جائے اورلوگ اللہ کی عبادت پر قائم ہوں۔اللہ کے بندے ایسانظام قائم کرتے ہیں کہ ہر بندہ اللہ کی عبادت کرے اور وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ۔۔۔لوگوں کے عقائد اور عبادات کے بعد یہ لوگ مالی معاملات پر توجہ دیتے ہیں کہ ہر بندے کو اس کا حق پہنچے،کوئی راستے سے نہ چھینے۔وہ ٹیکس جو اللہ نے بندوں پر نافذ کیا ہے یعنی زکوٰۃ اس کی ادائیگی کو یقینی بناتے ہیں گویا عقیدے کے معاملات پر سب سے پہلے توجہ دیتے ہیں پھر مالی معاملات کو درست کرتے ہیں اور پھر وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ۔۔۔نیک کام کرنے کا حکم کرتے ہیں اور برے کاموں سے منع کرتے ہیں۔پورے معاشرے میں نیکی پھیلا دیتے ہیں۔نیک کاموں کی تبلیغ کرتے ہیں نیک کاموں کا حکم دیتے ہیں اوران کے لیے وسائل مہیا کرتے ہیں۔نیکی کو سمجھنے کے لیے تعلیم عام کردیتے ہیں جس سے پوری قوم کا رویہ نیکی کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ۔۔۔قوم کو برائی سے روک دیتے ہیں،معاشرے سے جھوٹ، بددیانتی،رشوت لوٹ کھسوٹ کوختم کردیتے ہیں۔یہ اللہ کے بندوں کی حکمرانی کے انداز ہیں جو اللہ کی تائید ونصرت سے اقتدار میں آتے ہیں اور وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝۴۱ سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔اطاعت گزاروں نے بھی بالآخراسی کی بارگاہ میں پہنچنا ہے اور نافرمان بھی اسی میدان میں حاضر ہوں گے توسب کو پتا چل جائے گا کہ اطاعت شعار کون تھے اور نافرمانی کس نے کی تھی۔حکومت اور حکمرانی کا ملنا اللہ کی مدد سے ہے۔جو اللہ کی مدد سے اقتدار میں آتے ہیں اُن کی نشانی یہ ہے کہ وہ لوگوں کے عقائد اور ایمانیات درست کرتے ہیں لوگوں کے مالی امور درست کرتے ہیں،نیکی کو پھیلاتے ہیں اور برائی سے روک دیتے ہیں۔یہ دو جملے،امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

پورے معاشرے کے سارے نظام کو محیط ہیں کہ ہر نیکی کا حکم دیا جاتا ہے اور ہر برائی کا سد باب کیا جاتا ہے۔ پھر انجامِ کار تو سب کو اللہ ہی کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے اور اللہ کی قدرت ہی فیصلہ کرے گی۔

وطنِ عزیز کا حال:

وطن عزیز میں تو یہ بھی دیکھا گیا کہ ہمارے دو وزراء کرام کو سورۃ سنانا پڑی تو دونوں نے غلط پڑھی حالانکہ سورۃ اخلاص قرآن کی وہ سورت ہے جو ہر ان پڑھ نے بھی یاد کر رکھی ہے اور نماز کی ہر رکعت میں وہ یہی پڑھ لیتا ہے۔ ایسے لوگ مقتدر بن جاتے ہیں تو کیا یہ اللہ نے بٹھائے ہیں، نہیں یہ شیطان کے نمائندے ہیں۔ حکمران بھی تو ہم میں سے ہی ہیں، جتنے ہم مخلص ہیں اتنے وہ بھی ہیں، ہمیں اپنے آپ کو دیکھنا چاہیے کہ ہم اپنے دین، ملک اور لوگوں کے ساتھ کتنے مخلص ہیں۔ آج ہر بندہ اپنی رائے کو حق سمجھتا ہے اور دوسرے کو غلط۔ ایک طبقہ خود کو موسیٰ سمجھتا ہے اور دوسرے کو فرعون کہتا ہے اور ایک دوسرے کے خلاف جہاد کیا جارہا ہے۔

ہم نے اسلام کو چھوڑ کر غیر مہذب اقوام کی تہذیب اپنا لی، کافروں کے شعار اپنا لیے ہیں۔ آج وطنِ عزیز میں سیاست کے عجیب انداز ہیں ہر کوئی اپنی رائے منوانے کے درپے ہے اور انقلاب کا نعرہ لگاتا ہے۔ اس کے لیے قوم کی آبرو، جوان بچیاں عمر رسیدہ خواتین سڑکوں پر دھکے کھاتی نظر آئیں۔ کیا یہ طریقے اسلامی ہیں؟ پتا نہیں اس قوم کو کیا ہو گیا ہے، اس کے مرد کہاں گئے ہیں، اُن کی غیرت کہاں گئی ہے؟ کیا ان طریقوں سے اللہ کی رحمت نصیب ہوگی؟

مزے کی بات یہ ہے کہ مختلف ٹولے انقلاب کے نعرے تو لگاتے ہیں لیکن اسلام کا نام نہ سیاستدان لیتے ہیں، نہ ہی مولوی صاحب لیتے ہیں۔ کوئی یہ نہیں کہتا کہ اسلامی انقلاب لائیں گے جس میں اسلام کا نام بلند ہوگا، اسلامی عدل ہوگا اسلامی تہذیب ہوگی اور غیر اسلامی تہذیب ختم کر دی جائے گی۔ حیرت ہوتی ہے انقلاب کا نام تو سب کی زبان پر ہے لیکن اسلام کا نام کوئی نہیں لیتا۔ آج ہم ایسے عجیب دور میں آ پھنسے ہیں کہ ہمارے قومی لیڈروں کا صبح سے شام کئی مرتبہ موقف تبدیل ہوتا ہے۔ لوگوں سے پنجگانہ صلوٰۃ ادا نہیں ہوتی تو جہاد کون کرے گا؟ حلال حرام کی تمیز اُٹھ چکی ہے، جھوٹ اور دھوکہ دہی عام ہے، تو کیا ایسے لوگ جہاد کریں گے!

یہی دعا ہے کہ اللہ اہل وطن کو صحیح عقیدہ اور صحیح عمل کی توفیق عطا کریں اور وطنِ عزیز کی حفاظت فرمائیں۔ اللہ اس ملک کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا سبب بنائیں ان شآء اللہ یہ ملک رہے گا، یہیں سے غزوۃ الہند شروع ہوگا ان شآء اللہ سارا برصغیر پاکستان بنے گا اور روئے زمین پر اسلام کا پیغام جائے گا۔ ہماری امیدیں

بھلے وقت، بھلے لوگوں اور اللہ کے کرم کے ساتھ ہیں۔

تکذیب کیا ہے؟

فرمایا: وَاِنۡ يُّكَذِّبُوۡكَ ۔۔۔اور اگر یہ لوگ آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کو جھٹلاتے ہیں۔ یہ بہت قابلِ غور اور سمجھنے کی بات ہے کہ تکذیب کیا ہے۔ ہم اس بات پر خوش ہیں کہ ہم اللہ کو مانتے ہیں اور مسلمان ہیں، دین کو قبول کرتے ہیں۔ ہمیں یہ سوچنا پڑے گا کہ اللہ کو دنیا کی ہر قوم مانتی ہے کہ یہ عقل کی مجبوری ہے۔

عقل جب سوچتی ہے کہ زمین، آسمان، سورج کو کس نے بنایا؟ اگر فرشتوں، دیوی دیوتاؤں نے بنایا تو پھر فرشتوں اور دیوی دیوتاؤں کا خالق کون ہے؟ عقل کو پھر ایک آخری طاقت ماننا پڑتی ہے جو سب کو بناتی ہے اور اُسے کوئی نہیں بناتا چنانچہ اللہ کو ماننا سب کی مجبوری ہے لیکن لوگ اپنے ڈھنگ سے مانتے ہیں۔

اسلام یہ ہے کہ اللہ کو ویسا مانا جائے جیسا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم منواتے ہیں۔ عام قوموں کے ماننے اور مسلمان کے ماننے میں یہ فرق ہے کہ ہر قوم اپنی رائے اور ڈھنگ سے اللہ کو مانتی ہے جبکہ مسلمان اللہ کی ذات اور صفات کو ویسا مانتا ہے جیسا ماننے کا حکم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم دیتے ہیں۔

دوسرا ہمیں یہ زعم ہے کہ ہم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کو مانتے ہیں قرآن کو مانتے ہیں لیکن اللہ کریم اور قرآن کریم زبانی دعوؤں کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ اُن کے نزدیک ماننے سے مراد ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ اگر ہم کسی سے کہیں کہ ہمیں پانی لا دے اور وہ کہے کہ آپ کی بات مانتا ہے لیکن پانی لا کر نہ دے تو کیا ہم اس سے خوش ہو جائیں گے؟ ہم کہیں گے کہ اس نے بات نہیں مانی اگر مانتا تو پانی لا کر دیتا۔ ہمیں سوچنا پڑے گا کہ کہیں ہماری مسلمانی بھی ایسی ہی تو نہیں کہ ہم کہہ تو دیتے ہیں کہ ہم نے مان لیا لیکن کرتے اپنی من مانی ہیں! یہ بھی عملی تکذیب ہی ہے اور ہمیں چاہیے کہ پہلی فرصت میں توبہ اور رجوع الی اللہ کریں۔ اللہ کریم سے عرض کریں کہ یا اللہ! میں عمل کی کوشش کروں گا آپ مجھے خلوص اور توفیقِ عمل عطا کیجیے اور میرے عمل کو قبول فرمائیے۔

یہ فیصلہ انسان کا اپنا ہے کہ وہ حق کو قبول کرتا ہے یا جھٹلا دیتا ہے سو فرمایا، وَاِنۡ يُّكَذِّبُوۡكَ ۔۔۔اگر یہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تکذیب کر رہے ہیں کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) اللہ کے رسول ہیں اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) پر اللہ کی طرف سے وحی آتی ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) اللہ پر جھوٹ بول رہے ہیں (معاذ اللہ) یہ لوگ اپنے طور پر اللہ کو مانتے تھے اللہ کا انکار نہیں کرتے لیکن آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کی بات کو جھٹلاتے ہیں۔ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلّم یہ کوئی نئی بات نہیں آپ اس سے گھبرائیں نہیں، ایسا پہلے بھی ہوتا رہا ہے۔

انسانی مزاج جب عظمتِ الٰہی سے ناآشنا ہوجائے تو بالکل بے مہار ہوجاتا ہے، نفس اور دماغی طاقتیں اس پر حاوی ہوجاتی ہیں۔ نفس چونکہ مادّے سے بنا ہے اس لیے یہ دنیا پر ریجھ جاتا ہے اور یوں انسان کی مادّی نگاہ اور ذہن میں بھی دنیا ہی سما جاتی ہے۔ دنیا میں چونکہ وہ مادّی لذات چکھتا بھی ہے اس لیے ان پر فریفتہ ہوجاتا ہے اور محض لذات کی تلاش میں سرگرداں ہوجاتا ہے۔ جب ایسے انسانوں کی طرف جو دنیا میں محو ہوتے ہیں اللہ کا رسول مبعوث ہوتا ہے، اللہ کی طرف سے کتاب آتی ہے احکام آتے ہیں تو وہ اللہ کے رسولؐ کو جھٹلاتے ہیں اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ اللہ کا رسولؐ (معاذ اللہ) اللہ پر جھوٹ بول رہا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، فرمایا: فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَّعَادٌ وَّثَمُودُ ﴿٤٢﴾ بے شک ان سے پہلے قومِ نوحؑ اور عاد اور ثمود نے (بھی) جھٹلایا تھا۔

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے کتنا انکار کیا! حضرت نوح علیہ السلام ساڑھے نوسو سال انہیں تبلیغ فرماتے رہے اور اس تبلیغ کا حاصل یہ تھا کہ صرف اسّی (80) سے (90) نوے کے درمیان مرد و خواتین اور بچے اُن پر ایمان لائے۔ ساڑھے نوسو سال کے بعد طوفان آیا اور قوم غرق ہوئی اور صرف اسّی سے نوے کے درمیان مرد خواتین اور بچے جو اسلام لائے تھے اُن کے ساتھ کشتی میں سوار ہوئے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے اُن کی تکذیب کی اور قومِ عاد اور ثمود نے بھی اپنے انبیاؑ حضرت ہود علیہ السلام اور حضرت صالح علیہ السلام کو جھٹلا دیا، یہی نہیں وَقَوْمُ إِبْرَٰهِيمَ وَقَوْمُ لُوطٍ ﴿٤٣﴾ اور قومِ ابراہیمؑ اور قومِ لوطؑ نے بھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم نے بھی اُن کا انکار کردیا، اُن کی تکذیب اتنی شدت سے کی کہ انہیں آگ میں جلانے کی کوشش کی اور لوط علیہ السلام کی قوم نے بھی انہیں بہت پریشان کیا اور کتنی شدید ایذا دی۔ اسی طرح وَّأَصْحَٰبُ مَدْيَنَ ۖ وَكُذِّبَ مُوسَىٰ ۔۔۔ مدین کے رہنے والوں نے (بھی) اور موسیٰ علیہ السلام کو بھی جھٹلایا گیا۔

مدین کے رہنے والوں نے بھی اپنے نبیؐ کی تکذیب کی اُن کی بات نہیں مانی۔ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون نے جھٹلایا اور فرعون کی پیروی میں اس کی ساری قوم نے موسیٰ علیہ السلام کو جھوٹا بھی کہا اور جادوگر بھی کہا۔ اللہ کے رسولوںؑ نے اور اللہ کے نبیوںؑ نے صبر کیا، تبلیغ جاری رکھی اور اپنی قوموں کو سمجھانے کی کوشش کرتے رہے۔ فَأَمْلَيْتُ لِلْكَٰفِرِينَ ۔۔۔ پس ہم نے کافروں کو مہلت دی۔ انبیاؑ کے سمجھانے سے جو خوش نصیب تھے وہ سمجھ کر بچ گئے اور جنہوں نے نہیں مانا، اس مہلت سے فائدہ نہیں اٹھایا اُن کا انجام کیا ہوا، ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ ۖ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ﴿٤٤﴾ پھر ان کو پکڑ لیا تو (دیکھ لیجیے) میرا عذاب کیسا ہوا۔

ہم نے پھر انہیں ایسا پکڑا کہ دیکھنے والے بھی دنگ رہ گئے کہ عذاب الٰہی کتنا شدید ہوتا ہے۔

نوح علیہ السلام کی قوم کے لیے پانی تباہی کا سبب بن گیا، موت کا سبب بن گیا حالانکہ ہر چیز کی حیات کا مدار پانی ہی ہے۔ پانی زندگی کی اہم ضرورت ہے۔ قرآن میں ایک اور مقام پر ارشاد ہے، وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۖ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ (الانبیآ:30) اور ہم نے پانی سے ہر جاندار چیز بنائی۔

نوح علیہ السلام کی قوم کے لیے پانی موت کا پیغام ثابت ہوا۔ اسی طرح عاد و ثمود کے ساتھ کیا ہوا، تیز ہواؤں سے تباہ کر دیے گئے۔ لوط علیہ السلام کی قوم پر ایسا عذاب آیا کہ زمین کا ہی تختہ الٹ دیا گیا اور وہ پوری قوم تباہ ہوگئی۔ اصحاب مدین بھی تباہ کر دیے گئے۔ جو لوگ بھی انکار کرتے رہے دنیا میں عذابِ الٰہی کی گرفت سے بچ نہ سکے حالانکہ اللہ کریم نے مہلت دی کہ یہ حق بات کا تجزیہ کریں اس کو سمجھیں اور اختیار کریں۔ مگر انہوں نے مہلت کا غلط فائدہ اٹھایا اور برائی اور گمراہی میں بڑھتے ہی گئے۔ انہوں نے سمجھا کہ اب اُنہیں کوئی پوچھنے والا ہی نہیں ہے۔ ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ ۖ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ﴿٤٤﴾ پھر ہم نے ان کو اپنی گرفت میں لے لیا کہ دیکھنے والے بھی دنگ رہ گئے کہ یہ عذاب کیسے ہیں ان سے بچنا ناممکن ہے اور تباہ و برباد ہو کر رہ گئے۔

حُبِّ دنیا:

اللہ کریم نے روئے زمین پر جتنی نعمتیں پیدا فرمائیں سب انسان کے لیے ہیں ان نعمتوں کو نوعِ انسانی نے ہی استعمال کرنا ہے۔ اللہ کریم اچھا کھانا کھانے سے، اچھا لباس پہننے سے، اچھی سواری رکھنے سے اور اچھا مکان بنانے سے منع نہیں فرماتے، بس اتنا فرماتے ہیں کہ حلال رزق، جائز وسائل سے حاصل کرو اور اپنا جائز حق لے کر یہ سب اہتمام کرو۔ ناجائز طریقے اختیار نہ کرو اور کسی دوسرے کا حق مت چھینو۔ دین صرف چھینا جھپٹی سے روکتا ہے، ناجائز ذرائع استعمال کرنے سے روکتا ہے اور اس پر فخر کرنے اور اکڑنے سے منع فرماتا ہے۔ جائز وسائل سے چیزیں حاصل کرنا اور استعمال کرنا جرم نہیں ہے دین اس سے نہیں روکتا۔ قرآن کریم میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے محلات کا ذکر آتا ہے کہ وہ کیسے شاندار اور عجیب وغریب تھے اُن میں کتنی نعمتیں تھیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت انسانوں پر ہی نہیں بلکہ جنات، ہوا اور چرند پرند پر بھی تھی۔ کتنی عظیم شہنشاہیت اور سلطنت ہوگی اور وہ اللہ کے نبیؑ بھی تھے۔ جائز وسائل سے دنیا کی نعمتیں حاصل کرنے سے کوئی نہیں روکتا۔

انسان کی مصیبت یہ ہے کہ وہ دنیا میں ہی کھو جاتا ہے اور پھر ہوسِ زر میں اتنا ڈوب جاتا ہے کہ جائز ناجائز کی قید نہیں رکھتا۔ اس کی زندگی کا مقصد صرف پیسہ حاصل کرنا ہوتا ہے خواہ حرام کا ہو، سود کا ہو اور بڑے بڑے لوگ اس میں بہہ جاتے ہیں۔ انسان جب دنیا میں محو ہو جاتا ہے تو اس کی سوچ صرف اچھا کھانا کھانے، قیمتی لباس پہننے، قیمتی

گھڑی اور عالیشان مکان بنانے تک محدود ہو جاتی ہے۔ جب ساری توجہ دنیا ہی کی طرف ہو جائے تو عظمتِ الٰہی ذہنوں سے مِٹ جاتی ہے لہٰذا جب اللہ کی عظمت کا ادراک نہیں تو نبیؐ کی عظمت کو بھلا کیوں مانے گا!

دنیا آخرت کا پرتو ہے:

آخرت ہمیشہ رہنے والی ہے جبکہ دنیا وقتی اور لمحاتی ہے اور جب تک اللہ چاہیں گے یہ قائم رہے گی۔ ایک وقت آئے گا سب کچھ مٹ جائے گا۔ یہ اللہ کا نظام ہے کہ جو چیز طاقتور ہوتی ہے اس کا اثر کمزور پر جاتا ہے۔ یہ دنیا بھی سایہ ہے، آخرت کا پرتو ہے۔ نیکی بدی کا حساب تو روزِ محشر ہوگا لیکن اس دنیا میں بھی گرفت ہو جاتی ہے کہ دنیا آخرت کا پرتو ہے اور اس پر آخرت کا اثر آتا ہے۔ انسان اگر حلال نہ کھائے، سچ نہ بولے اللہ کی اطاعت نہ کرے تو اس کے دل کو کبھی قرار نہیں آتا، بے چین بے قرار اور پریشان رہتا ہے۔ اُسے حکومت بھی مل جائے تو سکون نہیں پاتا اس لیے کہ جو آتشِ جہنم آخرت میں اس کے لیے تیار ہو رہی ہے وہ اس کے دل میں بھڑکتی رہتی ہے۔ جس کی آخرت صحیح ہو وہ اگر بوریا نشین فقیر بھی ہو تو مطمئن ہوتا ہے اس کا وقت بہت سکون اور مزے سے گزر رہا ہوتا ہے وہ کبھی پریشان نہیں ہوتا۔ جب بات حد سے بڑھتی ہے تو دنیا میں ظاہراً بھی عذاب واقع ہو جاتے ہیں۔

یہاں ایک لمحہِ فکر یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ہر سال سیلاب ہمیں کیوں بہا کر لے جاتا ہے؟ ہم کیوں نہیں سوچتے کہ پانی تو اللہ آبادی کے لیے برساتا ہے، اس سے کھیتیاں اُگتی ہیں، فصلیں پیدا ہوتی ہیں، نعمتیں ملتی ہیں لیکن ہمیں یہ ہر سال ڈبو کر جاتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمیں تنبیہہ ہو رہی ہو کہ ابھی وقت ہے توبہ کر لو، باز آ جاؤ سدھر جاؤ۔ اسی طرح بدلتے موسم راحت کے بجائے ہمیں ایذا دیتے ہیں۔ ہر موسم کے ساتھ ایک بیماری آ جاتی ہے۔ نصف صدی پہلے تو کینسر، ذیابیطس جیسی بیماریوں کے نام تک نہ سنے تھے نہ ہی کولیسٹرول کوئی چیک کرتا تھا نہ جانتا تھا۔ لوگ صحتمند ہوتے تھے، سادہ غذائیں کھاتے محنت مزدوری کرتے تھے صحتمند رہتے تھے۔ آج تو جس کے پاس کھانے کو لقمہ نہیں ہے اُسے کینسر ہو گیا ہے، زیابیطس ہو گئی ہے ایڈز ہو گئی ہے۔ ان کے تو علاج بہت مہنگے ہیں تو غریب آدمی کیسے کروائے گا۔ یہ امرا کی بیماریاں تھیں، غریبوں میں کہاں سے آ گئیں؟ جو بڑے بڑے دولتمند تھے، وہ بدکار ہو گئے، شراب خور ہو گئے، جھوٹ بولتے تھے لوگوں کا مال لوٹتے تھے تو اللہ نے انہیں یہ بیماریاں لگا دیں۔ آج کل یہ جھگی نشینوں کو کیوں لگ گئیں؟ کہیں ہم نے غریب ہونے کے باوجود اُن امرا جیسا کردار تو نہیں اپنا لیا؟ کہیں ہم نے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی نافرمانیاں کر کے تو یہ بیماریاں نہیں پال لیں؟

ظالموں کا انجام:

اللہ کریم کی عطا کردہ مہلت کو ضائع کرنے والے اللہ کی گرفت میں آ گئے عذابِ الٰہی سے تباہ و برباد کر دیے

گئے اور دنیا میں داستانِ عبرت بن گئے۔ فرمایا: فَكَأَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ۝ غرض کتنی ہی بستیاں ہیں جن کو ہم نے ہلاک کیا کہ وہ ظالم (بدکار) تھیں پس وہ اپنی چھتوں پر گری پڑی ہیں اور (بہت سے) کنویں بے کار اور (بہت سے) مضبوط محل (ویران پڑے ہیں) کتنی آبادیوں کو اللہ کریم نے تہس نہس کر دیا تباہ و برباد کر دیا اس لیے کہ وہ ظالم تھے بدکار اور غلط کار تھے۔

عربی میں ظلم کی تعریف ہے وَضْعُ الشَّيْءِ فِي غَيْرِ مَحَلِّهٖ یعنی کسی چیز کو اس کی جگہ سے ہٹا کر کسی دوسری جگہ رکھ دینا۔ عقائد میں سب سے بڑا ظلم شرک ہے، اعمال میں اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی نافرمانی ظلم ہے۔ جس درجے کی نافرمانی ہے اسی درجے کا ظلم ہے۔ علما اس پر بڑی طویل بحث فرماتے ہیں اور گناہِ کبیرہ اور گناہ صغیرہ کی فہرستیں بناتے ہیں کہ یہ بڑی نافرمانی ہے یہ چھوٹی نافرمانی ہے لیکن پھر فرماتے ہیں کہ دیکھنا یہ ہے کہ یہ نافرمانی کس کی ہے۔ حکم دینے والی ہستی جتنی عظیم ہو گی اتنا ہی جرم بھی بڑا ہو گا۔ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی نافرمانی معمولی جرم نہیں ہے اس لیے یہ گناہ صغیرہ نہیں ہوتے بلکہ سارے گناہ ہی کبیرہ ہیں۔ ہم ایک عام آدمی کی بات نہیں مانتے تو اور بات ہے وہی حکم اگر عدالت دے اور ہم جج کی حکم عدولی کریں تو بات بدل جائے گی۔ اگر وہی حکم حکومت کی طرف سے آجائے تو اس کی نافرمانی کتنی بڑی ہو جائے گی۔ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی ہر نافرمانی ہی بہت بڑا جرم ہے جس سے توبہ کرنی چاہیے اور استغفار کرنا چاہیے۔ اللہ کے اطاعت گزار بندے جو سارا دن اطاعت میں کوشاں رہتے ہیں وہ بھی استغفار پڑھتے رہتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ حقِ اطاعت ادا نہیں ہو سکتا اور ان سے اطاعت و عبادت میں کمی رہ گئی ہو گی۔

اللہ کریم فرماتے ہیں کہ جب ظالموں کو اللہ کے عذاب نے پکڑا تو بڑے بڑے محل جو بڑی مضبوطی سے بنائے گئے تھے اور اُن کی مضبوط فصیلیں تھیں ایسے تباہ ہوئے کہ پہلے اُن کی چھتیں گریں اور پھر دیواریں اُن چھتوں کے اوپر گر گئیں۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ عمارت کی دیواریں کمزور ہو جاتی ہیں اور پہلے دیواریں گرتی ہیں پھر اوپر چھت گر جاتی ہے۔ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ ان کی دیواریں بڑی مضبوط تھیں ہم نے چھتیں پہلے گرا دیں اور دیواروں کو چھتوں کے اوپر گرا دیا۔ جب اللہ کی طرف سے تباہی آئی ایسے زلزلے آئے، ایسے جھٹکے لگے کہ چھتیں پہلے گر گئیں اور دیواریں چھتوں کے اوپر گر گئیں۔ اُن کے کنویں اور چشمے اور آب پاشی کے جتنے طریقے انہوں نے بنا رکھے تھے سب تباہ ہو گئے، بے کار ہو گئے اور بڑے مضبوط محل ویران ہو گئے۔ جن محلوں پر بڑے پہرے ہوا کرتے تھے اور لوگ دور دور سے سلام کرتے اور سجدے کرتے رہتے تھے وہ ایسے اجڑے کہ کھنڈر ہو گئے۔

فرمایا: اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ۔۔۔تو کیا یہ زمین یعنی (ان علاقوں) میں چلے پھرے نہیں۔ جو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا انکار کرتے ہیں انہوں نے زمین پر پھر کر پہلی قوموں کا حشر نہیں دیکھا؟ کیا وہ عالی شان محلوں کے کھنڈرات نہیں دیکھتے ویران محل اور برباد کنویں نہیں دیکھتے؟

دل کی عقل:

یہ تباہ ہونے والی قومیں ایسی تھیں جنہوں نے ظلم کیے، فرمایا: فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ ۔۔۔ کاش! ان کے دل ایسے ہوتے کہ ان سے سمجھ جاتے۔ کاش! ان کے دل ایسے ہوتے جن میں عقل و شعور ہوتا۔ یہ بات کہ دل میں شعور ہے، عقل ہے آج سے ساڑھے چودہ سو سال پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمائی، قرآن نے فرمائی، جہاں تحقیق کر کے سائنس آج پہنچی ہے۔ آج سائنس کہتی ہے کہ دل سوچتا بھی ہے اور فیصلے بھی کرتا ہے۔ دل کے فیصلے ہی نافذ ہوتے ہیں جبکہ دماغ دل کا وزیر ہے اور وہ بدن کے نظام پر، اعصاب پر اختیار رکھتا ہے جبکہ دماغ دل کا وزیر ہے لیکن کرتا وہی ہے جو دل کہتا ہے۔ کتنی ہی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو دل کے کہنے پر نہ چاہتے ہوئے بھی دماغ کو عمل میں لانا پڑتی ہیں۔ ہم روزمرہ کی زندگی میں دیکھتے ہیں کہ کسی جواری سے کہیں کہ تم جوا کیوں کھیلتے ہو جبکہ اس کی وجہ سے تمہاری ساری کمائی برباد ہوگئی تو وہ کہتا ہے کہ دل کرتا ہے۔ دماغ اس کا بھی کہتا ہے کہ یہ برا کام ہے، نقصان دہ ہے لیکن کرتا اس لیے ہے کہ دل کرتا ہے۔ کسی نشہ کرنے والے سے پوچھیں کہ وہ نشہ کیوں کرتا ہے تو وہ بھی یہی جواب دیتا ہے کہ دل کرتا ہے۔ اس کا دماغ بھی اس لت کو برا اور نقصان دہ بتاتا ہے۔

عہد حاضر کے انسان کی مصیبت یہ ہے کہ اس نے دل سے صرفِ نظر کر لیا ہے۔ انبیاؑ جب تشریف لاتے رہے تو اُن کی مخاطب نری عقل نہیں ہوتی تھی، اُن کا مخاطب دل ہوتا تھا۔ جب دل مانتا ہے تو عقل بھی مان جاتی ہے اور بدن اس پر عمل کرتا ہے۔ آج ہمارا یہ عالم ہے کہ ہم مانتے تو ہیں مگر عمل نہیں کرتے۔ ہمیں اپنا محاسبہ کرنا چاہیے کہ جب ہم اللہ کو مانتے ہیں، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کو مانتے ہیں، اللہ کی کتاب کو مانتے ہیں، آخرت، مرنے کے بعد حساب کتاب، جنت دوزخ، فرشتے سب کو مانتے ہیں تو پھر ہمارے اعمال صحیح کیوں نہیں ہوتے؟ دراصل ہمارا دماغ مانتا ہے، ہماری عقل مانتی ہے جس دن دل نے بھی مان لیا اس دن عمل صحیح ہو جائے گا۔

اسلام ہمیں وراثتاً مل گیا اور ہم نے والدین سے سنا بزرگوں سے سنا لیکن ہم نے اس پر تحقیق نہیں کی۔ ہمیں مسلمانی وراثت میں مل گئی۔ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں وراثت میں زمینیں ملتی ہیں تو سمجھدار وہ ہوتا ہے جو تحقیق کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ نئے زمانے میں جو وسائل مہیا ہیں اُن سے استفادہ کر کے وہ کیسے بہتر اور نئی فصلیں پیدا کر سکتا ہے۔

بزرگوں کے پاس وسائلِ آبپاشی نہیں تھے اب نئی مشینیں موجود ہیں جن سے پانی فراہم کیا جا سکتا ہے اور باغ لگائے جا سکتے ہیں۔ جو قابل اولاد ہوتی ہے وہ سوچتی ہے کہ جو کچھ اُسے ورثے میں ملا ہے وہ اُسے اور بہتر کر لے اور جو نااہل ہوتی ہے وہ ورثے کو بھی بیچ کھاتی ہے۔

ہمارا حال اس نااہل اولاد جیسا ہے۔ ہم نے اپنے والدین کو بہت خلوص سے نمازیں پڑھتے دیکھا، سچ بولتے دیکھا اور وہ خوبصورت زمانہ دیکھا جب کسی شریف آدمی سے جھوٹ بولنے کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ یہ سوچنا بھی محال تھا کہ یہ سفید ریش آدمی جھوٹ بولے گا۔ آج ایسا دور آ گیا ہے کہ قسم بھی دو تو کوئی نہیں مانتا کہ سچ بول رہے ہو اور لوگ منبر پر بیٹھ کر جھوٹ بولتے ہیں، سٹیج پر کھڑے ہو کر جھوٹ بولتے ہیں۔ ان لوگوں کو شرم نہیں آتی۔

ہمیں آج یہ دیکھنا ہے کہ پہلی قوموں کی تباہی کی وجہ بتائی گئی ہے کہ ان کے دل تھے جنہوں نے عقل سے کام نہیں لیا، کیا ہمارا دل عقل سے کام لے رہا ہے؟ کیا ہمارے دل نے عظمتِ الٰہی کو قبول کر لیا ہے؟ کیا ہمارے دل نے صداقتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلّم کو قبول کر لیا ہے؟ چونکہ دل کی عقل بھی ہے یہ سوچتا بھی ہے سمجھتا بھی ہے تو جب دل قبول کر لے گا تو ہماری زندگی کا ہر کام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت کے سانچے میں ڈھل جائے گا۔

جس طرح انسانی وجود رحمِ مادر میں پلتا ہے، اس میں جب روح آتی ہے تو حیات پیدا ہوتی ہے، اسی طرح دل میں جب نورِ ایمان آتا ہے تو حیات پیدا ہوتی ہے۔ انسان کو پیدا ہونے کے بعد زندہ رہنے کے لیے غذا کی ضرورت ہوتی ہے، صحتمند رہنے کے لیے دوا کی ضرورت ہے۔ موسموں کی سردی اور گرمی سے بچنے کے لیے لباس کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب دل زندہ ہوتا ہے تو اسے بھی غذا اور دوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ گناہوں سے بچنا اس کی دوا ہے، نیکی پر عمل کرنا اس کی غذا ہے اور خشیتِ الٰہی اس کا لباس ہے۔ اتباعِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلّم اس کی صحت کی نوید ہے، بادِ بہاری ہے۔ اگر دل کو بھی رزق ملے، لباس ملے، حفاظت ملے تو وہ بھی ساتھ ساتھ جوان ہوتا جاتا ہے جتنا جتنا یہ پروان چڑھتا ہے دماغ اس کے تابع ہوتا جاتا ہے۔ ہر بات میں وہ اطاعتِ الٰہی کو مقدم رکھتا ہے۔ یہی بات یہاں فرمائی جارہی ہے کہ کاش! ان لوگوں کے دلوں میں عقل ہوتی، دلوں میں حیات ہوتی۔ دل زندہ ہوتے تو عقل کام کرتی۔ جب بندہ مر جاتا ہے تو اس کی عقل، اس کا دماغ کب کام کرتا ہے ہر چیز ختم ہو جاتی ہے۔

دل کی سماعت وبصارت:

فرمایا: اَوْ اٰذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ بِهَا۔۔۔ ان کے کان (ایسے) ہوتے کہ ان سے سُن سکتے۔

مادّی وجود کے کان تو اُن کے پاس تھے اور وہ سب باتیں سنتے تھے۔ یہاں بات دل کے کانوں کی ہو رہی ہے کہ کاش ان کے دل کی قوتِ سماعت بھی ہوتی کہ یہ حق اور باطل میں تمیز کرتے۔ ظاہری کان اچھی اور بری آواز میں

تمیز کرتے ہیں۔ اچھی آواز سنیں اچھی خبر سن کر خوشی ہوتی ہے جبکہ بری آواز آئے بری خبر آئے تو رنج ہوتا ہے۔ اسی طرح دل کے کان اگر وا ہوں تو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں بادِ بہاری بن جاتی ہیں اور اس کے خلاف جو بات ہو وہ اُسے دکھی کر دیتی ہیں۔

فرمایا: فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ ﴿۴۶﴾ بات یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں ولیکن دل جو سینوں کے اندر میں وہ اندھے ہو جایا کرتے ہیں۔

یہ لوگ ظاہری آنکھوں کے اندھے نہیں بلکہ ان کے دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہو چکے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ دل دیکھتا بھی ہے۔ جب دل کی آنکھ روشن ہوتی ہے تو وہ آخرت کو اس طرح دیکھتا ہے جس طرح ظاہری آنکھ سے دنیا کو دیکھا جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، ایک صحابیؓ مسجدِ نبوی میں داخل ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ سناؤ کیسے صبح کی؟ آپؓ کی صبح کیسی ہوئی؟ انہوں نے عرض کی یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ایمان کے ساتھ صبح کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تمہارے پاس ایمان کی کیا دلیل ہے؟ عرض کیا، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں یہاں کھڑا ہوں اور میں دیکھ رہا ہوں میدانِ حشر قائم ہے، میں حساب کتاب ہوتا دیکھ رہا ہوں اہل جنت کو جنت جاتے دیکھ رہا ہوں اور اہلِ دوزخ کو دوزخ جاتے دیکھ رہا ہوں۔ صحابیؓ کا یہ فرمانا اس لیے تھا کہ ان کا ایمان مثالی اور دل کی آنکھ روشن تھی۔

آج لوگ اس بات کو سمجھنا ہی نہیں چاہتے بلکہ فسانہ سمجھتے ہیں۔ یہ حقیقت کہ دل کی آنکھ کھلتی ہے تو آخرت بھی دکھائی دیتی ہے جبکہ ظاہری آنکھ محض دنیا کو دیکھتی ہے۔ قرآن کریم اسی پر بات کر رہا ہے کہ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ۔۔۔ ظاہری آنکھ سے تو یہ سب کچھ دیکھتے ہیں وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ ﴿۴۶﴾ یہ اُن آنکھوں کے اندھے ہیں جو دل کی ہیں، وہ دل جو سینوں میں ہیں۔ قرآن کریم نے کتنی وضاحت سے نشاندہی فرما دی کہ وہ دل جو سینے میں دھڑک رہا ہے اس کے اندر ایک لطیفہِ ربانی قلب ہے جس کے کان بھی ہیں، آنکھیں بھی ہیں اور دماغ بھی ہے۔ یہ سوچتا ہے، سمجھتا ہے فیصلے کرتا ہے۔ اگر اس دل کو بھی انسان نے محض دنیا میں ہی لگا دیا تو گویا اس نے اپنی سب سے قیمتی نعمت ضائع کر دی جو اُسے اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی تھی۔ اگر دل کو آخرت کی تحقیق پر لگایا، اللہ کی عظمت کو قبول کیا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کیا تو گویا دل سے صحیح کام لیا۔ دل کی آنکھ وا رکھی، کان کھلے رکھے اور دل سوچ سمجھ کر فیصلے کرتا رہا تو گویا اس نعمت کی قدر کی۔

ایک عجیب مطالبہ:

جب دل اندھے ہو جاتے ہیں تو انسان عجیب حرکتیں کرتا ہے۔ فرمایا: وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ۔۔۔

اور یہ لوگ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے جلدی عذاب کا تقاضا کر رہے ہیں۔ اللہ کریم فرماتے ہیں جب دل اندھے، گونگے بہرے ہو جاتے ہیں تو یہ حال ہو جاتا ہے کہ انسان اپنی تباہی میں جلدی چاہتا ہے۔ یہ کفار آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے ہیں کہ انکار کرنے پر جس عذاب کی خبر آپ صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں تو اس عذاب کو لے آیئے۔ بھلا کوئی عذاب کی بھی جلدی کرتا ہے! اگر کسی سے یہ کہا جائے کہ حکومت نے یہ حکم جاری کیا ہے اگر نہیں مانگو گے تو سزا پاؤ گے تو کتنا بے وقوف ہوگا وہ شخص جو کہے کہ مجھے ابھی جیل میں ڈال دو۔ یعنی وہ مہلت جو اُسے مل سکتی ہے کہ شاید عدالت سے سمن آئے وکیل بحث کرے اور تحقیق میں پانچ چھ ماہ لگیں اور پھر سزا ملے، جیل بھیجا جائے مگر یہ کہتا ہے کہ مجھے ابھی جیل میں ڈال دو۔ جب دل پھر جاتے ہیں تو ایسی ہی باتیں منہ سے نکلتی ہیں۔ یہ کافر کہتے ہیں کہ ہم پر جلدی عذاب لے آؤ۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم عذاب لانے کے لیے نہیں آئے بلکہ اُن کا منصب ہے انسانوں کی راہنمائی کرنا، حق بیان کرنا، باطل سے بچانا اور انہیں آخرت کی خبر دینا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نذیر ہیں کہ انسانی کردار کا جو انجام ہوگا اس کی بروقت خبر دینے والے ہیں۔ گناہوں پر آخرت میں کیا سزا مرتب ہوگی اس سے ڈرانے والے ہیں۔ کیسے عجیب خیر خواہ ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انسانیت کے!

اگر کسی شخص کو طبیب یہ کہہ دے کہ آج تو تم کھا رہے ہو اگر تم اسی طرح کھاتے رہے تو مستقبل میں تمہیں کوئی موذی بیماری لگ سکتی ہے۔ اب چاہے وہ پانچ برس بعد ہو یا دس برس بعد لیکن جیسے ہی طبیب اُسے یہ خبر دیتا ہے وہ فوراً اُس غذا کا استعمال چھوڑ دیتا ہے۔ یہ بحث نہیں کرتا کہ اگر بیماری آنی ہے تو مجھے آج ہی بیمار کر دو بلکہ وہ پرہیز شروع کر دیتا ہے۔ افسوس کہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اتنا اعتماد بھی نہیں ہے کہ وہ جس کام سے روکتے ہیں اس کا نقصان بیان فرماتے ہیں اس کام کو چھوڑنے کی بجائے یہ کہتے ہیں کہ آج ہی عذاب لے آیئے۔ عذاب لانا منصبِ نبوت نہیں ہے یہ اللہ کا اپنا کام ہے اور یہ بات یاد رکھو کہ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ۔ اور اللہ ہرگز اپنے وعدے کے خلاف نہ کریں گے۔ اگر گناہ پر عذاب کا وعدہ ہے تو عذاب بھگتنا پڑے گا۔ اگر نیکی پر ثواب کا وعدہ ہے تو نیکی پر اللہ اپنے وعدے کو پورا کرے گا لہٰذا گھبراؤ نہیں، اللہ کے پاس ایک نظام ہے۔ تم عذاب کی جلدی کیوں کرتے ہو تمہارے پاس فرصتِ عمل ہے وہ بھی ضائع کر کے جہنم جانا چاہتے ہو! توبہ کا دروازہ کھلا ہے، سوچو، توبہ کرو اللہ کی طرف رجوع کرو لیکن تم گھبرا گئے ہو کہ تم انکار کر رہے ہو تو تم پر عذاب کیوں نہیں آ رہا؟

زمین پر ہزار برس، آسمان پر ایک دن کے برابر:

فرمایا: وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴿۴۷﴾ اور بے شک آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پروردگار کے نزدیک ایک دن تم لوگوں کے شمار کے مطابق ایک ہزار سال کا ہے۔

اللہ کریم فرماتے ہیں کہ تم گھبراتے کیوں ہو تمہارے پاس تو وقت ہی بہت کم ہے۔ تمہاری زمین پر ہزار سال گزرتے ہیں تو عنداللہ ایک دن شمار ہوتا ہے تو اگر کوئی سو سال زندہ رہا اور نافرمانی کرتا رہا تو دن کا دسواں حصّہ ہی کی۔ تمہارے پاس تو وقت ہی بہت کم ہے، ستر سال، ساٹھ سال یا پچاس سال تو اس پر اکڑتے ہو حالانکہ عنداللہ ایک دن تمہاری زمین پر ہزار سال کے برابر ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کریم نے زندہ آسمانوں پر اٹھالیا زمین پر اب اکیسویں صدی عیسوی جارہی ہے گویا دو ہزار برس بیت گئے لیکن آسمانوں پر جہاں ایک ہزار برس کے برابر ایک دن ہے وہاں اُن کو دو دن ہی گزرے ہیں اور اب تیسرے دن کی صبح ہے۔ جب دنیا پر تشریف لائیں گے تو اُن کی عمر اس حساب سے ہوگی۔ اگر وہاں تین دن رہیں گے چار یا پانچ دن رہ لیں گے یا ہفتہ دو ہفتے رہ لیں گے تو عمر مبارک میں کیا فرق پڑے گا؟ جب تشریف لائیں گے تو جوان ہوں گے۔ جس عمر میں آسمانوں پر اٹھائے گئے اس میں ہفتے کا دو ہفتوں کا مہینے یا دو مہینے کا فرق ہوگا تو کیا فرق پڑتا ہے۔ بہرحال یہ اللہ کریم ہی جانتے ہیں کہ کتنی مدت لگے گی۔ زمین پر ہزار سال بیت جائیں تو آسمانوں پر ایک دن گزرتا ہے۔ اگر عقلاً بھی اس کو سمجھنا چاہیں تو ایک دائرہ بنائیں اس دائرے کے باہر کی لکیر پر جو نقطہ سفر کرے گا جب وہ ایک چکر پورا کرلے گا اتنی دیر میں مرکز کے قریب نقطہ ہزار چکر مکمل کرچکا ہوگا۔ عقلاً بھی سمجھ آنی چاہیے کہ اتنا ہی فاصلہ ہے۔

فرمایا، گھبراتے کیوں ہو تمہارے پاس تھوڑی سی فرصت ہے اور تم عذاب کے لیے جلدی کر رہے ہو۔ کیا تم نہیں دیکھتے، وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا ۚ وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴿۴۸﴾ اور بہت سی ایسی بستیاں ہیں جن کو ہم مہلت دیتے رہے اور وہ غلط کار تھیں پھر ہم نے اُن کو پکڑ لیا اور (سب کو) میری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے۔

تم سے پہلے بھی کتنی آبادیاں، کتنے لوگ گزرے جنہیں اللہ نے مہلت دی، فرصتِ عمل دی، عمر دی صحت بھی دی، رزق بھی دیا، اولادیں بھی دیں انبیاؑ و رسلؑ بھی بھیجے ان کے ساتھ کتابیں بھیجیں۔ یہ مہلت اس لیے دی گئی تاکہ وہ سوچ سمجھ کر اپنے لیے راستہ منتخب کریں۔ جب انہوں نے ظلم کی راہ اپنائی تو اللہ کی گرفت میں آگئے اور عذابِ الٰہی نے انہیں پکڑ لیا۔ وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴿۴۸﴾ فرمایا سب کو پلٹ کر میری ہی بارگاہ میں آنا ہے، کوئی مجھ سے بھاگ نہیں سکتا۔ کوئی ایسا متنفس نہیں ہے جو دنیا میں آیا ہے اور یہاں سے مڑ کر آخرت میں نہیں جائے گا، کہیں اور بھاگ جائے گا۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا سب کو واپس میری بارگاہ میں پلٹ کر آنا ہے ہر کسی کو اسی دروازے سے داخل ہونا ہے۔

سورۃ الحج رکوع 7 آیات 49 تا 57

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّمَاۤ اَنَا لَكُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۴۹﴾ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِیْمٌ ﴿۵۰﴾ وَ الَّذِیْنَ سَعَوْا فِیْۤ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیْنَ
اُولٰٓىٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ ﴿۵۱﴾ وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا نَبِیٍّ
اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤى اَلْقَى الشَّیْطٰنُ فِیْۤ اُمْنِیَّتِهٖ ۚ فَیَنْسَخُ اللّٰهُ مَا یُلْقِی الشَّیْطٰنُ
ثُمَّ یُحْكِمُ اللّٰهُ اٰیٰتِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ ﴿۵۲﴾ لِّیَجْعَلَ مَا یُلْقِی الشَّیْطٰنُ
فِتْنَةً لِّلَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّ الْقَاسِیَةِ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَ اِنَّ الظّٰلِمِیْنَ لَفِیْ
شِقَاقٍۭ بَعِیْدٍ ﴿۵۳﴾ وَّ لِیَعْلَمَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ
فَیُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِلٰى صِرَاطٍ
مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۵۴﴾ وَ لَا یَزَالُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ مِرْیَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَاْتِیَهُمُ السَّاعَةُ
بَغْتَةً اَوْ یَاْتِیَهُمْ عَذَابُ یَوْمٍ عَقِیْمٍ ﴿۵۵﴾ اَلْمُلْكُ یَوْمَىٕذٍ لِّلّٰهِ ؕ یَحْكُمُ
بَیْنَهُمْ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ﴿۵۶﴾ وَ الَّذِیْنَ
كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا فَاُولٰٓىٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ ﴿۵۷﴾

آپ فرما دیجیے کہ اے لوگو! بے شک میں تم کو (انجام بد سے) واضح طور پر ڈرانے
والا ہوں ﴿۴۹﴾ سو جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک کام کرنے لگے ان کے لیے
بخشش ہے اور عزت کی روزی ﴿۵۰﴾ اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں میں (اپنے
زعمِ باطل کے مطابق ہمیں) عاجز کرنے کی کوشش کی وہی دوزخ کے رہنے والے

ہیں ﴿۵۱﴾ اور ہم نے آپ سے قبل کوئی پیغمبر اور کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا مگر (اسے یہ قصہ پیش آیا) یہ کہ جب وہ کوئی آرزو کرتے تو شیطان ان کی آرزو میں (کافروں کے دلوں میں) وسوسہ ڈال دیتا۔ جو وسوسہ شیطان ڈالتا ہے تو اللہ اس کو دور فرما دیتے ہیں پھر اللہ اپنی آیتوں کو مضبوط کر دیتے ہیں اور اللہ علم والے حکمت والے ہیں ﴿۵۲﴾ (یہ واقعہ اس لیے بیان ہوا) تا کہ اللہ شیطان کے ڈالے ہوئے (وسوسوں) کو ایسے لوگوں کے لیے آزمائش بنا دیں جن کے دلوں میں (شک کا) مرض ہے اور جن کے دل (بڑے) سخت ہیں۔ اور واقعی (یہ) غلط کار لوگ بڑی مخالفت میں ہیں ﴿۵۳﴾ اور تا کہ جن لوگوں کو علم عطا ہوا ہے وہ جان لیں کہ یہ (وحی) آپ کے پروردگار کی طرف سے سچ ہے تو وہ اس پر ایمان لائیں پھر ان کے دل اس (اللہ) کے آگے عاجزی کریں اور بے شک اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے سیدھے راستے کی طرف ہدایت فرماتے ہیں ﴿۵۴﴾ اور جو لوگ کافر ہیں وہ ہمیشہ اس سے شک میں رہیں گے یہاں تک کہ ان پر اچانک قیامت آ جائے یا ان پر بے برکت دن (قیامت کے دن) کا عذاب آ پہنچے ﴿۵۵﴾ اس روز بادشاہی اللہ ہی کی ہو گی وہ ان میں فیصلہ فرمائیں گے پس جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے وہ نعمت کے باغوں میں ہوں گے ﴿۵۶﴾ اور جن لوگوں نے کفر کیا ہو گا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہو گا تو ان کے لیے ذلت کا عذاب ہو گا ﴿۵۷﴾

تفسیر و معارف

انسانیت پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا احسان:

آج کہا جاتا ہے ساری دنیا ایک گاؤں بن گئی ہے گلوبل ولیج (Global Village) بن گئی ہے۔ یہ تو ساڑھے چودہ سو سال پہلے گلوبل ولیج بن گئی تھی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ساری انسانیت کو اللہ کے حکم سے مخاطب کیا، فرمایا: قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَآ اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۴۹﴾ آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) فرما دیجیے کہ اے لوگو! بے شک میں تم کو (انجامِ بد سے) واضح طور پر ڈرانے والا ہوں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلّم اعلان فرما دیجیے کہ اے اولادِ آدم تم جہاں کہیں بھی ہو میرا یہ منصب ہے کہ تمہیں تمہاری بدکرداری کے انجام بد سے جو صدیوں بعد آنا ہے، آج آگاہ کردوں۔ میں اللہ کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلّم) ہوں اور میرا منصب اللہ کا پیغام پہنچانا ہے۔ میرا منصب اتنا عظیم ہے کہ وہ سلوک جو مرنے کے بعد تمہارے ساتھ تمہارے کردار کی بنیاد پر ہوگا اور جو سلوک قیامت کے بعد تم سے کیا جائے گا وہ میں تمہیں آج بتا دوں۔ اے بنی آدم! میں تمہارا سب سے بڑا خیر خواہ ہوں۔

جیسے کوئی بہترین طبیب پہلے سے بتا دے کہ یہ چیز چھوڑ دو ورنہ بیمار ہو جاؤ گے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا منصبِ جلیلہ یہ ہے کہ وہ انسانوں پر وہ باتیں واضح کر دیں جن کا پتا انہیں مرنے کے بعد لگنا ہے۔ انسان جو آج کر رہے ہیں اس کے نتیجے میں پسِ مرگ اُن پر کیا وبال آئے گا؟ یہ نتائج صرف اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلّم بتا سکتے ہیں۔ طبیب تو اس عارضی زندگی کے لیے دوا اور پرہیز تجویز کرتا ہے، موت آجائے گی تو طبیب کا کام ختم ہو گیا کہ وہ زندہ لوگوں کا علاج کرتا ہے۔ ہم طبیب کے کہنے پر بہترین اور مرغوب غذائیں چھوڑ سکتے ہیں تو جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں کہ بُرا کام تمہیں مرنے کے بعد آگ کا انگارہ بن کر جلائے گا۔ شرک شعلے بھڑکا دے گا، یہ جتنے گناہ تم کرتے ہو یہ انگارے جمع کر رہے ہو جو تمہیں مدتوں جلاتے رہیں گے تو انسانیت پر یہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کا کتنا بڑا احسان ہے کہ کتنی دور کی بات آج بتا رہے ہیں۔ اب یہ انسان کا فیصلہ ہے کہ اس پر عمل کرتا ہے یا سنی ان سنی کر دیتا ہے۔

ایمان کیا ہے؟

فرمایا: فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۔۔۔ سو جو لوگ ایمان لائے۔

اے اولادِ آدم (علیہ السلام) اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم تمہیں انجامِ بد سے بروقت آگاہ کرنے والے ہیں اور یہ خبر بھی دے رہے ہیں کہ جو لوگ ایمان لائیں گے وہ سرخرو ہوں گے۔ ایمان کیا ہے؟ ایمان نام ہے اعتماد علی الرسول صلی اللہ علیہ وسلّم کا یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی بات ویسی ہی مان لینا جیسی آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمائی ہے۔ یہ ایمان ہے۔

اللہ کریم کو ہم واحد و لاشریک مانتے ہیں۔ ہم مانتے ہیں کہ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا لیکن ہم نے اللہ کو کہاں دیکھا، ہم نے اللہ کو کہاں پایا پھر ہمارے پاس کیا دلیل ہے؟ ہمیں یہ حقائق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے بتائے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی بات پر یقین کا نام ایمان ہے۔ اگر یہ

یقین ہے تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی سب باتوں پر جو وہ آخرت، نیکی، گناہ، سزا، جزا کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں اعتماد کرلو۔ ہم سے گناہ اسی لیے ہوتے ہیں کہ ہمارا اعتماد علی الرسول صلی اللہ علیہ وسلّم کمزور پڑ جاتا ہے جہاں کمزور پڑتا ہے وہاں ہم برائی کرتے ہیں۔ جہاں ہمارا یقین مستحکم رہتا ہے وہاں ہم برائی نہیں کرتے بلکہ نیکی کی طرف جاتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے حکم کی طرف جاتے ہیں۔ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۔۔۔کا ترجمہ تشریح کے لیے عرض ہے کہ 'وہ مجھ پر اعتبار کرتے ہیں' یعنی جو لوگ ایمان لاتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم پر اعتماد اور یقین کرتے ہیں اس کی دلیل یہ ہے کہ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔۔۔اور نیک کام کرنے لگے۔ ایمان کی دلیل یہ ہے کہ پھر اُن کے عمل صالح ہوجاتے ہیں۔ اُن کا کردار بدل جاتا ہے اور وہ نیکی اختیار کرلیتے ہیں۔

انسانی مزاج ہے کہ ہر بندہ جو کام کرتا ہے اُسے درست سمجھتا ہے اور اس کے پاس اس کا جواز بھی ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ کسی قاتل سے پوچھا جائے تو وہ بھی قتل کا جواز دیتا ہے اور اپنی غلطی تسلیم نہیں کرتا۔ چور کے پاس چوری کا جواز ہوتا ہے اور اپنے عمل کو ٹھیک سمجھتا ہے۔ عملِ صالح اس عمل کو کہا جائے گا جو ٹھیک ہو لیکن یہاں تو ہر بندہ اپنے عمل کو ہی ٹھیک گردانتا ہے۔ پھر عملِ صالح کی دلیل کیا ہوگی؟ عملِ صالح کا معیار بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات ہوں گے۔ جس کام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا یہ ٹھیک ہے، وہ ٹھیک ہے، جس کام کو غلط قرار دیا وہ غلط ہے۔ اس میں کسی اور کی پسند کو دخل نہیں۔ اس میں سربراہانِ مملکت، پیر، فقیر، مولوی یا عام شہریوں کی پسند کو دخل نہیں ہے۔ جس عمل کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم نے صالح فرمادیا وہ کام صالح ہے اور جس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے غیر صالح فرمادیا وہ غیر صالح ہے۔ ایک ہی معیار ہے۔ فرمایا جو ایمان لے آتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم پر اعتماد کرلیتے ہیں اُن کے کردار بدل جاتے ہیں اُن کے اعمال صالح ہوجاتے ہیں جو بات شریعت کے نزدیک درست ہے وہ اُسے درست سمجھتے ہیں۔

ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ہم سے عبادات اور فرائض تک چھوٹ رہے ہیں۔ یہ ایمان میں کمزوری کی دلیل ہے۔ ایک دوسرے پر فتوے لگانے کی بجائے ہم سب اپنی اپنی خبر لیں کہ ہم احکاماتِ الٰہی اور ارشاداتِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلّم پر کتنے کاربند ہیں۔ جتنا ہم ان سے دور ہوتے ہیں اتنا ایمان کمزور ہے اور جتنا ان پر قائم ہیں اتنا ہی ایمان اور یقین سے نوازے گئے ہیں۔ یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ ایمان نرے دعوے کا نام نہیں ہے کہ زبانی کہہ دیا اور عمل نہ کیا بلکہ ایمان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم پر اعتماد و اعتبار کا نام ہے۔ اعتماد اور اعتبار کا تقاضا ہے کہ عمل کیا جائے۔

اللہ کریم کا وعدہ:

جو بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم پر اعتبار کرتا ہے اس کا کردار سدھر جاتا ہے، ایسے لوگوں کیلیے فرمایا: لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۵۰﴾ اُن کے لیے بخشش ہے۔ انسان چاہے بھی تو سستی سے، کوتاہی سے نہیں بچ سکتا کہ بشری کمزوریاں اس کے ساتھ ہیں لیکن جو اللہ پر ایمان لاکر اس کی اطاعت پر اپنی پوری کوشش لگادیں گے۔ جو فرائض، واجبات اور سنن کی ادائیگی پر کاربند ہوجائیں گے تو اُن سے سرزد ہونے والی غلطیوں کو بھی اللہ کریم معاف کردیں گے۔ اللہ کریم کی بخشش بہت وسیع ہے اور ایسے لوگوں کے لیے ہی تو بخشش ہے اور اُن کے لیے بہترین رزق ہے۔ اُن کے محلات ہوں گے، خوبصورت لباس ہوں گے، بہترین قسم کے کھانے ہوں گے اور عالی شان مدارج ہوں گے الغرض ہر نعمت ان کے پاس ہوگی۔

اس کے برعکس دوسرے فریق جنہوں نے، وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۵۱﴾ اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں میں (اپنے زعمِ باطل کے مطابق ہمیں) عاجز کرنے کی کوشش کی وہی دوزخ کے رہنے والے ہیں۔

جو لوگ اللہ کے احکام کو عاجز کرنا چاہتے ہیں ان کی پروانہیں کرتے، اُن کو اہمیت نہیں دیتے ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں جس سے اُن کو بے کار ثابت کیا جائے، اپنی من مانی کرنا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں نے برائی پر کمر باندھ لی ہے کفر پر ڈٹے ہوئے ہیں، شرک پر جمے ہوئے ہیں، گناہ پر قائم ہیں اور ان کا وطیرہ ایسا ہے گویا احکامِ الٰہی کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہیں انہیں بے کار سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کی آیات کو عاجز کرنا، بے اثر کرنا چاہتے ہیں فرمایا، یہ لوگ دوزخ کے رہنے والے ہیں۔ یہ اپنے گھر پہنچ جائیں گے۔

جب دل مردہ ہوجائیں تو نفس ہی نفس رہ جاتا ہے۔ انسان جب مرجاتا ہے تو اُسے کوئی احساس ہی نہیں رہتا۔ یہ مردہ دل ہیں یہ دل کیا چاہیں گے؟ یہ تو ہماری آیات کو عاجز کرنے کی سعی لاحاصل کرتے ہیں۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ اللہ کریم نے احکامِ شریعت پر عمل نہ کرنے کو کس زاویہ سے دیکھا ہے۔ ہم تو اسے معمولی بات سمجھتے ہیں کہ نماز نہیں پڑھی تو خیر ہے، روزہ نہیں رکھا تو کوئی بات نہیں، جھوٹ بول لیا تو کیا ہوا، دنیا کا فائدہ تو مل گیا۔ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ یہ لوگ میری نافرمانی ہی نہیں کرتے بلکہ میرے احکام کو عاجز کرتے ہیں، یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ احکامِ الٰہی لاحاصل ہیں، بے سود ہیں، لہٰذا انہیں رہنے دیں یہ دوزخ کے مکین ہیں یہ اپنے گھر جائیں گے۔

یہاں لوگوں کو دو طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک وہ جن کے دل کو اللہ نے نورِ یقین دیا اور وہ مقدور بھر اتباع کی کوشش کرتے ہیں۔ غلطیاں اُن سے بھی ہوتی ہیں لیکن وہ نیکی کی راہ پر لگے رہتے ہیں۔ یہ ان پر اللہ کا احسان ہے۔ اللہ کریم فرماتے ہیں ایسے لوگوں کے گناہ بخشش دیے جائیں گے اور انہیں بے پناہ رزق عطا ہوگا۔

دوسرا طبقہ وہ ہے جو برائی اور کفر و شرک پر کمربستہ ہے اور اللہ کے احکام کو غیر مؤثر ثابت کرنا چاہتا ہے، عاجز کرنا چاہتا ہے۔ ارشاداتِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مخالفت کرتا ہے ارشاداتِ باری کی مخالفت کرتا ہے اور ہر مخالف اپنے مخالف کو ناکام کرنا چاہتا ہے۔ جو لوگ اطاعت کا راستہ اختیار نہیں کرتے گویا وہ احکامِ باری کو ہرا دینا چاہتے ہیں ناکام اور عاجز کرنا چاہتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ دوزخ میں داخل ہوں گے۔

حاصلِ کلام:

ان ارشاداتِ باری کی روشنی میں ہمیں اپنا فیصلہ کرنا چاہیے۔ زندگی کا ہر لمحہ قیمتی ہے اور کسی کے پاس اگلے لمحے کی سند نہیں ہے کہ وہ اُسے نصیب ہوگا یا نہیں لہٰذا اگر موجودہ لمحے میں ہم توبہ کرلیں تو وہ بہت کریم ذات ہے ہمارے گزشتہ گناہ سب معاف فرمادے گا اور آئندہ نیکی کی توفیق بھی عطا کردے گا۔ قرآن کریم ہر بندے کے ساتھ الگ الگ انداز میں خطاب فرماتا ہے، سمجھاتا ہے۔ یہ باتیں نہایت قیمتی ہیں اللہ ہمیں توفیق دے اور ہم توبہ اور رجوع الی اللہ کرکے خود کو بدل لیں، اللہ ہمیں قبول فرمائے اور اپنے عذاب سے پناہ میں رکھے۔

رسول اور نبی علیہ السلام:

فرمایا: وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّلَا نَبِیٍّ ۔۔۔ اور ہم نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے قبل کوئی پیغمبر اور کوئی نبیؑ ایسا نہیں بھیجا۔ یہاں رسولؑ اور نبیؑ دو الگ الگ مناصب ارشاد ہوئے ہیں۔ رسولؑ صاحبِ شریعت صاحبِ کتاب ہوتا ہے یعنی اپنی شریعت لے کر آتا ہے۔ نبیؑ صاحبِ شریعت نہیں ہوتا بلکہ جس رسولؑ کی شریعت چل رہی ہوتی ہے اُسی کو آگے بڑھانے کے لیے اس کی حیاتِ نو کے لیے مبعوث ہوتا ہے۔ جب کسی رسولؑ کی شریعت جاری ہو اس میں لوگ خرابیاں پیدا کرنا چاہتے ہوں تو اُن کے تدارک کے لیے انبیاؑ مبعوث ہوتے ہیں۔ ہر رسولؑ نبیؑ ہوتا ہے لیکن ہر نبیؑ رسولؑ نہیں ہوتا۔ رسولوںؑ میں اولوالعزم رسولؑ بھی ہیں۔ اولوالعزم وہ رسولؑ ہیں جن کی شریعت بہت احسن انداز میں سابقہ احکام کو ختم کر کے نئے احکام دینا شروع کردے اور جہاں پوری طرح سے انقلاب برپا کردے۔ یہ حضرات پانچ ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اولوالعزم رسولؑ ہیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اولوالعزم رسولوںؑ کے بھی امام ہیں۔

اولوالعزم رسولوںؑ کے بعد رسولوںؑ کی عظمت ہے کہ ہر رسول صاحبِ شریعت ہے۔ رسولوںؑ کے بعد انبیاؑ کی عظمت ہے کہ ہر نبیؑ نظامِ شریعت کو حیاتِ نو بخشتا ہے اور از سرِ نو مجاہدہ شروع کرتا ہے۔

شیطان کی مداخلت اور حفاظتِ الٰہیہ:

فرمایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم سے پہلے جتنے انبیاؑ اور رسولؑ تشریف لائے یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک سب اس میں شامل ہیں کہ جب اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓی اَلْقَی الشَّیْطٰنُ فِیْٓ اُمْنِیَّتِہٖ۔۔۔وہ کوئی آرزو کرتے تو شیطان اُن کی آرزو میں (کافروں کے دلوں میں) وسوسہ ڈال دیتا۔

انبیاؑ اور رسلؑ کی تمنا کیا ہوتی ہے؟ یہی کہ احکامِ الٰہی کو مخلوق تک اس انداز میں پہنچائیں کہ وہ لوگوں کے دلوں میں گھر کر جائیں اور وہ سمجھ لیں۔ وہ ایمان لا کر اللہ کے عذاب سے بچ کر نجات کی طرف جائیں اس کی رحمت کو پالیں۔ انبیاؑ کی تمنا نفاذِ دین ہوتی ہے، اللہ کے دین کی ترویج ہوتی ہے اور جب انہوں نے محنت کی اس آرزو کی تکمیل کی کوشش کی تو، اَلْقَی الشَّیْطٰنُ فِیْٓ اُمْنِیَّتِہٖ۔۔۔اُنؑ کی اس کوشش میں، اُنؑ کے ارشاداتِ عالیہ میں شیطان نے لوگوں کے لیے غلط فہمیاں پیدا کرنے کے لیے اوہام داخل کرنے کی کوشش کی۔ اگر ایک مجلس میں پچاس لوگ بیٹھے ہوں اور سب نے کہنے والے کی بات سنی ہو پھر ان سب سے الگ الگ پوچھا جائے کہ انہیں کیا سمجھ آیا تو سب الگ الگ انداز میں اس کا جواب دیں گے۔ اس لیے کہ سب اپنی اپنی استعداد کے مطابق بات کو سمجھیں گے۔ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو سب ایک مفہوم پر متفق ہو جائیں کہ ہر انسان کی استعداد سننے کی، اور بات کو سمجھنے کی الگ ہے۔ جب انبیاؑ نے حق بیان کیا تو شیطان نے اس کے سننے میں کفار کے دلوں میں شبہ پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن اللہ کریم اُسے کامیاب ہونے نہیں دیتے، فرمایا: فَیَنْسَخُ اللّٰہُ مَا یُلْقِی الشَّیْطٰنُ۔۔۔جو وسوسہ شیطان ڈالتا ہے تو اللہ اس کو دور فرما دیتے ہیں۔

اگر شیطان اپنے ارادوں میں کامیاب ہو جاتا ہے تو تعلیماتِ نبوت سے تو اعتماد ہی اٹھ جائے گا اور کیسے ثابت ہوگا کہ کس بات میں شیطان کی مداخلت ہوئی ہے اور کس میں نہیں ہے۔ سو فرمایا جو وسوسہ شیطان ڈالتا ہے اللہ اس کو مٹا دیتا ہے، اس کی باتوں کو تباہ کر دیتا ہے اور، ثُمَّ یُحْکِمُ اللّٰہُ اٰیٰتِہٖ۔۔۔پھر اللہ اپنی آیتوں کو مضبوط کر دیتے ہیں۔

اللہ کریم اپنی آیات کو جو اللہ کا نبی صلی اللہ علیہ وسلّم پہنچانا چاہتا ہے مضبوط کر دیتے ہیں لہٰذا نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے کسی بھی ارشاد پر رائی برابر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ یہ تحقیق ہونی چاہیے کہ یہ ارشاد نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کا ہے یا نہیں

اس لیے کہ یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص اپنی طرف سے کہہ دے کہ یہ حدیث ہے۔ آج کل تو انٹرنیٹ پر بے شمار ایسے خود ساختہ اقوال واحادیث نظر آتی ہیں جن کی سمجھ ہی نہیں آتی۔ ایسی احادیث نظر آتی ہیں جن کا حدیث سے دور تک کا بھی تعلق نہیں ہے۔ کوئی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اقوال منسوب کر دیتا ہے کوئی کسی ولی اللہ سے کر دیتا ہے۔ یہ اس لیے ہو رہا ہے کہ انٹرنیٹ پر لکھنے والے یہ لوگ عالم ہیں نہ زیادہ پڑھے لکھے نہ ہی سمجھدار ہیں۔ اکثریت ان میں سے لونڈے لڑکے ہیں جن کے منہ میں جو آیا کہہ دیتے ہیں۔ انہیں یہ بھی خوف نہیں آتا کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلّم پر جھوٹ بول رہے ہیں جو ایک سنگین جرم ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے اگر ایک بات نہیں ارشاد فرمائی اور کوئی بندہ وہ بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف منسوب کر دیتا ہے تو اس کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں: مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّداً فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ (بخاری) جس نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولا وہ اپنا ٹھکانہ آگ میں تلاش کرے۔

دوزخ جانے کے لیے اتنا جرم کافی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف اس بات کی نسبت کر دی جائے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے نہیں فرمائی لیکن افسوس کہ آج کل لوگوں کو شاید اس بات کا احساس نہیں ہے۔ جو رطب و یابس لفظ ملتا ہے وہ لکھ دیتے ہیں۔ یہ تحقیق ضروری ہے کہ یہ ارشادِ نبوت ہے یا نہیں اور اگر ثابت ہو جائے کہ ارشادِ عالی ہے تو سوائے سرِ تسلیم خم کے اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ سو قانونِ قدرت یہ ہے کہ جب شیطان باتیں القا کرتا ہے تو اللہ کریم انہیں مٹا دیتے ہیں اس لیے کہ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۲﴾ اللہ علم والے حکمت والے ہیں۔

حکمتِ الٰہی کا تقاضا:

فرمایا: وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۵۲﴾ اللہ کریم ہر بات کو جاننے والے اور حکمت والے ہیں۔ اللہ قادر ہیں چاہیں تو شیطان کو ایسی مداخلت کرنے سے روک سکتے ہیں، اُسے تباہ کر سکتے ہیں، شیطان بھی اللہ ہی کی مخلوق ہے اگر اللہ چاہیں تو اُسے موت دے سکتے ہیں۔ اللہ کریم اس کی زبان روکنے پر قادر اس کی بینائی چھیننے پر قادر ہیں، اُسے عاجز کرنے پر قادر ہیں لیکن اللہ کریم کی حکمت کا تقاضا ہے کہ شیطان رہے اور انسان کی آزمائش ہو۔

انسان کی آزمائش بھی تو یہی ہے کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی بات سنتا ہے یا شیطان کی طرف جاتا ہے۔ یہی حکمتِ الٰہی کا تقاضا ہے اور اسی پر آخرت میں فیصلے ہوں گے۔ جب کوئی شیطانی وساوس کو ردّ کر کے تعلیماتِ نبوت (صلی اللہ علیہ وسلّم) کا دامن تھامتا ہے تو اُسے نورِ ایمان نصیب ہوتا ہے اور پھر توفیقِ عمل نصیب ہوتی ہے اُسی کو مسلمان کہتے ہیں، اسی پر ایمان قائم ہوتا ہے، اسی پر کردار کی تعمیر ہوتی ہے یہ مسلمان ولی اللہ بھی ہوسکتا ہے،

عالم بھی ہوسکتا ہے اور ایک عام مسلمان بھی جنت کا مستحق ہوسکتا ہے۔ جو اس آزمائش میں پورا نہیں اترتے اور دامانِ نبوت کو چھوڑ کر شیطانی وساس کی طرف چل پڑتے ہیں وہ گمراہ ہو جاتے ہیں۔

آج کل تو یہ رواج بن گیا ہے کہ لوگ خدائی دعویدار بنے بیٹھے ہیں اپنے آپ کو لوگوں کا حاجت روا اور مشکل کُشا سمجھتے ہیں۔ یہ سب شیطانی وساوس ہیں اور جو لوگ اللہ کے مقابلے میں ان سے مدد چاہتے ہیں ان سے یہ امید رکھتے ہیں کہ اگر یہ چاہیں تو ان کی زندگی آباد ہو جائے گی یا یہ ناراض ہوگئے تو ان کو تباہ کردیں گے ایسے لوگ شیطان کے پیروکار ہیں۔ انسان کی آزمائش یہی ہے کہ اُسے جو معرفتِ حق کی استعداد بخشی گئی ہے کیا اُس سے کام بھی لیتا ہے یا نہیں۔ کیا وہ اطاعتِ الٰہی اختیار کرتا ہے یا احکاماتِ الٰہی اور ارشاداتِ نبوی میں چور دروازے تلاش کرتا ہے (Short Cut) تلاش کرنا شروع کر دیتا ہے، یہی اس کا امتحان ہے۔ اگر ایسا کرتا ہے تو گمراہ ہو جاتا ہے۔ اگر وہ معرفتِ حق کی استعداد کو سلامت رکھتا ہے۔ اللہ کو یاد کرتا ہے، حلال کھاتا ہے، فرائض واجبات اور سنن اللہ کی دی ہوئی توفیق سے ادا کرتا ہے تو شیطان کا جادو اس پر نہیں چلتا اللہ کریم اس کی حفاظت فرماتے ہیں۔

دلوں کی بیماری کا اصل سبب:

فرمایا: لِيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ۔۔۔ (یہ واقعہ اس لیے بیان ہوا) تا کہ اللہ شیطان کے ڈالے ہوئے (وسوسوں) کو ایسے لوگوں کے لیے آزمائش بنادیں جن کے دلوں میں (شک کا) مرض ہے اور جن کے دل بڑے سخت ہیں۔

یوں تو علمائے حق دلوں کی بہت سی بیماریاں گنواتے ہیں، لالچ، کبر، نخوت وغیرہ لیکن یہ سب تو پھل ہیں جبکہ دلوں کی بیماری کا اصل درخت معرفتِ حق سے محرومی ہے۔ اللہ کریم نے تو دل کو یہ استعداد بخشی تھی کہ وہ اللہ اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات کا تجزیہ کرتا، غور کرتا اور حق کو پہچان کر قبول کرتا لیکن جب دل اللہ سے دوری اور بیزاری کے مریض بنے تو اُسے حقیقتیں تلخ لگنے لگتی ہیں۔ جیسے ایک آدمی بیمار ہو جائے تو اُسے وہ کھانا کڑوا لگنے لگتا ہے جو وہ روز کھاتا تھا، اس لیے کہ بیماری نے اس کے منہ کا ذائقہ خراب کر دیا ہوتا ہے۔ دلوں کا عالم بھی یہی ہے کہ جب کوئی اللہ کا در چھوڑ کر غیر اللہ کے در پہ جاتا ہے، جب اطاعتِ الٰہی ترک کر کے برائی اپناتا ہے، برائی سوچتا ہے تو اس کے دل میں مرض پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں انسان کو حق کڑوا لگنے لگتا ہے اور اللہ کی عظمت کا احساس مفقود ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں شیطان کی القا کی ہوئی باتیں ان بیمار قلوب کے لیے غذا بن جاتی ہیں۔ وہ پہلے ہی مریض ہیں ایک مرض ان پر مزید آ جاتا ہے۔ جس طرح انسانی وجود کی مدافعت کا نظام وجود کا دفاع کرتا ہے، جب یہ نظام کمزور پڑتا

ہے تو ہر بیماری وجود کو پکڑ لیتی ہے۔ اسی طرح اللہ کے بندوں کے لیے شیطانی باتوں کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی، اللہ کریم شیطانی القا اور وساوس کو مٹا دیتے ہیں۔

یہ شیطانی باتیں ان لوگوں کے لئے آزمائش بن جاتی ہیں جن کے قلوب سخت ہو چکے ہیں۔ دلوں کا مرض بے یقینی ہوتا ہے کہ یقین ہی ایمان ہے۔ ارشادات نبوت صلی اللہ علیہ وسلّم پر یقین ہی سارا ایمان ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ہمیں بتایا کہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہے اس کی ذات وصفات کے بارے میں ہمارے پاس ایک ہی دلیل ہے یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشاداتِ عالی۔ قرآن اللہ کا کلام ہے یہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ہمیں بتایا اور ہمیں عطا فرمایا۔ اسی اعتماد کا نام تو ایمان ہے۔ اس نورِ یقین کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں قلوب کو متوجہ الی اللہ کرنا ہوگا تاکہ جب یہ اللہ کا کلام، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات سنے تو حق کو قبول کرلے ہر بات کو یقینی سمجھ کر قبول کرلے اور شیطان جو وساوس القا کرنے کی کوشش کرتا ہے اُن وساوس کی دلدل میں قطعاً نہ جائے۔ غیر یقینی باتوں کی طرف نہ جائے۔ اسی لیے اللہ کریم نے قرآن سننے کا بھی طریقہ ارشاد فرما دیا۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے: وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا۔۔۔ (الاعراف: 204) جب قرآن پڑھا جائے تو خاموشی سے سنو۔

قرآن کریم کا دیکھنا بھی عبادت ہے، پڑھنا سنت ہے اور تلاوت ہو رہی ہو تو سننا فرض ہے لیکن اس سے بھی اہم ایک فریضہ ہے کہ صرف ثواب جمع نہ کرتے رہ جائیں بلکہ جو سنا جائے اس کا دل میں تجزیہ کر کے دل نشین کیا جائے۔ محض ثواب سمجھ کر سننا اور اُٹھ جانا کافی نہیں۔ ثواب تو یقیناً ہوگا، اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں لیکن مقصد صرف ثواب حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ جو تجزیہ ہو رہا ہے اُسے سمجھا جائے اور آئندہ زندگی کا لائحہ عمل اس کے مطابق ترتیب دیا جائے۔ یہ بہت فکر کا مقام ہے آج تو ہم اس معاملے میں بہت سہل پسند ہو چکے ہیں کہ وعظ ہو رہا ہو تو کہتے ہیں کہ چلو پندرہ بیس منٹ سن لیا جائے، پھر کچھ اونگھ لیا، کچھ سو لیا پھر وضو کرنے چلے گئے۔

یہ درست نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات پیش کیے جاتے ہیں تو شیطان کا تو یہ حال ہے کہ وہ انبیاؑ اور رسولوںؑ کے پیش کرنے پر لوگوں پر اپنی باتیں القا کرنے سے وسوسے ڈالنے سے نہیں چوکتا، تو جب کوئی عام آدمی، ایک عالم یا مفتی بیان کر رہا ہوگا تو شیطان کتنی کوشش کرتا ہوگا! اگر انبیاؑ کی باتوں میں وہ اپنے وسوسے ڈالنا چاہتا ہے تو پھر ایک عام آدمی یا ماوشما کے ساتھ کیا ہوتا ہوگا۔

یہ سامعین کی ذمہ داری ہے کہ انہیں نورِ یقین نصیب ہوتا ہے یا جیسے مذبذب آئے تھے ویسے مذبذب چلے گئے۔ اس نورِ یقین کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں اپنے دل کو اللہ کی طرف متوجہ کرنا ہوگا تاکہ دل حق کو قبول کرے اور

شیطانی وساسوس کی طرف نہ جائے۔ اللہ کی بات کو یقینی سمجھ کر قبول کرلے، غیر یقینی باتوں کی طرف نہ جائے اس لیے کہ شیطان جو باتیں لوگوں پر القا کرتا ہے وہ اُن دلوں کو جن میں بے یقینی کا مرض ہوتا ہے، آزمائش بن جاتی ہیں۔ ارشادات نبی صلی اللہ علیہ وسلّم پر یقین ہی سارا ایمان ہے۔ جب اس ایمان میں کمزوری آتی ہے تو یہی دلوں کی بیماری ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات پر اعتماد کم ہوجاتا ہے اور اپنی ادنیٰ عقل کے تجزیے پر اعتماد زیادہ ہوجاتا ہے۔ عقل اللہ نے عطا کی اور ضرور استعمال کی جائے لیکن ارشادِ باری اور قولِ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کے مقابلے میں عقلی تجزیہ تباہ کردیتا ہے۔

دل میں جب نور ایمان آتا ہے تو دل میں حِلم، محبت، بردباری، خیرخواہی، اللہ سے تعلق، نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت، اللہ کے بندوں پر شفقت جیسے اوصاف پیدا ہوجاتے ہیں۔ جب دل ایمان سے محروم رہتا ہے تو وہ اپنی اکڑ میں آتا ہے پتھر بن جاتا ہے۔ اسے عظمتِ الٰہی کا احساس ہوتا ہے نہ محبتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلّم نصیب ہوتی ہے نہ ہی لوگوں سے شفقت کرنا چاہتا ہے۔ سب کے حقوق چھیننا چاہتا ہے اور سب کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ سو فرمایا جن لوگوں کے دلوں میں مرض ہوتا ہے یا جو دل سخت ہوجاتے ہیں اُن کے لیے شیطان کی القا کی ہوئی باتیں ان کے مرض میں اضافے کا باعث بنتی ہیں۔ ایسے لوگ ظالم ہوتے ہیں، ہر کام غلط کرتے ہیں ہر کام غلط انداز میں کرتے ہیں۔ فرمایا: وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ﴿۵۳﴾ اور واقعی (یہ) غلط کار لوگ بڑی مخالفت میں ہیں۔

یہ ظالم پھر اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی مخالت میں بہت دور نکل جاتے ہیں حالانکہ وہ اللہ کی مخلوق ہیں اور یہ مخلوق کتنی باریکی سے تخلیق کی گئی ہے اس کا اندازہ جدید تحقیقات سے کیا جاسکتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو انسان لرز جاتا ہے کہ کس طرح ایک ایک سیل (Cell) کو جوڑا گیا اور اُن میں کیا خصوصیات رکھی گئیں۔ کوئی سیل (Cell) جب اپنی جگہ کام کرنا چھوڑ دیتا ہے تو اچھا بھلا تگڑا آدمی دیوار کا سہارا لیتا نظر آتا ہے۔ یہ عظمتِ الٰہی کے دلائل ہیں کہ بندہ یا کوئی مخلوق خود کچھ بھی نہیں ہے صرف اللہ کے بنانے اور قائم رکھنے سے ہے۔ جہاں وہ کمزور کردے وہاں مخلوق کی طاقت جواب دے جاتی ہے۔ انسان کو اللہ نے استعداد دی ہے اور عظمتِ الٰہی کو پانے کا مکلف بنایا ہے، اسے چیزیں سمجھنے کا شعور بخشا ہے۔ انسان جو باتیں سنے اس کا تجزیہ کرکے عظمتِ الٰہی تک پہنچ سکتا ہے۔ اللہ کی مخلوق کو دیکھ کر انسان اس کے عظیم خالق کی عظمت کو پہچان لیتا ہے جو ان سب کا خالق ہے لیکن اگر دلوں میں خرابی آ

جائے، دل سخت ہو جائیں تو پھر یہ حقائق سمجھ نہیں آتے اور انہیں اہمیت نہیں دی جاتی۔

مومن کا قلب کیفیات حاصل کرتا ہے:

فرمایا: وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ۔۔۔اور تا کہ جن لوگوں کو علم عطا ہوا ہے وہ جان لیں کہ یہ (وحی) آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کے پروردگار کی طرف سے سچ ہے تو وہ اس پر ایمان لائیں پھر اُن کے دل اللہ کے آگے عاجزی کریں۔

اللہ کریم فرماتے ہیں کہ جن کو میں نے علم دیا ہے وہ جان لیں، یہ سمجھ لیں، یقین کر لیں کہ وحی الٰہی، ارشاداتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلّم آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے پروردگار کی طرف سے حق ہیں۔ یہاں اللہ کریم نے اسمِ ذات 'اللہ' کی بجائے 'ربّ' فرمایا ہے یعنی وہ ذات جو سب کی خالق ہے، سب کی پالنہار ہے پروان چڑھانے والی ہے یعنی اگر ان چیزوں کا تجزیہ کیا جائے تو دیکھنے والے کو حق نظر آئے گا۔ صرف ایک زبانِ حق ترجمان یعنی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم پر جب نورِ یقین نصیب ہو جاتا ہے تو شیطانی وساوس اور شیطان کی ساری کوششیں پیچھے رہ جاتی ہیں۔ اللہ کریم شیطان کے اوہام کو مٹا دیتے ہیں اور پھر یہ کلام انسان کے ربّ کی طرف سے ہے جسے اس ربّ نے ذرّہ ذرّہ جوڑ کر بنایا۔ ایک انسانی وجود میں دس کھرب Cell ہیں۔ یہ Cell اتنے باریک ہیں کہ اُن کو دیکھنے کے لیے خاص قسم کی خوردبین ہوتی ہے کہ یہ عام قسم کی خوردبین سے بھی نظر نہیں آتے۔ ان Cells کو جوڑ کر اللہ کریم وجودِ انسانی کے مختلف اعضاو جوارح تخلیق کرتے ہیں جو اپنا اپنا کام کرتے ہیں۔ ایک مکمل نظامِ حیات بنایا کہ غذا سے بدن کو تعمیر کرنے کے لیے نظامِ ہضم بنایا۔ الغرض جس ربّ نے انسان کو بنایا یہ اسی کا ارشادِ برحق ہے چنانچہ، فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ ۔۔۔اس پر یقین سے جم جاؤ اور فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ۔۔۔اپنے دلوں کو اس کے آگے عاجز کر دو، دم مت مارو، دلوں میں اس کو جذب کر لو۔ اُس پر دلوں میں یقین پیدا کرو، اعتماد پیدا کرو۔

ماننے کے دو درجے ہیں۔ ایک درجہ ہے کہ عقل مانتی ہے کہ یہ بات ٹھیک ہے غلط نہیں ہو سکتی لیکن عقل مان کر بھول جاتی ہے۔ دوسرا درجہ ہے دل کے ماننے کا، جب دل مانتا ہے تو اس کا انداز مختلف ہوتا ہے۔ دل جب کسی حقیقت کو مانتا ہے تو اس پر عمل کرتا ہے۔ اگر محض عقل مانتی ہے اور دل نہیں مانتا تو عمل کی اصلاح نہیں ہوتی۔ انسان کلمہ بھی پڑھتا رہتا ہے کہتا رہتا ہے کہ اللہ نے جو فرمایا وہ ٹھیک ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم برحق ہیں، قرآن برحق ہے آخرت میں حساب کتاب ہو گا جب وہاں جائیں گے دیکھی جائے گی۔ اب کس نے دیکھا ہے جب وہاں جائیں گے دیکھ لیں گے، یہ ماننا عقل کا ہوتا ہے جب دل مانتا ہے تو پھر فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ۔۔۔دل اس کے سامنے بچھ جاتا ہے اور

ایک ایک حکم پر عمل کرنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ مومن کے دل کو یہ کیفیت نصیب ہوجاتی ہے۔ انسانی کمزوریوں کی وجہ سے اس سے خطا بھی ہوجاتی ہے، کوتاہی اور غلطی بھی سرزد ہوجاتی ہے لیکن اس کی تمنا یہ ہوتی ہے کہ وہ اللہ کو ٹوٹ کر چاہے اور ہر ارشادِ عالی پر عمل کرے۔

ہم سب کو اپنا اپنا جائزہ لینا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ کیا ہماری عقل نے مان رکھا ہے یا دل نے؟ جب دل مانے گا تو پگھل کر اس سانچے میں ڈھل جائے گا اور بندے کا اعمال و کردار اتباعِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈھل جائے گا۔ دل نہیں مانے گا تو عمل نہیں کرے گا۔

ایمان کا معیار:

فرمایا: وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۴﴾ بے شک اللہ اُن لوگوں کو جو ایمان لائے سیدھے راستے کی طرف ہدایت فرماتے ہیں۔ قرآن کریم نے یہ معیار دے دیا کہ جو ایمان لے آتے ہیں پورے یقین سے مان لیتے ہیں اللہ کریم اُن کی راہنمائی کردیتے ہیں سیدھے راستے کی طرف، یعنی انہیں توفیقِ عمل عطا کردیتے ہیں۔ اُن کی عملی زندگی اسلام کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ ربّ کریم نے ماننے یا نہ ماننے کا معیار بتادیا تاکہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ اس نے مان رکھا ہے۔ اگر مانا ہے تو اس پر عمل کرنا ضروری ہے کہ اللہ کریم ماننے والوں کو بالکل سیدھے راستے کی طرف ہدایت نصیب فرماتے ہیں یعنی عملاً اُن کی اصلاح ہوجاتی ہے۔ ایسا ماننا کہ عملاً اطاعتِ الٰہی نہ کرنا، حلال حرام کی پروانہ کرنا سچ اور جھوٹ میں تمیز نہ کرنا، حق اور باطل کی پروانہ کرنا، عبادات، فرائض ضائع کرنا اور ساتھ یہ کہنا کہ میں مانتا ہوں یہ دنیاداری کی حد تک تو چل جائے لیکن عنداللہ مقبول نہیں ہے۔ بھلا ایسا ماننا بھی کوئی ماننا ہے!

بزرگوں سے تعلق کا زعم:

لوگ اس بات پر ہی اکتفا کر لیتے ہیں کہ فلاں بزرگ سے میں بیعت ہوگیا، میرا فلاں مولوی صاحب سے تعلق ہے چنانچہ میری نجات ہوگئی میں بچ گیا، یا فلاں دربار یا خانقاہ پر حاضری دے آئے اور معاملہ ختم۔ یاد رکھیں یہ سوائے وہم کے اور کچھ بھی نہیں۔ پیر صاحب سے اگر تعلق ہے اور اس تعلق کی نسبت سے نیکی نصیب ہو جائے تو الحمدللہ اچھا تعلق ہے۔ مولوی صاحب سے تعلق ہے اور اگر اس تعلق کی نسبت سے نیکی پر عمل نصیب ہو جائے تو الحمدللہ۔ جس تعلق سے نیکی پر عمل نصیب نہیں ہوتا وہ تعلق نہ ہونے کے برابر ہے اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ اللہ کریم نے یہ معیار دے دیا ہے کہ جو ایمان لاتا ہے اللہ اسے ہدایت دے دیتے ہیں، صراطِ مستقیم پر

چلنے کی توفیق دے دیتے ہیں۔

لوگ ایسے بد بخت ہیں کہ سود لے لیتے ہیں ساتھ یہ دعویٰ بھی ہے کہ ہماری کہیں بیعت ہے، کمال ہے یہ کیا خاک بیعت ہے! سود خور کی کون سی بیعت ہے اور وہ کس بھلائی کی توقع رکھتا ہے! نجانے یہ کس مٹی سے بنے ہیں۔ کیسے مسلمان ہیں ہم اور نے کون سا کلمہ پڑھا ہے، اس کلمے کو کس طرح مانا ہے، یہ کون سا اسلام ہے؟ اور کون سی پیری مریدی ہے، کس سلسلے سے ہیں؟ اگر حرام ہی کھانا ہے تو آزاد ہو کر جو کرنا ہے کرو، چھوڑو سلاسل اور بیعتوں کو کہ اس طرح کی بیعت ہوتی بھی نہیں ہے۔ اس لیے ایسے بندوں کو بیعت سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

کفار کی روش:

فرمایا: وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتَّىٰ تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً أَوْ يَأْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيمٍ ﴿٥٥﴾

اور جو لوگ کافر ہیں وہ ہمیشہ اس سے شک میں رہیں گے یہاں تک کہ ان پر اچانک قیامت آجائے یا ان پر بے برکت دن (قیامت کے دن) کا عذاب آپہنچے۔

جو لوگ نورِ ایمان سے محروم ہیں، کافر ہیں یہ اُن کی روش ہے کہ وہ ہمیشہ شک میں ہی مبتلا رہتے ہیں کہ پتا نہیں ایسا ہے یا نہیں۔ پتا نہیں یہ برائی ہے یا نہیں۔ یقین ہوتا تو برائی سے رک جاتا۔ کافر ہمیشہ ایسے سوچتا ہے کہ یہ برائی نہیں ہے بلکہ ایسا تو زمانے میں ہوتا ہی ہے۔ تجارت پر بھی منافع آتا ہے تو سود بھی تو منافع ہے چونکہ منافقین بھی بدترین کافر ہوتے ہیں لہٰذا ایسی سوچ اُن کی ہوتی ہے۔ اُن سے پوچھا جائے کہ کتا بھی جانور ہے اور بکرا بھی جانور ہے، دونوں میں کیا فرق ہے؟ فرق یہ ہے کہ اللہ کریم نے کتے کو حرام اور بکرے کو حلال بنایا ہے۔ وہی بکرا اگر بغیر تکبیر پڑھے، بغیر ذبح کیے مرجائے تو حرام ہے۔ بھئی بکرا تو ہے مر گیا تو حرام کیسے ہو گیا؟ اس لیے حرام ہو گیا کہ اس نے اللہ کے نام کے بغیر جان دے دی۔ وہ انسان جو اللہ کے نام کے بغیر جی رہا ہے وہ کیسے حلال رہے گا؟ کیا وہ اللہ کا نام لیتا ہے، اس کی زبان پر اللہ کا نام ہے اُس کے دل میں اللہ کا نام بستا ہے۔ کیا اس کے کردار سے پتا چلتا ہے کہ وہ اللہ کا بندہ ہے۔ فرمایا یہ تو کافر کی خصوصیت ہے کہ وہ شک میں رہتا ہے اور زندگی اپنی مرضی سے جیتا ہے، چوری کرے حرام کھائے جو چاہے کرے۔ اگر مومن سود لے لیتا ہے تو اس کا مطلب ہے اس کے ایمان میں اتنی طاقت نہیں جو اُسے حرام سے روک دے اور یہ نشانی ایمان کے خلاف جاتی ہے۔ یہ کافر کا حال ہے کہ وہ ہمیشہ

شک میں رہتا ہے اور مرتے دم تک برائی سے نہیں رکتا۔ ایسا رویہ اپناتا ہے کہ شکوک وشبہات میں ہی مبتلا رہتا ہے کہ ایسا ہوگا یا نہیں کہ اچانک اُسے اللہ کا عذاب آلے، قیامت اچانک قائم ہو جائے۔ کیا پتا کس وقت موت آجائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشادِ عالی ہے: مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ (حدیث مرفوع) جو مرتا ہے اس کی ایک طرح سے قیامت قائم ہو جاتی ہے وہ عرصہِ قیامت میں داخل ہو جاتا ہے۔ اَوْ يَاْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ ﴿۵۵﴾ یا ان پر ایسے دن کا عذاب آپڑے جو بندے کو اجاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ عَقِيْمٍ سے مراد اس طرح تباہ ہو کہ جس کا کوئی نشان بھی نہ رہے۔

یہ ارشاداتِ باری اس لیے ہیں کہ ہر کوئی اپنا آپ تلاش کرے کہ وہ کس صف میں کھڑا ہے کس مقام پر کھڑا ہے۔ اس کا کھانا پینا حلال ہے یا نہیں لباس، بود وباش اور فکر کیسی ہے۔

حقیقی بادشاہت:

دنیا میں تو ہر کوئی بڑا آدمی بن جاتا ہے، ہر کوئی حکمران بنا ہوا ہے اور یہ بات ایک حد تک درست بھی ہے کہ ہر آدمی کے پاس بادشاہی ہے۔ اپنے وجود پر تو اس کی حکومت ہے، اپنے بیوی بچوں پر تو اس کی حکمرانی ہے۔ کچھ ایسے ہوتے جن کی محلے پر دھاک ہوتی ہے، بعض کی علاقے پر دھاک ہوتی ہے کچھ لوگ ممالک پر حکمران ہوتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادِ عالی کا مفہوم ہے کہ تم میں سے ہر ایک کے پاس اختیار ہے، تم میں سے ہر کوئی حکمراں ہے۔ ہر حکمراں کو اس کی حکومت کے بارے پوچھا جائے گا۔ دنیا میں تو اللہ نے اختیارات دیے ہیں، حکمرانوں کی حکومت رعایا پر ہے، پیر صاحب کی مریدوں پر، مولوی صاحب کی مقتدیوں پر اور سیاستدان کی اپنی جماعت پر ہے۔ فرمایا، ایک دن آرہا ہے کہ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ؕ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ۔۔۔ اس روز بادشاہی اللہ ہی کی ہوگی وہ ان میں فیصلہ فرمائیں گے۔ ایک دن آرہا ہے جب حکومت صرف اللہ کی ہوگی کسی کو اپنے اوپر بھی اختیار نہیں ہوگا تو سب بادشاہتیں ختم ہو جائیں گی۔ سب کے اختیارات سلب ہو جائیں گے اس دن حکم صرف اللہ کا ہوگا۔ پھر وہ مخلوق کے درمیان فیصلے کرے گا۔ سب بے بس اور لاچار ہوں گے اور اُن کے پاس اللہ کا فیصلہ ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا اور وہ اس سے سرمو انحراف نہیں کر سکیں گے۔ فرمایا: فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۵۶﴾ پس جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے وہ نعمت کے باغوں میں ہوں گے۔

اللہ کریم اس دن جو فیصلے فرمائیں گے وہ بالکل صحیح اور درست ہوں گے کہ جن لوگوں نے نورِ ایمان حاصل کیا، یقین کی دولت حاصل کی اور اس ایمان سے اُن کے اعمال صالح ہو گئے۔ اُن کی عملی زندگی سدھر گئی، وہ اللہ کی نعمتوں میں، جنت کے باغوں اور جنت کی نعمتوں میں ہوں گے۔

اور، وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿٥٧﴾ جن لوگوں نے کفر کیا ہوگا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہوگا تو ان کے لیے ذلت کا عذاب ہوگا۔

جن لوگوں نے نافرمانی کی، کفر اور انکار کیا، یہ کفر اور انکار کیا ہے؟ وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۔۔۔ میرے احکام کی تکذیب کی، فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿٥٧﴾ ان کے لیے ذلت کا عذاب ہوگا۔

تکذیب بھی دو طرح سے ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ اعلان کر دیتا ہے کہ میں مانتا ہی نہیں، یہ بھی کفر ہے۔ ایک انداز یہ ہے کہ انسان ماننے کا اقرار تو کرتا ہے لیکن عمل نہیں کرتا۔ یہ انداز زیادہ خطرناک ہے اور پہلے انداز سے تو شاید کبھی توبہ نصیب ہو سکتی ہے، اس دوسرے انداز سے تو کوئی توبہ بھی نہیں کرتا کیونکہ اسے مسلمانی سمجھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ جن لوگوں نے اللہ کے احکامات کی تکذیب کی اُن کے لیے ذلت کا عذاب ہوگا، جو نہ صرف تباہ کر دینے والا ہوگا بلکہ رسوا بھی کرے گا۔

اللہ کریم صحیح شعور عطا فرمائیں ایمان نصیب فرمائیں اور ایسا مضبوط ایمان ہو جس پر توفیقِ عمل نصیب ہو اور اپنی اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ناشکری سے اپنی پناہ میں رکھیں۔

سورۃ الحج رکوع 8 آیات 58 تا 64

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ
رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۵۸﴾ لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا
يَّرْضَوْنَهٗ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿۵۹﴾ ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا
عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ﴿۶۰﴾ ذٰلِكَ
بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ
بَصِيْرٌ ﴿۶۱﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ
وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿۶۲﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ
مَآءً ۡ فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ﴿۶۳﴾ لَهٗ مَا فِي
السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۶۴﴾

اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں اپنا وطن چھوڑا پھر وہ (کفر کے مقابل) قتل کیے
گئے یا مر گئے تو ان کو اللہ ضرور بہترین روزی دیں گے اور بے شک اللہ سب سے بہتر
رزق دینے والے ہیں ﴿۵۸﴾ وہ (اللہ) ان کو ضرور ایسی جگہ داخل فرمائیں گے
جس کو وہ (بہت ہی) پسند کریں گے اور بے شک اللہ جاننے والے نہایت بردبار
ہیں ﴿۵۹﴾ یہ بات ہو چکی اور جو شخص (دشمن کو) اتنی ہی ایذا دے جتنی ایذا اس کو
دی گئی پھر اس پر زیادتی کی جائے تو اللہ کی ضرور مدد فرمائیں گے بے شک اللہ
بڑے معاف کرنے والے بخشنے والے ہیں ﴿۶۰﴾ یہ اس لیے کہ اللہ رات
(کے اوقات) کو دن میں داخل فرما دیتے ہیں اور دن کو رات میں داخل فرماتے

ہیں۔ اور یہ کہ اللہ خوب سننے والے، دیکھنے والے ہیں ﴿۶۱﴾ یہ (نصرت) اس لیے کہ اللہ ہی برحق ہیں اور یہ کہ جس چیز کو یہ (کافر) اس (اللہ) کے سوا پکارتے ہیں وہ باطل ہے اور یہ کہ اللہ ہی عالی شان (اور) سب سے بڑے ہیں ﴿۶۲﴾ کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا پھر (جس سے) زمین سرسبز ہوگئی بے شک اللہ باریک بین خبر رکھنے والے ہیں ﴿۶۳﴾ اُسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور بے شک اللہ ہی بے نیاز، قابلِ ستائش ہیں ﴿۶۴﴾

تفسیر و معارف

ہجرت کیا ہے؟

فرمایا: وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔۔۔ اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں اپنا وطن چھوڑا

انسان اللہ کی بہترین مخلوق ہے، اشرف المخلوقات ہے۔ انسان جب دنیا میں رہتا ہے تو دنیوی ضرورتوں کے ساتھ رہتا ہے جن کی تکمیل کے لیے اُسے دنیوی مال واسباب کی بھی ضرورت ہے۔ انسان چونکہ اللہ کی بہترین تخلیق ہے لہٰذا اللہ کریم نے اس کے جینے کے، رہنے سہنے کے، کمانے کھانے کے کچھ اصول اور ضابطے بنا دیے۔ وہ باقی جانداروں کی طرح نہیں ہے کہ جہاں جو مل گیا کھالیا جہاں پڑ گئے، سو گئے۔ خالقِ کائنات نے، انسان کے خالق نے جس نے اسے شرفِ انسانیت بخشا، انسانی عظمت عطا کی، اسی نے اس کے لیے ضابطے بھی مقرر فرمائے۔ انہی ضابطوں کا نام دین ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہ ضابطے روزمرہ کی ضروریات سے الگ نہیں ہیں بلکہ انہی میں معیار مقرر کر دیا گیا۔ یہ ضابطہ عطا کیا کہ دولت جائز ذرائع سے کمائی جائے نہ کسی سے دھوکا کیا جائے نہ چھینی جائے اور نہ چوری کی جائے۔ جتنی حیثیت کسی کی ہو وہ اس کے مطابق گزر بسر کرے، اچھا لباس پہنے، اچھا کھانے کھائے اچھا گھر بنائے لیکن یہ سب کچھ جائز وسائل سے کرے۔ معاشرے کی پاکیزگی کے لیے شادی کرے، گھر بسائے اولاد کی پرورش اور تربیت کرے انہیں تعلیم سے آراستہ کرے۔ یہ ساری چیزیں ایک معیار اور ایک ضابطے میں ڈھال کرا سے دی گئی ہیں۔ اس سب کی پابندی وہ کیوں کرے گا؟ اس کی ایک بنیادی وجہ ہے کہ اسے اپنے مالک کی معرفت کی استعداد بھی دی گئی ہے۔ انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک کو اپنی حیثیت کے مطابق پہچانے اور اس کی عظمت کے مطابق اس کی اطاعت کرے۔ اعمال و کردار کی بنیاد عقیدہ ہے جب عقیدے میں کمزوری آتی ہے،

یقین میں کمزوری آتی ہے تو وہ اعمال کو متاثر کرتی ہے اور اعمال میں بگاڑ آنا شروع ہو جاتا ہے۔ ضابطے چھوٹنے لگتے ہیں۔ عقیدے کے بعد عبادات کا درجہ ہے اور عبادات کا حاصل یہ ہے کہ ہر بار اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اپنے یقین کو مزید تازہ کرے، اسے مزید تازگی بخشے اور اس کا ایمان مزید مضبوط ہو، اس میں کمزوری نہ آئے۔ جب ایمان مضبوط ہوتا ہے اور دنیا میں ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ دینی عقائد و نظریات اور اعمال پر اس معاشرے میں عمل کرنا مشکل ہو جاتا ہے تو پھر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ معاشرہ چھوڑ دیا جائے لیکن اپنا کردار تبدیل نہ کیا جائے۔ جس کا یقین محکم اور ایمان مضبوط ہوتا ہے وہ بے دین معاشرے کو چھوڑ دیتے ہیں اپنے کردار کو نہیں بدلتے اور اسی عمل کو اللہ کریم نے ہجرت فرمایا ہے۔ فرمایا: وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔۔۔ فرمایا، کیسے عجیب لوگ تھے کہ جب اللہ کے دیے ہوئے اصول وضوابط کے مطابق اس معاشرے میں زندگی گزارنا دشوار ہو گیا تو انہوں نے اصول نہیں چھوڑے بلکہ وہ معاشرہ چھوڑ دیا۔ انہوں نے وہ شہر چھوڑ دیا، اپنے گھر چھوڑ دیے، جائیدادیں چھوڑ دیں، مال ومنال چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ رشتہ دار، دوست احباب بھی چھوڑ دیے لیکن اللہ کے بنائے ہوئے ضابطوں کو چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ یہ اُن کے ایمان اور یقین کا کمال تھا۔

ہجرت پر بہترین انعامات:

ایسا بھی نہیں ہوا کہ یہ لوگ اس معاشرے کو ترک کر کے کہیں آرام کی زندگی بسر کرنے لگ گئے بلکہ کفر نے اُن کا تعاقب کیا۔ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا۔۔۔ پھر وہ (کفر کے مقابل) قتل کیے گئے یا مر گئے۔ کفار ومشرکین نے اُن کے پیچھے جا کر اُن پر حملے کیے اور اُن کی جانیں لیں۔ کچھ ایسے بھی تھے جن کا وقت پورا ہو گیا اور یوں اپنے گھروں جائیدادوں اور رشتہ داروں سے دور پردیس میں انہیں موت آ گئی۔ ان لوگوں نے ایمان پر استقامت دکھائی اور اپنی دنیا کو قربان کر دیا، گھر بار رشتے ناتے سب کچھ چھوڑ دیا پھر بھی اُن پر جنگیں مسلط کی گئیں۔ انہوں نے جہاد کیے، مقابلہ کیا شہید ہوئے یا طبعی موت سے ہمکنار ہوئے تو بظاہر دنیوی اعتبار سے تو یہ نظر آتا ہے کہ وہ خسارے میں رہے کہ اُن کے پاس تو کچھ نہ بچا۔ فرمایا، نہیں ایسی بات نہیں ہے بلکہ، لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا۔۔۔ ان کو اللہ ضرور بہترین روزی دیں گے، اللہ انہیں اعلیٰ اور بے پناہ رزق عطا کریں گے۔ دنیا کے رزق کا کیا ہے وہ تو جتنا کسی کے نصیب میں ہے اتنا ہی کھا سکتا ہے۔ دنیا کی مال ودولت اگر بے پناہ بھی نصیب ہو جائے، وہ کھربوں کا مالک ہو جائے تو کیا مرنے پر ایک پائی بھی اس کے پاس رہ جاتی ہے؟ وہ عالیشان مکان، اور شاندار محل جو آسائش کے لیے بنائے گیا ان میں سدا رہ سکے؟ جائیدادیں، جاگیریں کیا کسی کے ساتھ جاتی ہیں؟ نہیں بلکہ دم نکلتے ہی سارا مال ورثا کا ہو جاتا ہے

ان کی تو ملکیت بھی نہیں رہتی۔ دم نکلتے ہی ساری جائیداد ساری دولت دوسروں کی ہو جاتی ہے اور آخرت میں بھی کسی دکھ کا مداوا نہیں بنتی بلکہ یہ سب سے بڑا دکھ دیتی ہے۔ جب موت قریب آتی ہے اور آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں تو ایسے شخص کو دکھ ہوتا ہے کہ اس کی دنیوی متاع اس کے ہاتھ سے نکل رہی ہے۔ جو لوگ ایمان ویقین پر قائم رہے اور اس راہ میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا اللہ کریم انہیں وہ رزق عطا فرمائیں گے جس میں حسن ہی حسن ہوگا۔ جسے کھا کر کسی کو کوئی بیماری نہیں ہوتی جس سے کوئی خرابی نہیں ہوتی اور نہ ہی فضلہ بنتا ہے۔ جبکہ دنیا میں جو رزق ملتا ہے اس کے کھانے سے بیمار بھی پڑ سکتے ہیں، مر بھی سکتے ہیں اور اگر صحتمند بھی رہیں تو اسی سے جہاں وجود پرورش پاتا ہے، خون بنتا ہے وہاں اسی سے فضلہ اور غلاظتیں بھی بنتی ہیں۔

اللہ کریم ہجرت کرنے والوں سے رزق حسنہ کا وعدہ فرما رہے ہیں کہ کوئی یہ نہ سوچے کہ وہ لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر دنیا سے چلے گئے شاید خوار ہو گئے۔ ہرگز نہیں حقیقی زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔ موت زندگی کا خاتمہ نہیں ہے بلکہ صرف اس فانی زندگی کا خاتمہ ہے اور ایک دائمی زندگی کی ابتدا ہے۔ دنیا کا رزق اس فانی حیات کے لیے ہے اور وہاں کا رزق اُن لوگوں کو نصیب ہوگا جنہوں نے آخرت کے لیے، حصولِ آخرت کے لیے قربانیاں دیں۔ قرآنِ کریم کے مثالی مسلمان صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین ہیں۔ کیا خوش نصیب لوگ تھے! عرب کے جس معاشرے سے اُن کا تعلق تھا اس میں تو ایک ایک لقمے پر قتل کیے جاتے تھے، پیسے کی پوجا کی جاتی اور پیسہ پیسہ جمع کرنے میں مگن رہتے لیکن یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جب انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا دامنِ رحمت تھام لیا تو پھر اس مضبوطی سے تھاما کہ پھر ایسے ہو گئے کہ کائنات چھوٹتی ہے تو چھوٹ جائے لیکن دامانِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلّم نہیں چھوڑا۔ بڑی محنت سے جو جائیدادیں بنائی تھیں، چھوڑ دیں، گھر چھوڑ دیے، رشتے ناتے توڑ دیے، دوست احباب چھوڑ دیے، وطن چھوڑ دیا لیکن دامانِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلّم نہیں چھوڑا۔ وہاں بھی دشمن نے دفاعی جنگ پر مجبور کیا تو شمشیر بکف مقابلے پر آ گئے، جانیں دیں شہید ہوئے اور دائمی حیات پا گئے۔ فرمایا، وہاں اللہ کریم انہیں بہت خوبصورت رزق عطا فرمائیں گے۔ رِزْقًا حَسَنًا۔۔۔ ایسی روزی جس میں ہر طرف سے خوبصورت اور حُسن ہے، بھلائی ہے۔ اس میں کوئی کمزوری، خامی یا خرابی نہیں ہے کہ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ﴿۵۸﴾ اور یقیناً اللہ ہی بہترین رزق دینے والے ہیں۔ یہ عنایات صرف برزخ تک ہی نہیں کہ صرف برزخ کے رزق پر ہی اکتفا ہے۔ برزخ پردے کو کہتے ہیں کہ ایک پردہ ہے جو آخرت اور دنیا کے درمیان ہے۔ موت سے قیامِ قیامت تک کا درمیانی وقفہ، برزخ میں ہے۔ روزِ اوّل سے آج تک جتنے لوگ دنیا سے گزرے ہیں وہ اسی برزخ میں مقیم ہیں۔ قیامت کے دن سب میدانِ حشر میں حاضر

ہوں گے اور پھر جنت یا جہنم کا فیصلہ ہوگا۔ اللہ نے اپنے ان بندوں کے لیے برزخ میں تو رزق کا انتظام کر دیا ہے اور انہیں بہترین رزق عطا فرما دیا ہے لیکن اس پر بس نہیں کیا۔ اللہ بہترین رزق دینے والے ہیں۔ سب سے اعلیٰ بے مثل و بے مثال رزق دینے والے ہیں چنانچہ لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ۔۔۔ اللہ ان کو ضرور ایسی جگہ داخل فرمائیں گے جس کو وہ بہت پسند کریں گے یعنی اللہ کریم انہیں ایسے گھروں میں داخل فرمائیں گے جن میں داخل ہونے پر یہ لوگ بہت خوش ہوں گے، بہت راضی ہوں گے۔ اُن کی ساری تھکان اتر جائے گی اور گھر قربان کرنے کا صلہ مل جائے گا۔ انہوں نے تو دنیا کے فانی، عارضی کچے مکان قربان کیے تھے وہاں انہیں دائمی، ابدی اور بہترین گھر اللہ کی جنت میں مل جائیں گے۔ اللہ کریم اُن کو ایسی جگہ میں داخل فرمائیں گے جسے وہ بہت ہی زیادہ پسند کریں گے اور خوش ہوں گے۔

اللہ کریم کی شانِ حلیمی:

فرمایا: وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿٥٩﴾ اور بے شک اللہ کریم جاننے والے نہایت بردبار ہیں۔

اللہ کریم ہر چیز کو ہر وقت جانتے ہیں لیکن وہ بے حد حلیم ہیں، بے حد بردبار ہیں۔ وہ انسانوں سے درگزر فرماتے رہتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر گرفت نہیں فرماتے۔ انسان توبہ کرے تو اس کی خطائیں معاف فرما دیتے ہیں۔ آج اگر مخلوق کا کردار دیکھا جائے اور پھر اگر بحیثیت مسلمان ہم اپنا کردار دیکھیں تو عجیب تر ہے کیونکہ ہم نے ان لوگوں کا کردار اپنا لیا ہے جو دین کا انکار کر کے کافر ٹھہرے ہیں۔

یہ اللہ کریم کا حِلم ہے کہ سب کو برداشت کر رہا ہے۔ سب مخلوق کو روزی دے رہا ہے، مہلت دے رکھی ہے اور دین کی آواز سب تک پہنچا رہا ہے۔ ہر فرد تک دعوتِ حق پہنچ رہی ہے پھر جو قبول کر لے اس کی بخشش فرما دیتا ہے، معاف فرما دیتا ہے۔ اللہ ہر چیز کو، ہر بات کو جانتا ہے لیکن وہ درگزر فرماتا رہتا ہے برداشت کرتا رہتا ہے اس لیے کہ اس کی شانِ حلیمی بھی اس کی ذات کی طرح بے مثل ہے بے مثال ہے۔ فرمایا ذٰلِكَ ۔۔۔ یہ باتیں طے ہو چکی ہیں اور تاریخِ انسانی پر نظر ڈالی جائے تو دیکھا جا سکتا ہے کہ اللہ کریم درگزر فرماتے رہتے ہیں۔ اب اگر کوئی زبردستی ہاتھ چھڑا کر آگ میں گرنا چاہے تو اس کی اپنی مرضی۔

ایک طے شدہ نظام:

فرمایا: ذٰلِكَ ۔۔۔ یہ باتیں طے ہو چکیں کہ برائی اللہ کی ناراضی کا سبب بن کر جہنم میں لے جائے گی اور نیکی اللہ کی رضا کا سبب بن کر جنت میں لے جائے گی۔ یہ طے ہو چکا، اب کسی کے لیے اسے بدلا نہیں جائے گا۔ یہ نہیں ہو

سکتا کہ کوئی برائی کر کے جنت میں چلا جائے یا نیکی کر کے جہنم میں چلا جائے۔ یہ طے شدہ بات ہے، اگر دیکھا جائے تو دین کے مطابق زندگی گزارنا آسان ہے۔ سچ بولنا آسان ہے، دیانت داری سے کام کرنا آسان ہے۔ اللہ کی بارگاہ میں فرائض وعبادات پورے کرنا آسان ہے جبکہ دوزخ میں لے جانے والے سارے ہی کام مشکل ہیں۔ چوری، بدکاری، جھوٹ، دھوکا، چھینا جھپٹی سب مشکل کام ہیں۔ بتوں کی پوجا مشکل ترین کام ہے۔ انسان ایک بے جان پتھر کے آگے سجدے کرے یا انسان جانوروں کے سامنے سجدے کرے تو انسانیت کی تذلیل ہے۔ جہنم کا راستہ انتہائی مشکل ہے اور لوگ بہت مشقت کر کے وہاں پہنچتے ہیں، بڑا زور لگا کر اور محنت کر کے جہنم جاتے ہیں جبکہ جنت کا راستہ بڑا آسان ہے۔ یہ باتیں پہلے طے ہو چکیں۔ انسان کو مکلف بنایا اور اسے عقل وشعور عطا کیا۔ اس کے سامنے نیکی اور بدی کھول کر رکھ دی جیسا کہ ارشاد باری ہے: اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (الدھر:3) اسے توفیقِ عمل عطا کر دی۔ اب اس توفیق کو وہ نیکی پر خرچ کرتا ہے یا برائی پر اس کا فیصلہ اُسے کرنے کا اختیار دیا گیا ہے اور اس کا جواب اُسے دینا پڑے گا۔ فرمایا: وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ۔۔۔ اور جو شخص (دشمن کو) ایذا دے تو اتنی ہی دے جتنی اس کو دی گئی۔ واللہ اعلم

یعنی زیادتی کرنے والے کو اتنی سزا دی جا سکتی ہے جتنی اس نے زیادتی کی۔ کیسا خوبصورت دین ہے اور کیسے خوبصورت نظریات ہیں، کفار ومشرکین نے اگر اللہ کے بندوں کے ساتھ زیادتی کی تو انہیں بھی حق ہے کہ جتنی زیادتی اُنہوں نے کی یہ بھی اتنی ہی کر سکتے ہیں اس سے زیادہ نہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین نے تو اُتنی بھی نہیں کی۔ مشرکینِ مکہ نے مکی دور میں مسلمانوں پر کتنے مظالم ڈھائے انہیں گھروں سے نکالا اور پھر مکہ سے مدینہ پر حملہ آور ہوتے رہے، بدر میں صحابہ کرامؓ کو شہید کیا، اُحد میں ستر صحابہؓ کو شہید کیا لیکن اس کے باوجود جب مکہ فتح ہوا تو صحابہ کرامؓ نے کسی کو گھر سے نہیں نکالا حالانکہ یہ نکال سکتے تھے، انہیں حق تھا لیکن انہوں نے درگزر کر دیا۔ فتح مکہ کے موقع پر کسی کو نہ گھر سے نکالا گیا نہ بدلے میں قتل کیا گیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۔۔۔ (یوسف:92) آج تم پر کوئی عتاب اور ملامت نہیں اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ جاؤ تم سب آزاد ہو۔ (زاد المعاد وسیرہ ابنِ ہشام وزرقانی) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو معاف کر دیا۔

جنگ اور جہاد میں فرق:

یہ فرق ہے جنگ اور جہاد میں جو یہاں واضح کر دیا گیا۔ جہاد ہوتا ہے اپنی ذات اپنے حقوق اور اپنے

نظریات کے تحفظ کے لیے، ان کے دفاع کے لیے۔ اگر کوئی آپ کے حقوق میں مداخلت کرتا ہے، نظریات میں مداخلت کرتا ہے تو اس کے لیے جہاد کیا جاتا ہے۔ جنگ دشمن کو کمزور کرنے کے لیے ہوتی ہے کہ اُسے معاشی اور اخلاقی طور پر تباہ کر دیا جائے، اُسے ایسا تباہ کیا جائے کہ وہ دوبارہ سر نہ اٹھا سکے۔ فرمایا، اسلام میں جنگ نہیں ہے، جہاد ہے۔ جتنی کسی نے زیادتی کی ہے اتنی سزا اسے دی جائے، زیادہ نہیں۔ جنگ میں کیوں اس شدت سے دشمن کو تباہ کیا جاتا ہے، اس لیے کہ حملہ کرنے والے کو یہ خطرہ رہتا ہے کہ یہ پھر سر اٹھائیں گے پھر بغاوت کر دیں گے۔ فرمایا: ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ۔۔۔ اگر یہ پھر بغاوت کر دیں تو اللہ مومنوں کی مدد کے لیے موجود ہے۔ جس نے پہلے مدد کی وہ پھر مدد کرے گا۔ یعنی جہاد دشمن کو بھی تباہ نہیں کرتا اس کے حقوق پامال نہیں کرتا، اس کی آبرو، اس کا مال نہیں لوٹتا بلکہ دشمن کو بھی سدھرنے کا موقع دیتا ہے، سنبھلنے کا موقع دیتا ہے۔ جنگ دشمن کو تباہ کرنے کے لیے ہوتی ہے تاکہ آئندہ کبھی اس سے خطرہ نہ رہے۔ جہاد میں نصرف الٰہیہ ساتھ ہوتی ہے اور اللہ کریم فرماتے ہیں کہ اگر برائی کی طاقت پھر بغاوت کرے گی، پھر حملہ آور ہوگی تو اللہ کریم مومنوں کی مدد کر دیں گے۔ جس نے پہلے فتح دی پھر فتح دیں گے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ﴿٦٠﴾ یقیناً اللہ بڑے معاف کرنے والے اور بخشنے والے ہیں۔ اتنے کریم ہیں کہ اگر کوئی شخص جو زندگی بھر کفر اور شرک کرتا رہا وہ بھی خلوص سے توبہ کرلے تو ساری زندگی کی لغزشیں معاف کر دیتے ہیں۔ جو برائی پر جمے ہوئے ہیں، عقیدے کی خرابی پر جمے ہوئے ہیں، کردار کی خرابی پر جمے ہوئے ہیں وہ کیوں نہیں سوچتے اور اللہ سے معافی نہیں مانگتے؟ وہ کیوں حق اختیار نہیں کرتے جبکہ اللہ کی بخشش ہمہ وقت موجود ہے۔

شب و روز کا نظام:

فرمایا: ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ۔۔۔ یہ اس لیے کہ اللہ رات (کے اوقات) کو دن میں داخل فرما دیتے ہیں اور دن کو رات میں داخل فرماتے ہیں۔ فرمایا نظامِ کائنات کو دیکھو کس تسلسل سے رات اور دن آ جا رہے ہیں۔ ایک وقت آتا ہے کہ دن کے اوقات کو کاٹ کر رات میں ملانا شروع کر دیتا ہے، رات بڑھنے لگتی ہے اور دن کم ہونے لگتا ہے۔ پھر وقت آتا ہے کہ دن بڑھنے لگتا ہے رات کم ہونے لگتی ہے۔ یقیناً وہ اللہ ہے جس نے یہ کائنات بنائی ہے۔ جو اس نظام کا خالق اور مالک ہے اس نے اسے ایسا بنا دیا ہے کہ رات بڑھنے لگتی ہے اور دن رات میں شامل ہونے لگ جاتا ہے۔ پھر دن بڑھنے لگ جاتا ہے اور رات کم ہونے لگ جاتی ہے۔ کیا کوئی اس نظام میں مداخلت کر سکتا ہے؟ آج تک کوئی اس کو روک سکا ہے، یا تبدیل کر سکا ہے؟ آج تک کوئی اس کے اوقات میں مداخلت کر سکا ہے؟ یہ تو ایک مثال ہے جو ہر بندے کے سامنے ہے۔ اسی طرح قدرتِ باری کے نظام اٹل

حقیقت ہیں جن میں مخلوق ہرگز مداخلت نہیں کرسکتی خواہ کسی کے پاس کتنی طاقت آجائے، حکومت و اختیارات آ جائیں۔ جو نظام اللہ نے بنایا ہے جیسے بنایا ہے ویسے ہی چلتا ہے اور چلتا رہے گا۔ اسی ایک بات سے عظمتِ الٰہی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

نظامِ کائنات اللہ کے حکم پر چلتا ہے:

یہ نظامِ شب و روز کا تسلسل اور کسی کا اس میں مدخل نہ ہوسکنا اس بات کی دلیل ہے کہ احکامِ الٰہی میں، نظامِ الٰہی میں شاہ ہو یا گدا۔ کوئی مداخلت نہیں کرسکتا۔ نظامِ کائنات اللہ کے بنائے ہوئے طریقوں پر چلتا ہے۔ جو لوگ اللہ کا در چھوڑ کر دوسروں سے امیدیں وابستہ کر لیتے ہیں وہ اللہ کے نظام میں کچھ دخل نہیں دے سکتے۔ وَاَنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌۢ بَصِیۡرٌ ﴿۶۱﴾ اللہ خوب سننے والے، دیکھنے والے ہیں۔ یقیناً اللہ کریم ہر بات، ہر آواز کو سنتے ہیں اور ہر شے کو ذاتی طور پر دیکھتے ہیں۔ ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ ہُوَ الۡحَقُّ وَاَنَّ مَا یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖ ہُوَ الۡبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰہَ ہُوَ الۡعَلِیُّ الۡکَبِیۡرُ ﴿۶۲﴾ یہ (نصرت) اس لیے کہ اللہ ہی برحق ہیں اور یہ کہ جس چیز کو یہ (کافر) اس (اللہ) کے سوا پکارتے ہیں وہ باطل ہے اور یہ کہ اللہ ہی عالی شان (اور) سب سے بڑے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نظامِ کائنات پر اس مالکِ حقیقی کا حکم چلتا ہے اور کسی دوسرے کو اس میں مداخلت کی اجازت نہیں ہے۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ بِاَنَّ اللّٰہَ ہُوَ الۡحَقُّ ۔۔۔ اللہ حق ہے سو اللہ کو مانو، اللہ کو پکارو۔ اللہ کی عبادت کرو۔ اللہ ہی سے مدد مانگو جو ضرورت ہے اس کی بارگاہ میں پیش کرو۔ اللہ کو ویسا مانو جیسا اس کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم منواتا ہے اس لیے کہ وہی حق ہے۔ وَاَنَّ مَا یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖ ۔۔۔ اور اللہ کو چھوڑ کر جن سے تم امیدیں وابستہ کرتے ہو ہُوَ الۡبَاطِلُ ۔۔۔ وہ سب باطل ہیں۔ سو اپنی امیدیں اس ذاتِ بے ہمتا سے وابستہ کرلو۔

اب خرابی کہاں پیدا ہوتی ہے اور ایمان میں کمی کیسے واقع ہوتی ہے؟ جب ہم عظمتِ الٰہی سے بھٹک کر غیر اللہ سے امیدیں باندھ لیتے ہیں کہ فلاں مجھے دولت دے گا، فلاں مجھے صحت دے گا، فلاں میری مرادیں پوری کرے گا۔ فرمایا کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔ یہ سب اللہ کے اپنے کام ہیں اور اللہ کے علاوہ جن سے بھی امیدیں وابستہ کی جائیں وہ باطل ہیں۔ تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے توحید کی تائید کی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت تک آنے والے انسانوں کو خالص توحید کی تاکید فرمائی اور اللہ کا تعارف بھی عطا فرمایا۔ اللہ کریم کی ذات اور صفات کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آگاہ فرمایا اور اللہ کا کلام بھی ہمیں عطا فرمایا۔ قرآنِ کریم فرماتا ہے: وَمَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡہَوٰی ﴿۳﴾ اِنۡ ہُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی ﴿۴﴾ (النجم: 4) اور (آپ صلی اللہ علیہ وسلم) نہ خواہشِ نفس سے منہ سے بات

نکالتے ہیں ان کا ارشاد تو وحی ہے جو ان کی طرف بھیجی جاتی ہے اور یہ بھی کہ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النسآ:80) جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی بات مانی اس نے اللہ کی بات مانی کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم اللہ کی وحی کے بغیر کچھ ارشاد نہیں فرماتے۔ اللہ کے نیک بندے وہ ہوتے ہیں جو اللہ کی طرف بلاتے ہیں۔ جو بندہ اپنی خدائی کا دعویدار بن بیٹھے اور لوگوں کو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی راہ کی بجائے اپنی طرف بلانا شروع کر دے وہ باطل ہے۔ لوگوں کو بھی پہچاننا چاہیے کہ جو شخص انہیں دعوت دے رہا ہے کیا وہ انہیں عظمتِ الٰہی کی طرف بلا رہا ہے یا نام اللہ کا لے کر اپنی بڑائی کی طرف بلا رہا ہے کہ میرے ساتھ آ ؤ گے تو بہت کچھ پالو گے، میری اطاعت کرو گے تو یہ مل جائے گا وغیرہ۔ هُوَ الْبَاطِلُ ۔۔۔ یہ سب باطل ہے اور وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿٦٢﴾ اللہ ہی عالی شان سب سے بڑے ہیں۔ اللہ کی شان سب سے عالی ہے، سب سے بڑا، اُس جیسا کوئی دوسرا نہیں۔ اکیلا سب سے بڑا۔ کوئی اس کی عظمت کا احاطہ نہیں کر سکتا نہ ہی وہاں تک رسائی رکھتا ہے وہ سب سے بڑا ہے کہ کوئی اس کی بڑائی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس کی قدرت کے مظاہر تو ہر سو ہیں فرمایا: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۔۔۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا۔ وہ کون ہے جو ٹنوں کے حساب سے پانی سینۂ سمندر سے اٹھا کر ہوا میں معلق کر دیتا ہے؟ ہوا نے اتنا پانی اٹھا رکھا ہوتا ہے کہ جب وہ برستا ہے تو زمین سے سنبھالا نہیں جاتا اور سیلاب آجاتے ہیں۔ فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً ۔۔۔ اس سے زمین سرسبز ہونے لگتی ہے۔ وہ زمین کے ہر ذرّے میں سے ہریالی اُگا دیتا ہے۔ کوئی گن نہیں سکتا کہ گھاس کے کتنے تنکے پیدا ہوئے کتنے پھول اُگے اور کتنی رونق بنی کہ مخملی فرش بچھ جاتے ہیں جنگلوں میں پہاڑوں اور میدانوں میں صحراؤں میں۔ آخر کون یہ سب پیدا کرتا ہے؟ کوئی ہے جو اس میں شریک ہے؟ ہرگز نہیں کہ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ﴿٦٣﴾ بے شک اللہ باریک بین خبر رکھنے والا ہے۔ اس قدر باریک نظام کائنات اس نے جوڑا ہے کہ آج کی بڑی سے بڑی خوردبینیں تھک گئی ہیں اور ان حقائق تک نہیں پہنچ پاتیں۔ ایک انسانی وجود میں دس کھرب سیل (Cell) ہیں۔ اگر اس کا دس کھربواں حصہ الگ کرو تو نظر ہی نہیں آتا، خوردبین میں بھی نظر نہیں آتا۔ یہ جو بلند و بالا پہاڑ نظر آتے ہیں ان میں انتہائی چھوٹے چھوٹے ایٹم ہیں جن کو جوڑ کر انہیں بنایا گیا ہے۔ جو گھاس کا تنکا ہم دیکھتے ہیں اس کے بھی کھربوں چھوٹے چھوٹے حصے ہیں۔ ان چھوٹے چھوٹے سیلوں کو جوڑ کر اللہ نے تنکا بنایا ہے وہ بڑا لطیف باریک بین ہے۔ ہر چیز کو اس نے نہایت باریک اور چھوٹے چھوٹے ذرّات جوڑ کر بنایا ہے۔ وہ خبیر بھی ہے اور باریک بین بھی۔ ہر چیز سے باخبر ہے۔ اس کی قدرت کاملہ کا مظہر یہ نظام کائنات ہے جس میں ایک ایک ذرّہ جوڑا گیا۔ مثلاً ایک ایک ذرّہ جڑ کر تنکا بنا، ان میں سے الگ ذرّے نکلے جن سے تنا بنا پھر الگ ذرّے نکلے جن سے

پتے بنے اور الگ ذرّے نکلے جن سے سِٹا بنا۔ اُن ذرّات کو الگ کیا گیا جن سے دانہ بنا اور یہ ساری تقسیم اسی تنکے کے اندر ہو رہی ہے۔ اللہ لطیف ہے، باریک بین ہے، ہر چیز کو اس نے نہایت باریکی سے جوڑا ہے۔ اس نے ساری زمین کو سرسبز کر دیا، بے شمار تنکے پیدا ہوئے۔ ہر تنکا گُل بکف، ہر گُل کے اجزا الگ، رنگ و خوشبو الگ ہے، تاثیر الگ ہے۔ یقیناً اللہ بہت باریک بین بہت باخبر ہیں۔

زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے:

فرمایا: لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ۔۔۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ بالائے آسمان جو کچھ ہے وہ بھی اسی کا ہے۔ زمین پر جو ہے وہ سب اللہ کا ہی ہے۔ انسان جھوٹ بولتے ہیں کہ یہ میرا ہے، یہ گھر میرا ہے، یہ دولت میری ہے، یہ شہر میرا ہے، یہ ملک میرا ہے۔ کچھ بھی تو اس کا نہیں ہے۔ سانس نکلے گا تو سب چیزیں رہ جائیں گی، قبر کے گڑھے میں اتار دیں گے تو کیا رہے گا اس کے پاس؟ سب کچھ اللہ ہی کا ہے۔ انسان تو چندے یہاں آیا ہے اور یہ ساری نشانیاں بتا کر اسے ہدایت کی طرف بلایا گیا ہے۔ اُسے دعوت دی گئی ہے کہ اللہ کی عظمت کا اقرار کرلے۔ اللہ نے انسانوں کی طرف اپنے انبیاؑ اور رسلؑ بھیجے تاکہ اُن تک اللہ کی بات پہنچائیں تاکہ وہ اللہ کے دین کو قبول کریں اور اللہ کی اطاعت کریں۔ انسانیت کے لیے یہ انتہائی شرف ہے کہ اللہ کے نبیؑ اور رسلؑ آدم علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ خود آدم علیہ السلام کو یہ شرف بخشا۔ اللہ کی بات صرف انبیاؑ سنتے ہیں۔ وحیٔ الٰہی کو انبیاؑ اور رُسُل قبول کرتے ہیں جو اُن پر نازل ہوتی ہے اور پھر وہ اللہ کے پیغام کو عام انسانوں تک پہنچا دیتے ہیں۔

اسی طرح اللہ کریم نے انسان کو یہ شرف بھی بخشا ہے کہ اس کی طرف اپنا پیغام بھیج دیا۔ قرآن کریم ہر بندے کی طرف اللہ کا پیغام ہے۔ یہ صرف علما یا مولویوں کے لیے نہیں ہے۔ یہ صرف بزرگوں اور پیروں کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ صرف مسلمانوں کے لیے بھی نہیں ہے۔ یہ کافروں کو بھی دعوتِ حق دیتا ہے۔ یہ ہر ایک سے مخاطب ہے، یہ انسانیت کے لیے ہے۔ ابھی جو آیات گزری ہیں اُن میں کافروں سے ہی بات چل رہی تھی کہ کیوں بھولے ہوئے ہو، کیوں غلط راستے پر جا رہے ہو۔ یہ دلائل بھی کافروں کو دیے جا رہے ہیں کہ دن رات کا گھٹنا بڑھنا دیکھو اور کسی بت کو جسے اللہ کا شریک سمجھتے ہو اس سے کہو کہ اس نظام میں مداخلت کر کے دکھا دے۔ اس نظام کو روک کے یا بدل کر دکھا دے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود سے کہا تھا کہ میرا مالک وہ ہے جو سورج کو مشرق سے طلوع کرتا ہے اگر تُو خدا ہونے کا دعویدار ہے تو نظام کو بدل دے، سورج کو مغرب سے نکال

دے۔ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ۔۔۔(البقرہ:258) اس پر وہ بوکھلا گیا کہ وہ تو اس کو نہیں بدل سکتا۔ اللہ اتنے کریم ہیں کہ اس کی ادنیٰ اور ہر لحظہ محتاج مخلوق اس سے گستاخی اور سرکشی کرتی ہے لیکن وہ گرفت نہیں فرماتا بلکہ اُن کے لیے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی معرفت اپنا پیغام بھیجتا ہے۔ رک جاؤ، باز آ جاؤ، تمہاری حیثیت کیا ہے، تم کیا چاہتے ہو؟ تم کچھ نہیں کر سکتے۔ جو کچھ ارض و سماء میں ہے سب اسی کا ہے وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ﴿۶۴﴾ بے شک اللہ ہی بے نیاز، قابلِ ستائش ہیں۔

اللہ کریم مستغنی ہیں، کسی کے محتاج نہیں اور وہی تعریف کے مستحق ہیں۔ اللہ کریم کے علاوہ کوئی خود کو مستغنی نہیں کہہ سکتا کہ اپنی تخلیق، اپنے وجود کے ہر ذرّے میں اللہ کا محتاج ہے۔ اللہ کی عظمت ایسی ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہیں ہے۔ یہ ساری کائنات اس کی ملکیت ہے۔ ارض و سما اور جو کچھ ان میں ہے اس کا اپنا ہے لیکن وہ ان کا محتاج نہیں ہے۔ چاہے تو ان سب کو تباہ کر دے اس کی عظمت کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، انہیں قائم رکھے پھر بھی اس کی عظمت وہی ہے۔ اللہ کریم ہی قابلِ ستائش ذات ہے۔ انسان جب اللہ سے ناآشنا ہوتا ہے تو پھر اپنی تعریف سن کر خوش ہوتا ہے وہ چاہتا ہے کہ لوگ اس کی تعریف کریں۔ لوگ اُسے بڑا جانیں اسے رئیس یا امیر کہا جائے، یا وہ چاہتا ہے کہ لوگ اُسے پارسا اور بزرگ کہا کریں۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کے بارے میں لوگوں کا یہ خیال ہو کہ جو اس کے منہ سے نکل جاتا ہے وہ پورا ہو جاتا ہے۔ یہ شان تو صرف اللہ کریم کی ہے۔ انسان تو عاجز اور حقیر بندہ ہے، اس کی زبان اگر اللہ کریم بند کر دیں تو یہ بول تک نہیں سکتا، اللہ کی عطا کردہ طاقت سے بولتا ہے تو اس کے کہنے سے کیا ہوگا۔ سو بڑائی اور تعریف اللہ ہی کو سزاوار ہے۔

سورۃ الحج رکوع 9 آیات 65 تا 72

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ وَالْفُلْکَ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ
بِاَمْرِہٖ ؕ وَیُمْسِکُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَی الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ
بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۶۵﴾ وَھُوَالَّذِیْٓ اَحْیَاکُمْ ۫ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ
یُحْیِیْکُمْ ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَکَفُوْرٌ ﴿۶۶﴾ لِکُلِّ اُمَّۃٍ جَعَلْنَا مَنْسَکًا ھُمْ
نَاسِکُوْہُ فَلَا یُنَازِعُنَّکَ فِی الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰی رَبِّکَ ؕ اِنَّکَ لَعَلٰی ھُدًی
مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۶۷﴾ وَاِنْ جٰدَلُوْکَ فَقُلِ اللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۶۸﴾ اَللّٰہُ یَحْکُمُ
بَیْنَکُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ فِیْمَا کُنْتُمْ فِیْہِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۶۹﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ
یَعْلَمُ مَا فِی السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّ ذٰلِکَ فِیْ کِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ
یَسِیْرٌ ﴿۷۰﴾ وَیَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِہٖ سُلْطٰنًا وَّمَا لَیْسَ
لَھُمْ بِہٖ عِلْمٌ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ نَّصِیْرٍ ﴿۷۱﴾ وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْھِمْ اٰیٰتُنَا
بَیِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِیْ وُجُوْہِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الْمُنْکَرَ ؕ یَکَادُوْنَ یَسْطُوْنَ
بِالَّذِیْنَ یَتْلُوْنَ عَلَیْھِمْ اٰیٰتِنَا ؕ قُلْ اَفَاُنَبِّئُکُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِکُمْ ؕ
اَلنَّارُ ؕ وَعَدَھَا اللّٰہُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ؕ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ﴿۷۲﴾

(اے مخاطب!) کیا تُونہیں جانتا یہ کہ اللہ نے زمین کی تمام چیزوں کو تمہارے کام میں لگا رکھا ہے اور جہاز بھی سمندر میں اُسی کے حکم سے چلتے ہیں اور اسی نے آسمان کو تھام رکھا ہے کہ زمین پر (نہ) گر پڑے ہاں مگر اُسی کا حکم ہو جائے (تو الگ بات ہے)

بے شک اللہ لوگوں پر بڑی شفقت فرمانے والے، مہربان ہیں ﴿۶۵﴾ اور وہی تو ہے جس نے تم کو حیات بخشی پھر تم کو موت دیتا ہے پھر تم کو زندہ فرمائے گا واقعی انسان بڑا ناشکرا ہے ﴿۶۶﴾ ہم نے ہر امت کے لیے ایک طریقہ مقرر فرما دیا ہے جس پر وہ چلتے ہیں سو اُن لوگوں کو چاہیے کہ آپ سے اس امر میں جھگڑا نہ کریں۔ اور آپ اپنے پروردگار کی طرف بلاتے رہیے بے شک آپ سیدھے راستے پر ہیں ﴿۶۷﴾ اور اگر یہ لوگ (کافر) آپ سے جھگڑا کریں تو فرما دیجیے جو کام تم کرتے ہو اللہ اُن سے خوب واقف ہیں ﴿۶۸﴾ جن باتوں میں تم اختلاف کرتے ہو اللہ قیامت کے دن تمہارے درمیان ان میں فیصلہ فرما دیں گے ﴿۶۹﴾ (اے مخاطب!) کیا تُو نہیں جانتا کہ اللہ سب چیزوں کو جانتے ہیں جو آسمان اور زمین میں ہے بے شک یہ سب کتاب میں (لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا) ہے یقیناً یہ (فیصلہ کرنا) اللہ کے لیے (بہت) آسان ہے ﴿۷۰﴾ اور یہ لوگ اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جس کے بارے اُس (اللہ) نے کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی اور نہ ان کے پاس اس کی کوئی (عقلی یا نقلی) دلیل ہے اور ان ظالموں کا کوئی مدد کرنے والا نہ ہوگا ﴿۷۱﴾ اور جب اُن کے سامنے ہماری آیتیں جو کہ خوب واضح ہیں پڑھی جاتی ہیں تو آپ اُن کافروں کے بگڑے چہرے پہچان جاتے ہیں۔ قریب ہے کہ یہ ان پر حملہ کر بیٹھیں جو اُن کے سامنے ہماری آیتیں پڑھ رہے ہیں۔ اُن (مشرکین) سے فرمایئے پس کیا میں تم کو اس (قرآن) سے بھی ناگوار چیز بتاؤں (دوزخ کی) آگ۔ جس کا اللہ نے کافروں سے وعدہ فرمایا ہے اور وہ بہت بُرا ٹھکانہ ہے ﴿۷۲﴾

تفسیر و معارف

زمین پر جو ہے سب انسان کی خدمت کے لیے ہے:

فرمایا: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ ۔۔۔ (اے مخاطب!) کیا تُو نہیں جانتا کہ اللہ نے زمین کی تمام چیزوں کو تمہارے کام میں لگا رکھا ہے۔ اے انسان! تو یہ بھی نہیں دیکھتا کہ اس کا تجھ پر کتنا بڑا احسان ہے

کہ تو ایک عاجز مخلوق ہے لیکن تجھے اس نے یہ شرف بخشا کہ تم میں اُس نے اپنے پیغمبرؑ و رسلؑ بھیجے اور اُن میں اولوالعزم (رسلؑ) منتخب فرمائے۔ تجھے مخاطب فرما کر تجھ پر کتابیں نازل کیں، تجھ سے باتیں کیں اور پھر تجھ پر اتنا بڑا احسان کیا کہ روئے زمین پر جو کچھ ہے وہ سب تیرے لیے مسخر کر دیا، اُسے تیری خدمت پر لگا دیا۔ روئے زمین پر جو کچھ ہے وہ تیرے اختیار میں دے دیا۔ کسی نے کیا خوب کہا تھا:

وہی ذبح بھی کرے اور وہی لے ثواب الٹا

کہ کیسی عجیب بات ہے کہ اللہ کی مخلوق کا اللہ کے نام پر گلا کاٹتا ہے اور اسے کھانا اس پر حلال بھی ہو جاتا ہے اور ذبح کرنے کا ثواب بھی ملتا ہے۔ جانور کی جان جاتی ہے ثواب اسے ملتا ہے اس لیے کہ اس جانور کو انسان کی خدمت کے لیے بنایا گیا تھا لہٰذا جانور بھی اپنی مراد کو پا گیا، جس مقصد کے لیے بنا تھا اس مقصد کو پا گیا۔ انسان سمندری مخلوق سے بھی فائدہ اٹھا رہا ہے اور سمندر میں سے ہیرے موتی نکال رہا ہے۔ پہاڑوں میں سے معدنیات نکال رہا ہے، سونا چاندی نکال رہا ہے۔ زیر زمین سے کیا کیا خزانے اور زمین سے کیسی کسی فصلیں حاصل کر رہا ہے۔ غرض ہر شئے اس کی خدمت پر کمر بستہ ہے انسان کو قوت اور اختیار دیا کہ زمین سے خدمت لیتا ہے۔ صرف زمین ہی نہیں، فرمایا: وَالْفُلْكَ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ۔۔۔ اور جہاز بھی سمندر میں اسی کے حکم سے چلتے ہیں۔ انسان کو اس نے جہازوں میں بٹھا دیا اور سمندر کو بھی انسان کے تابع کر دیا اس سے غذا بھی نکال رہا ہے، مچھلیاں پکڑ رہا ہے۔ اس سے تیل بھی نکال رہا ہے اور طرح طرح کے خزانے، ہیرے موتی بھی نکال رہا ہے۔ اسی سمندر سے انسان مختلف دوائیں بھی نکال رہا ہے اور اس کی سطح پر اپنے جہاز میں مزے سے گھوم پھر رہا ہے۔

اللہ کی رحمت کا احاطہ ناممکن ہے:

فرمایا: وَیُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ۔۔۔ اور اسی نے آسمان کو تھام رکھا ہے کہ زمین پر (نہ) گر پڑے ہاں مگر اسی کا حکم ہو جائے تو الگ بات ہے۔ جب وہ چاہے تو آسمان بھی پھٹ جائے اور انسانوں سے کوئی معاوضہ یا ٹیکس وصول نہیں فرماتا کہ اتنا معاوضہ دو تو چھت قائم رہے گا یا اس کی مرمت کے لیے چندہ دو تا کہ چھت گرے نہیں یا محنت کرو کہ یہ سائبان برقرار رہے۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ انسان کی محنت کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ اللہ کی قدرت کاملہ نے آسمان کو سائبان بنا رکھا ہے اور اسے گرنے نہیں دیتا۔ اس لیے کہ: اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۶۵﴾ اللہ لوگوں پر بڑی شفقت فرمانے والے مہربان ہیں۔ بِالنَّاسِ سے مراد اولادِ آدم ہے اور اس میں مومن، کافر، نیک و بد، بادشاہ اور مسکین سب شامل ہیں۔ اللہ کریم سب پر شفقت فرمانے والے ہیں اور رحم فرمانے والے ہیں۔ اللہ کی عظمت کا احاطہ ممکن نہیں ہے اور نہ ہی اس کے رحم اور کرم کا احاطہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کی رحمت تو

بحر نا پیدا کنار ہے اور ہر ذی روح پر اس کا کرم ہے جبکہ انسانوں پر تو اس کی خاص شفقت ہے۔ وہ نسلِ انسانی پر بہت شفیق اور رحم کرنے والے ہیں۔ اب جو دوزخ کی طرف رواں دواں ہیں وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر اس کے دامانِ رحمت کو جھٹک کر زبردستی مشقت کر کے دوزخ جا رہے ہیں۔ انسان کو یاد رکھنا چاہیے کہ جنت جانا بڑا سہل ہے اور دوزخ جانا بڑا مشکل اور کٹھن کام ہے۔ کفر و شرک سے لے کر ہر گناہ، چوری ڈکیتی برائی رشوت وغیرہ کے لیے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں تب جا کر دوزخ ملتی ہے۔ انسان بد بخت ہے جو اپنے کریم ربّ کا دامن جھٹک کر دوزخ کی طرف لپکتا ہے۔ انسان کو قوتِ فیصلہ دی گئی اور نیکی اور بدی کے راستے اس کے سامنے رکھ دیے گئے۔ یہ ایسا جاہل ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر، انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کے دامانِ رحمت کو چھوڑ کر دنیا کے لالچ میں چھینا جھپٹی کرنے کے لیے اپنے آپ کو تباہ کرتا ہے۔

زندگی اور موت اللہ کی عطا ہے:

اللہ کریم اپنی شفقت اور احسانات کے تذکرے کے بعد ایک بنیادی بات ارشاد فرماتے ہیں: **وَهُوَ الَّذِيٓ اَحْيَاكُمْ**۔۔۔ وہی تو ہے جس نے تم کو حیات بخشی تو تم سوچو، غور کرو کہ تم کہاں سے آئے، تمہیں کس نے پیدا کیا، کس نے تمہارے اعضا کو ایسی ترتیب دی کہ وہ ایک خوبصورت انسانی وجود بن گیا؟ کس نے تمہارے وجود میں روح پھونک دی، کس نے تمہیں عقل اور شعور دیا اور تمہیں نیکی اور بدی کی تمیز دی؟ زندگی کی بہاریں اور نعمتیں برتنے کی توفیق دی۔ یہ حقیقت بھی تمہارے سامنے ہے کہ تمہاری یہ زندگی ابدی نہیں ہے تمہارے سامنے روز کتنے لوگ مرتے ہیں اور کتنے پیدا بھی ہوتے ہیں۔ وہی ذات ہے جو **ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ**۔۔۔ پھر تم کو زندہ فرمائے گا اور ایک نئی زندگی کی ابتدا ہوگی۔ موت کے بعد برزخ کی حیات ہے جو قیامِ قیامت تک رہے گی **ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ**۔۔۔ پھر قیامت کے دن اس بدن سمیت تم کو زندہ کر دے گا اور تمہیں اس کی بارگاہ میں حاضر ہو کر جواب دینا ہے۔

عظمتِ الٰہی کا ادراک نہ کرنا ناشکری ہے:

اللہ کریم نے انسان کو پیدا فرمایا، اُسے مکلف بنایا اور اپنی معرفت کی استعداد دی اور اس کے سامنے اپنی کائنات سجا دی تاکہ اس کی حقیقتوں سے واقف ہو کر اس کی عظمت کو پا جائے۔ لیکن **اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ ﴿٦٦﴾** انسان واقعی بڑا ناشکرا ہے۔ انسانوں کی اکثریت عمومی طور پر ناشکری ہے، اللہ کا شکر ادا نہیں کرتی۔ اس موضوع پر کہ 'شکر کیا ہے' بہت وسیع بحثیں ہوئیں ہیں اور اللہ کے بندوں نے بہت خوبصورت انداز میں اس پر بہت کچھ لکھا ہے۔ اس آیۂ کریمہ میں یہ جو کہا گیا ہے کہ انسان ناشکرا ہے تو اس حوالے سے کہا گیا ہے کہ یہ عظمتِ الٰہی کا ادراک نہیں کرتا۔ اگر ادراک کر لیتا تو کبھی نافرمانی نہ کرتا۔ اگر انسان کو یہ احساس ہو جاتا کہ اُسے ایک خالق نے پیدا فرمایا ہے

اور ایک مدت کے لیے دنیا میں رکھا ہے۔ اس پر کچھ حدود و قیود لگائی ہیں کہ وہ کیا کرسکتا ہے اور کیا نہیں کرسکتا اور کس انداز میں کرسکتا ہے اور کس انداز کو نہیں اپنا سکتا۔ اگر وہ عظمتِ الٰہی سے آشنا ہوتا تو اس کے احکام کی پابندی کرتا اور یہ آشنائی اُسے یہ شعور عطا کرتی کہ اللہ ہی اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے اس کی عبادت کی جائے۔ اس آیہءِ کریمہ میں اس امر کو شکر کہا گیا ہے اور ایسا نہ کرنے والوں کو ناشکرا کہا ہے۔ یقیناً انسانوں کی اکثریت اللہ کا شکر ادا نہیں کرتی۔

مقصدِ حیات:

اس آیہءِ کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مقصدِ حیات عظمتِ الٰہی کا ادراک ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذاریات: 56) ہم نے جنوں اور انسانوں کو اپنی عبادت کے لیے، یعنی معرفت کے لیے پیدا کیا کہ اطاعت تب ہی کی جائے گی جب اس ہستی کی عظمت کو جانا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ یہی ہستی اطاعت کی حق دار ہے۔ مگر انسان دنیا میں اس طرح محو ہوجاتا ہے کہ اُسے نہ اپنا خالق یاد رہتا ہے نہ ہی اس کی عظمت کا احساس رہتا ہے لہٰذا وہ اپنی پسند کو نافذ کرنا چاہتا ہے لیکن ایسا کر نہیں پاتا۔ یوں وہ ساری عمر کی حسرتیں لیے دنیا سے چلا جاتا ہے۔

شریعت، احکام و اخبار کا مجموعہ:

شریعت دو چیزوں کا مجموعہ ہے، ایک ہے خبر اور ایک احکام۔ خبر تبدیل نہیں ہوتی کہ اگر خبر تبدیل ہوتی تو دو میں سے ایک سچی ہوتی ہے۔ پہلے ایک خبر آئی بعد میں دوسری آ گئی تو دونوں سچ نہیں ہوسکتیں، ایک سچی ہوگی۔ خبر کیا ہے؟ خبر یہ ہے کہ اللہ واحد ہے لاشریک ہے، فرشتے ہیں، آخرت ہے، جنت دوزخ ہے، قیامت کا قائم ہونا، حساب کتاب ہوگا یہ تمام اخبار ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر نبیؑ نے یہی تاکید کی کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه اور سارے حقائق آخرت اور جنت دوزخ، حساب کتاب، فرشتوں کے بارے ایک جیسے ہی ارشاد فرمائے۔ فرمایا: لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ۔۔۔ ہم نے ہر اُمت کے لیے ایک طریقہ مقرر فرما دیا ہے جس پر وہ چلتے ہیں سو ان لوگوں کو چاہیے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اس امر میں جھگڑا نہ کریں۔ شریعت کا دوسرا حصہ احکام سے متعلق ہے جو ہر اُمت کی اپنی استعداد کے مطابق تھے چنانچہ مختلف تھے۔ اب آخری شریعت آ چکی اور آخری احکام بھی نازل ہو گئے اور اس شریعت میں مختلف استعداد کے لوگوں کے لیے احکام بھی مختلف ہیں۔ مثلاً نماز میں قیام فرض ہے لیکن جو کھڑا نہیں ہوسکتا وہ بیٹھ کر پڑھ

سکتا ہے، اس کے لیے اجازت ہے۔ یہ دو حکم ہو گئے۔ اسی طرح سجدہ بھی فرائضِ نماز میں سے ہے لیکن جو شخص زمین سے اٹھ بیٹھ نہیں سکتا اس کے لیے گنجائش ہے کہ وہ کرسی پر بیٹھ کر اشارے سے سجدہ کر لے۔ یوں ایک وقت میں دو لوگوں کے لیے مختلف احکام ہو گئے۔ احکام استعداد پر ہوتے ہیں۔ اپنے اپنے عہد میں پہلی اُمتوں کے پاس جتنے دنیوی علوم، جتنی استعداد کار اور مہارت تھی اس کے مطابق احکام نازل ہوا کرتے تھے۔ اب پہلی شریعت کے احکام کو لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلّم سے جھگڑا کرنا کہ تورات میں تو یہ حکم تھا، انجیل میں ایسے تھا آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) ایسے کیوں فرما رہے ہیں، یہ درست نہیں کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلّم مبعوث ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم پر کلامِ الٰہی القرآن نازل ہوا تو پہلی تمام شریعتیں منسوخ ہو گئیں۔ اپنے اپنے عہد میں وہ احکام درست تھے لیکن اب یہ بحث بے جا ہے کہ پہلی شریعت میں تو فلاں چیز تھی اس میں یہ کیوں ہے۔ اُمتِ موسیٰ علیہ السلام پر دو نمازیں فرض تھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے پانچ کیوں کر دیں وغیرہ فرمایا کہ ہر قوم کے لیے ہم نے جینے کا نظام بنایا، عبادات اور معاملات کے طریقے بنائے اور وہ اس پر عمل کرتے تھے۔

بعثتِ عالی انسانیت کی بلوغت پر ہوئی:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت انسانیت کی بلوغت پر ہوئی۔ آدم علیہ السلام کا دور انسانیت کے بچپن اور لڑکپن کا دور تھا۔ جیسے جیسے انسانی شعور ترقی کرتا گیا تو اُن کی طرف جو انبیاؑ آئے وہ ایسے احکام لائے جو اُن لوگوں کے لیے سمجھنے مشکل نہ ہوتے اور اُن پر عمل پیرا ہونا بھی آسان ہوتا۔ اُس دور میں جبکہ آمدورفت کے اعلیٰ وسائل میسر نہ تھے تو ہر علاقہ الگ الگ تھا۔ ایک دوسرے کو جاننا، آنا جانا سفر کرنا مشکل تھا۔ لوگوں کے تعلقات دور دراز علاقوں میں نہیں ہوتے تھے۔ آبادیاں الگ الگ تھیں۔ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ ہم نے ہر قوم پر نبیؑ بھیجے۔ ایک وقت میں بہت سے انبیاؑ مبعوث ہوئے۔ مثلاً ابراہیم علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر موجود تھے لیکن ذرا فاصلے پر دوسرے علاقے میں لوط علیہ السلام نبیؑ تھے۔ اللہ کریم کے اس ارشاد کا مطلب ہے کہ اقوامِ عالم جہاں جہاں آباد تھیں وہاں انبیاؑ آئے۔ برصغیر میں الگ آئے ہوں گے وسطِ ایشیا میں الگ آئے ہوں گے۔ چین وغیرہ میں جہاں آبادی تھی جہاں اقوامِ عالم آباد تھیں وہاں اللہ نے نبیؑ بھیجے لیکن جب اقوامِ عالم کے ایک ہونے کا وقت آیا، ایسے وسائل میسر ہونے کا وقت آیا کہ دنیا ایک قوم کی شکل اختیار کر گئی۔ جب انسانیت بالغ ہو گئی، انسانی استعداد نے ترقی کر لی تو اللہ نے اپنے آخری نبی ورسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کو مبعوث فرمایا جو ساری انسانیت کے لیے نبی اور رسول صلی اللہ علیہ وسلّم ہیں۔ اللہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کو ایسے احکام کے ساتھ مبعوث فرمایا جو قیامت تک نہیں بدلیں گے۔ ایک شیر خوار بچے کے لیے اور حکم تھا جب وہ چلنے لگا تو احکام اور تھے۔ جب ذرا بڑا ہوا تو احکام بدل گئے پھر اور سمجھدار ہوا لڑکپن میں آیا

تو احکام اور تھے۔ پھر جب وہ بالغ ہو گیا تو پھر اور ضابطے آ گئے لہٰذا اللہ نے اپنے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا جس ہستی نے نبوت کی تکمیل کر دی اور کسی نئے نبی کی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔ اللہ کی طرف سے احکام بھی جامع نازل کر دیے گئے۔

آج انسانی استعداد اتنی ترقی کر چکی ہے کہ پوری دنیا سمٹ کر ایک گاؤں کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ آج اسے Global Village کہا جاتا ہے، آج ایک آدمی فجر کہیں پڑھتا ہے اور ظہر دنیا کے دوسرے سرے پر پڑھتا ہے اور رات تک واپس بھی آ جاتا ہے۔

معترضین کی پروانہ کریں:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کام پر اب اگر لوگ یہ اعتراض کریں کہ ایسا پہلی اُمتوں میں نہیں تھا تو یہ درست نہیں کہ اب اللہ نے نئی شریعت بھیج دی ہے۔ اب بات نئی شریعت پر ہوگی۔ فرمایا ان اعتراض کرنے والوں کی کوئی حیثیت نہیں لہٰذا ان کی پروانہ کیجیے اور وَادۡعُ اِلٰی رَبِّكَ۔۔۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا کام جاری رکھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پروردگار کی طرف بلاتے رہیے۔ یہ فرائضِ نبوت میں سے ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو اس ہستی کی طرف دعوت دیں جو سب کا ربّ ہے۔ ان معترضین کی پروانہ کریں کہ ان سے جتنی بھی بحث کریں گے اُن کے اعتراض ختم ہونے والے نہیں۔ اس لیے کہ اعتراض کی کوئی سند نہیں ہوتی اور اعتراض ہمیشہ وہ بندہ کرتا ہے جو کام کرنا نہیں چاہتا۔ اعتراض کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جب کوئی شخص کام نہیں کرنا چاہتا تو اس پر اعتراض کرتا رہتا ہے، یہ اقرار نہیں کرتا کہ میں کرنا نہیں چاہتا محض اس کام کے صحیح ہونے پر اعتراضات کرتا ہے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی رتی برابر بھی پروانہ کریں اور انہیں اپنے ربّ کی طرف دعوت دیجیے۔

ایک لطیف نکتہ:

یہاں یہ نہیں فرمایا کہ اپنے اللہ کی طرف دعوت دیجیے بلکہ فرمایا: وَادۡعُ اِلٰی رَبِّكَ۔۔۔ اپنے پروردگار کی طرف دعوت دیجیے جو آپ کا بھی ربّ ہے اور باقی تمام مخلوق کا بھی ہے۔ سب پر اس کے احسانات ہیں اور مخلوق پر واجب ہے کہ اس پروردگار کی اطاعت کرے اُس پروردگار کی اطاعت کی جائے جس کی عطا کردہ قوت سے سانس چل رہی ہے، دل دھڑک رہا ہے، آنکھیں دیکھ رہی ہیں اور جس کی عطا سے ہی حیات وشعور ہے۔ ایسی ہستی کی نافرمانی کیا مخلوق کو زیب دیتی ہے؟

صراطِ مستقیم:

یہ قطعی بات ہے کہ اِنَّكَ لَعَلٰی هُدًی مُّسۡتَقِيۡمٍ ﴿۶۷﴾ بے شک آپ (صلی اللہ علیہ وسلم)

سیدھے راستے پر ہیں۔

یقیناً صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلّم ہی سیدھے راستے پر ہیں، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا دامن تھامے گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا اتباع کرے گا۔ وہ ہی سیدھے راستے پر ہوگا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں: خَطَّ عَبْدُ اللهِ خطًّا مُسْتَقِيماً وَ خَطَّ خَطُوطًا عَنْ يَمِينِهِ وَ عَنْ شِمَالِهِ فَقَالَ: خَطَّ رَسُولُ اللهِ صلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَكَذَا فَقَالَ لِلْخَطِّ الْمُسْتَقِيم: (هَذَا سبيلُ الله) و للخُطوط الَّتِي عَنْ يَمِينِهِ وَشِمَالِه: هذه سُبُلٌ مُتفرِقَةٌ عَلَى كُلِّ سَبيلٍ مِنْهَا شَيْطانٌ يَدْعُو إِلَيْه وَالسَّبِيلُ مُشْتَرَكٌ ترجمہ: عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا، عبداللہ نے ایک سیدھی لکیر کھینچی پس سیدھی لکیر کے بارے فرمایا: ''یہ اللہ کا راستہ ہے'' اور بائیں اور دائیں جانب کی لکیروں کے بارے فرمایا ''یہ متفرق راستے ہیں، ان میں سے ہر ایک رستے پر شیطان ہے جو اس کی طرف بلاتا ہے اور یہ راستہ ایک جیسا ہے۔

خلاصہ یہ کہ سیدھی سیدھی اللہ کی اطاعت کرنی چاہیے جس طرح اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلّم فرماتا ہے۔ اس لیے کہ ہمارے اور اللہ کے درمیان آپ صلی اللہ علیہ وسلّم ہی وسیلہ و واسطہ ہیں۔ ہم نے اللہ کو نہیں دیکھا نہ ہی اللہ کی بات سُنی۔ صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے اللہ کی بات سنی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم پر وحی آتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے کلام باری سنا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے بتایا کہ اللہ واحد و لاشریک ہے، سب کا خالق، مالک اور پروردگار ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے بتایا کہ آخرت ہے، قیامت ہے، حساب کتاب ہے، جنت و دوزخ ہے۔ یہ بتانا کہ کیا صحیح ہے کیا غلط ہے یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ہی منصبِ جلیلہ ہے۔ اللہ کریم گواہی دے رہے ہیں کہ یہ یقینی بات ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم سیدھے راستے پر ہیں۔ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں وہی سیدھا راستہ ہے اور جو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشاد سے باہر نکلے گا وہ سیدھے راستے سے بھٹک جائے گا۔

بحث کرنے والوں کو سادہ سا جواب:

آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے صراطِ مستقیم پر ہونے کے باوجود یہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم سے بحث کریں، جھگڑا کریں اور بات ماننے کی طرف نہ آئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم بھی ایک سادہ سی بات کہہ دیں۔ فرمایا: وَاِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴿۶۸﴾ اگر یہ (کافر) لوگ آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) سے جھگڑا کریں تو فرما دیجیے جو کام تم کرتے ہو اللہ ان سے خوب واقف ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلّم ایک سادہ سی بات ارشاد فرمادیں کہ اللہ کریم جانتے ہیں جو تم کررہے ہو اس لیے کہ اللہ کریم کے روبرو کررہے ہو۔ اللہ کریم ہر جگہ موجود ہیں۔ ہر کام کو دیکھ رہے ہیں۔ ہر بات کو سُن رہے ہیں، تو اس بحث میں پڑنے کی

ضرورت نہیں ہے۔ اگر تم یہ بات نہیں ماننا چاہتے تو اپنی مرضی کر کے بھی دیکھ لو لیکن یہ یاد رکھو! جب اس کی بارگاہ میں لوٹ کر جاؤ گے تو تمہیں ان کاموں کی جزا ملے گی جو تم آج کر رہے ہو۔ فرمایا: اَللّٰهُ یَحْكُمُ بَیْنَكُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۶۹﴾ جن باتوں میں تم اختلاف کرتے ہو اللہ قیامت کے دن تمہارے درمیان ان میں فیصلہ فرما دیں گے۔ قیامت کا دن اسی لیے ہے کہ دنیا میں جو لوگ مختلف الخیال ہو گئے اور انہوں نے مختلف عقیدے اپنا کر اُن عقائد کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھال لیا تو سب اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے اور اللہ کریم ان کے درمیان فیصلہ کر دیں گے۔ اس دن یہ فیصلہ کر دیا جائے گا کہ کون صحیح ہے اور کون غلط لہٰذا اس میں جھگڑنے اور بحث کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ تم لوگ (کافر) اس بات پر کیوں جھگڑا کرتے ہو، اتنا شور شرابا کرتے ہو جبکہ اس میں لڑائی کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ اگر تم قبول کرنا نہیں چاہتے تو تم خود اللہ کریم کے سامنے جوابدہ ہو گے اور جو ہم کر رہے ہیں ہمیں اپنا جواب دینا ہے۔

اللہ کا علم ساری کائنات کو محیط ہے:

فرمایا: اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ۔۔۔ (اے مخاطب!) کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ سب چیزوں کو جانتے ہیں جو آسمان اور زمین میں ہیں۔

انسان ذرا سوچے تو سہی کہ بالائے آسمان کتنی مخلوق ہے، وہاں کا نظام کیسا ہے، وہاں کتنی حیات ہے، کتنے فرشتے ہیں۔ آسمانوں کی آبادی کیسی ہے، اس میں کیا کچھ موجود ہے اور وہاں کیا کیا ہوتا ہے؟ یہ سوچنے کی بات ہے۔ فرمایا، اے مخاطب! کیا تو نہیں سمجھتا کہ اللہ کا علم اتنا وسیع ہے کہ یقیناً جس نے یہ کائنات بنائی ہے اس نے ایک ایک خلیہ (Cell) جوڑ کر بنائی ہے اور یہ سارا نظام بنایا ہے وہ اس کائنات کے ایک ایک ذرّے ایک ایک خلیہ (Cell) سے واقف ہے۔ اس ذرّے میں بھی نہ جانے کتنے خلیے (Cell) ہوں گے ان سے بھی واقف ہے۔ اس نے ایک ایک سیل خلیہ (Cell) جوڑ کر یہ زمینیں بنائیں، ان پر نباتات بنائیں، پھل پھول یہ سب بنائے، ذی الارواح بنائے۔ آج کے دور میں تو بلند و بالا عمارتیں تعمیر کی جا رہی ہیں۔ سو منزلہ، ڈیڑھ سو منزلہ عمارتیں بن رہی ہیں لیکن کیا یہ سب ایک ایک اینٹ جوڑنے سے نہیں بنتیں؟ عمارات خواہ بادلوں کو چھو رہی ہوں اُن کی بنیاد تو ایک ایک اینٹ ہے۔ جو کاریگر اسے بناتا ہے وہ تو اس کی ایک ایک اینٹ سے واقف ہے اور اُسے اس طرح حساب سے لگاتا ہے کہ اس کے اوپر اتنی منزلیں بنیں گی تو وہ یہ بوجھ اٹھا سکیں گی۔ یہ سارا حساب وہ کاریگر جانتا ہے لیکن تعمیر کرنے کے بعد وہ فارغ ہو جاتا ہے۔ اب وہ عمارت کھڑی رہے یا گِر جائے، اُسے کوئی سروکار نہیں۔ جس نے یہ کائنات بنائی وہ تو اُسے چلا بھی رہا ہے اُسے قائم رکھے ہوئے ہے۔ جب تک چاہے گا قائم رکھے گا جب چاہے گا سب کو نابود کر دے گا۔ اسی

نے آسمان اور بالائے آسمان بنائے اور جو کچھ وہاں ہے وہ سب بھی اللہ نے بنایا تو کیا اس سے کوئی چیز چھپی رہ سکتی ہے؟ بلکہ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ۔۔۔ یہ سب تو کتاب (لوح محفوظ) میں لکھا ہوا ہے۔ یہ ساری کائنات، زمینوں، آسمانوں کے خلیے (Cell) سب تو کتاب (لوح محفوظ) میں لکھا ہوا ہے۔ یہ ساری کائنات، زمینوں، آسمانوں کے خلیے (Cell) تعمیر و تدریج، اس نے کب تک چلنا ہے، کب اور کیسے ختم ہونا ہے، اس نظام کے ختم ہونے کے بعد کیا ہونا ہے، کیسے رہنا ہے، کیسے مٹنا ہے؟ یہ تمام باتیں تو لوحِ محفوظ میں موجود ہیں جبکہ اللہ کا علم تو لامحدود ہے۔ لوحِ محفوظ، ایک ڈائری سمجھ لیں جس میں یہ باتیں درج ہیں۔ انسان کو ہی دیکھ لیں، اپنی یاداشت کی ایک ڈائری لکھتا ہے۔ اب وہ ڈائری اس کے علم کا کُل تو نہیں ہوتی۔ وہ شاید Phd ہو، بہت عالم فاضل ہو تو وہ کچھ چیزیں اپنی ڈائری میں نوٹ کرتا جاتا ہے تو اس کا علم تو اس ڈائری سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ فرمایا: اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ۔۔۔ یہ سارا کچھ تو لوح محفوظ میں بھی لکھا ہوا ہے، یہ علمِ الٰہی کا کوئی قابلِ ذکر حصہ تو نہیں بن سکتا کہ علمِ الٰہی تو لامحدود ہے فرمایا: اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ یہ سب کچھ اللہ کے لیے بہت آسان ہے۔ اس لیے اس کی کوئی ایسی اہمیت نہیں کہ یہ اُسے تھکا دے یا اسے بوجھ لگے یا اس پر بھاری ہو۔ اس کا بنانا چلانا، انجام کو پہنچانا اور لوگوں کے فیصلے کرنا سب اس کے لیے آسان ہے۔

دین و دنیا کے علوم کے حصول کی دعوت:

قرآنِ کریم نے ایسی بحث فرمائی ہے کہ بندۂ مومن کو قرآن بھی سمجھنا چاہیے اور احادیثِ مبارکہ بھی سمجھنی چاہیں، اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم معلمِ قرآن ہیں۔ قرآنِ پاک آپ صلی اللہ علیہ وسلّم پر نازل ہوا اور قرآن کی تفسیر بیان کرنا بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا منصبِ جلیلہ ہے۔ ارشاد ہوا: لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ ۔۔۔(النحل:44)

تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم لوگوں سے کھول کر بیان فرما دیں جو ان کی طرف (احکام و مضامین) اُتارے گئے ہیں۔ کلامِ الٰہی کا مفہوم و معانی ارشاد فرمانا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا منصبِ جلیلہ ہے۔ کوئی تفسیر و تعبیر جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشاد کردہ ضابطے سے باہر نکل جائے گی وہ تفسیر بالرائے ہوگی اور تفسیر بالرائے کا انجام دوزخ ہوگا۔ تمام دینی علوم کی بنیاد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیمات ہیں اور اُن ضابطوں کے اندر ہیں۔ یہ علم مسلمانوں کو ضرور حاصل کرنا چاہیے کہ فرائض اور سنت کا جاننا فرض ہے۔ واجبات کا جاننا واجب ہے اور علوم کا جاننا عظمتِ الٰہی کا احساس پیدا کرتا ہے۔ کیا یہی علم مسلمان کو حاصل کرنا چاہیے؟ فرمایا صرف یہ نہیں بلکہ ارض و سما کی تخلیق پر بھی غور کرو۔ نظامِ کائنات میں غور کرو یعنی علوم دنیا بھی حاصل کرو، سائنس پڑھو اور ان علوم پر بھی دسترس حاصل کرو۔ یہاں اللہ کریم نے جو بحث ارض و سما کی تخلیق اور اس کے حساب پر فرمائی ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ دین بھی سیکھو عظمتِ الٰہی اور صداقتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلّم کو جانو اور ساتھ دنیوی علوم بھی سیکھو، نظامِ کائنات کو جانو کہ اس سے

بھی خالق کی عظمت کا شعور پیدا ہوتا ہے۔

عہدِ حاضر کا المیہ:

آج ہمارے عہد کی بدنصیبی یہ ہے کہ جو لوگ دین کی طرف متوجہ ہوئے انہوں نے دنیا کا کچھ نہیں سوچا اور تمام تر کوشش دین میں لگا دی۔ دوسری طرف جو لوگ دنیا کی طرف گئے، سائنس اور ٹیکنالوجی کی طرف متوجہ ہوئے انہیں تو اللہ بھی یاد نہ رہا۔ دین سیکھنا تو دور کی بات انہوں نے اللہ کا نام لینا بھی چھوڑ دیا چنانچہ ہم دو جزیروں میں بٹ گئے اور ہم میں لڑائی شروع ہوگئی۔ جن کے پاس دین تھا وہ کہتے ہیں کہ ساری تباہی کا سبب یہ دنیوی علوم کے جاننے والے لوگ ہیں، ان کو لٹکا دینا چاہیے۔ جن کے پاس دنیا ہے وہ کہتے ہیں کہ سارے فساد کا سبب یہ مولوی ہیں، انہیں تو کسی سمندر میں غرق کر دینا چاہیے۔ اس افسوسناک صورتحال کی اصل وجہ یہ ہے کہ دونوں کے پاس آدھا آدھا علم ہے۔ کچھ دینی درسگاہوں نے اب یہ کوشش کی ہے کہ وہ بچوں کو دنیوی علوم بھی سکھائیں اور یہ بہترین کوشش ہے لیکن افسوس کہ دنیوی تعلیمی ادارے اس طرف نہیں آرہے کہ دنیوی علوم کے ساتھ دین بھی سکھائیں۔ ایک دہائی قبل چند دینی اداروں کے علما حضرات نے اس طرف توجہ فرمائی ہے۔ اللہ کریم اُن کی یہ کوشش کامیاب فرمائیں۔ چند سال پہلے وطنِ عزیز میں ایسے علما دیکھے ہیں جو فارغ التحصیل عالم بھی تھے اور مختلف مضامین میں ایم اے کی سند کے حامل بھی تھے۔

غیر اللہ کی عبادت نِری جہالت ہے:

فرمایا: وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ۔۔۔ یہ لوگ اللہ کے سوا ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جس کے بارے اللہ نے کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی اور نہ ان کے پاس اس کی کوئی (عقلی یا نقلی) دلیل ہے۔ اگر دنیوی منفعت کے لیے کسی بندے کی غیر مشروط اطاعت کی جائے تاکہ وہ راضی رہے اور اس کے لیے اللہ کی نافرمانی کی جائے تو یہ اس کی عبادت کہلائے گی۔ بعض لوگ اللہ کی بارگاہ کو چھوڑ کر دوسروں کو پکارتے ہیں، بتوں کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں، دولت اور اقتدار کو پوجتے ہیں۔ وہ ایسی چیزوں کو پوجتے ہیں جو محض خیالی بت ہوتے ہیں اور جن کی عبادت کے لیے اللہ نے کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی۔ عبادت صرف رکوع سجود ہی کا نام نہیں ہے یا دعائیں مانگنے کا نام نہیں ہے۔ جب بھی دنیوی منفعت، خواہ وہ دولت ہو یا عہدہ ہو، پانے کے لیے اللہ کی اطاعت کے خلاف کسی بندے کی اطاعت کرتے ہیں تو یہ اُس کی عبادت شمار ہوتی ہے۔ فرمایا، ایسی عبادت کے لیے تو اللہ نے کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی، کسی نبیؐ نے اس کی اجازت نہیں دی، کسی کتاب اللہ، کسی

شریعت میں اس کے لیے اجازت نہیں دی۔ جو اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کی عبادت کرتے ہیں وہ خود بھی اس فلسفے کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ہمارے جیسا ہی مخلوق ہے تو اس کی عبادت کیوں کریں۔ یہ کس قدر جہالت ہے!

انسان اشرف المخلوقات ہے، اللہ کی سب سے اعلیٰ مخلوق ہے۔ اب اگر انسان بندروں کے آگے ہاتھ باندھ کر بیٹھ جائے، جانوروں کی پوجا کرے، درختوں اور پہاڑوں کو سجدہ کرے تو یہ انسانیت کی بھی تذلیل ہے۔ یہ لوگ اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے کہ اپنے سے کمتر مخلوق کے آگے دست بستہ کھڑے ہو کر دعائیں مانگ رہے ہیں، کمال ہے! فرمایا: وَّمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ۔۔۔ یہ ایسے جاہل ہیں، ان کے پاس علم نام کی کوئی شئے نہیں ہے۔ اگر ان کے پاس کچھ بھی علم اور شعور ہوتا تو یہ سوچتے کہ بھلا مخلوق کو مخلوق کی پوجا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ آخر وہ بھی ہمارے جیسی مخلوق ہے۔ ملک کا سربراہ بھی مخلوق ہے، اُسے بھی بھوک لگتی ہے، نیند آتی ہے جیسے ہمیں آتی ہے۔ اُسے بھی پیاس لگتی ہے، وہ بھی بیمار ہو جاتا ہے، جیسے ہم بیمار ہوتے ہیں تو پھر اُس کی پوجا کیوں کی جائے؟ ان لوگوں کے پاس علم و شعور ہوتا تو یہ ضرور سوچتے کہ اس کو کیا حق ہے کہ ہم اس کی پوجا کریں کہ یہ تو خود محتاج ہے یہ ہماری کیا مدد کرے گا؟ فرمایا یہ سن لو :وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ﴿۷۱﴾ ان ظالموں کا کوئی مدد کرنے والا نہ ہوگا۔ جو لوگ یہ ظلم کرتے ہیں، زیادتی کرتے ہیں اُن کو کوئی مدد کرنے والا نہیں ملتا۔ یہ اللہ کا ایسا نظام ہے کہ ظالم بے یار و مددگار ہو جاتا ہے۔ دنیا میں رہتے ہوئے اگر اپنی کوتاہی کی وجہ سے وہ اس حقیقت کو نہ پا سکے لیکن قبر میں اُتر کر، میدانِ حشر میں جا کر اُسے پتا چل جائے گا کہ ظلم کے میدان میں، کفر و شرک اور اللہ کی نافرمانی کے میدان میں وہ بالکل اکیلا ہے کوئی اس کی مدد کرنے والا نہیں ہے۔

برائی کا ایک عجیب وبال:

لوگ گناہ اور برائی میں اتنے آگے بڑھ جاتے ہیں کہ: وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ۔۔۔ اور جب اُن کے سامنے ہماری آیتیں جو کہ خوب واضح ہیں پڑھی جاتی ہیں تو آپ ان کے بگڑے چہرے پہچان جاتے ہیں۔

برائی کا ایک عجیب وبال ہے کہ لوگ جب اللہ کی عظمت کو چھوڑ کر مخلوق کی پوجا پر لگ جاتے ہیں تو ان کے دل سخت ہو جاتے ہیں، اتنے سیاہ ہو جاتے ہیں کہ ان کے سامنے اگر اللہ کا نام لیا جائے تو آگ بگولہ ہو جاتے ہیں حالانکہ ایک انسان جب دوسرے انسان سے بات کرتا ہے تو انسانی تقاضا ہے کہ اس کی بات تو سن لے اس بات کو صحیح مانتا ہے یا نہیں مانتا یہ اس کی مرضی ہے۔ اگر نہیں بھی مانتا تو کم از کم سن تو لے، نہ مانے لیکن شرک اور برائی سے ان کے دل اتنے تاریک ہو جاتے ہیں کہ ان میں وہ انسانی قوتِ برداشت بھی نہیں رہتی کہ بات ہی سن لیں۔ فرمایا: وَاِذَا

تُتۡلٰى عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتُنَا ۔۔۔ جب اللہ کے بندے ہماری آیات اُن پر پڑھتے ہیں، ہماری بات انہیں سناتے ہیں، اللہ کی عظمت کی بات کرتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی حدیث مبارکہ سناتے ہیں تو: تَعۡرِفُ فِىۡ وُجُوۡهِ الَّذِيۡنَ كَفَرُوا الۡمُنۡكَرَ ۔۔۔ کفار کے چہروں پر انکار کی سیاہی ابھر آتی ہے ان کے چہروں کے نقوش بدل جاتے ہیں اور: يَكَادُوۡنَ يَسۡطُوۡنَ بِالَّذِيۡنَ يَتۡلُوۡنَ عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِنَا ۔۔۔ قریب ہے کہ یہ ان پر حملہ کر بیٹھیں جو ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھ رہے ہیں۔ گویا کفر اور اللہ سے دوری کی یہ مصیبت ہے کہ انسان میں درندگی آجاتی ہے۔ جیسے ایک درندے کو پیار سے بھی بلایا جائے تو وہ جھپٹ پڑتا ہے بالکل اسی طرح جب کافر اور منکر کے سامنے کوئی اللہ کے احکام پیش کرتا ہے یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے احکام پیش کرتا ہے تو ان کے چہروں پر اس طرح تنفر ابھرتا ہے کہ اگر بس چلے تو داعی کو چیر پھاڑ ڈالیں۔ یہ ایک بری کیفیت ہے اور جس پر آتی ہے وہ صرف دوسرے کو تکلیف نہیں دیتا بلکہ خود زیادہ اعصابی دباؤ (Tension) لیتا ہے۔ اس کی اپنی کیفیات اس کے اندر کو تباہ کر دیتی ہیں۔

کفار و منکرین کا انجام:

فرمایا: قُلۡ اَفَاُنَبِّئُكُمۡ بِشَرٍّ مِّنۡ ذٰلِكُمۡ ؕ اَلنَّارُ ؕ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ؕ وَبِئۡسَ الۡمَصِيۡرُ ﴿۷۲﴾ اُن (مشرکین) سے فرمائیے پس کیا میں تم کو اس سے بھی ناگوار چیز بتاؤں (دوزخ کی) آگ۔ جس کا اللہ نے کافروں سے وعدہ فرمایا ہے اور وہ بہت بُرا ٹھکانہ ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلّم ان سے کہیے کہ یہ جو تمہارے اندر، اللہ کی آیات سن کر غیض وغضب بھڑک رہا ہے اور تمہارا چہرہ متغیر ہو رہا ہے، تم غصے میں چیر پھاڑ ڈالنا چاہتے ہو۔ کیا اس سے بھی بری چیز کے بارے میں تمہیں بتا دوں؟ فرمایا اس سے بھی بُری ایک چیز ہے، اَلنَّارُ ۔۔۔ دوزخ کی آگ کہ جس راستے پر تم جارہے ہو اس کا انجام یہی ہے۔ دوزخ کی آگ بہت ہی بری چیز ہے۔ اللہ نے کفار و منکرین سے، اللہ کی عظمت کا انکار کرنے والوں سے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی نبوت کا انکار کرنے والوں سے، اللہ کے دین کا انکار کرنے والوں سے، اس انجامِ بد کا وعدہ کیا ہے۔

ایمان کے دو جُز اور انکار کے دو انداز:

ایمان کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ ہے کہ ایک بندہ کہتا ہے کہ میں اللہ پر، توحید پر، رسالت پر، آخرت پر اللہ کی کتاب پر ایمان لاتا ہوں، ان سب کا اقرار کرتا ہوں۔ ایمان کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ اس پر عمل کتنا کرتا ہے۔ اسی طرح انکار کے بھی دو حصے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ بندہ سیدھا سیدھا انکار کر دے کہ نہ وہ اللہ کو مانتا ہے نہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی رسالت کو مانتا ہے اور نہ ہی دین کو مانتا ہے۔ایک انداز انکار کا یہ بھی ہے کہ زبانی کہتا ہے کہ ان سب کو مانتا ہے لیکن عملاً نہیں مانتا انکار کا یہ انداز ہمارے لیے لمحہ فکر یہ ہے! ہم سب کو یہ سوچنا چاہیے کہ کہیں ہم تو اس میں مبتلا نہیں ہیں؟ کیا ایسا تو نہیں ہے کہ میں اللہ کو واحد اور لاشریک مانتا ہوں، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کو سچا مانتا ہوں، اللہ کی کتاب کو مانتا ہوں قیامت کو مانتا ہوں لیکن اللہ کے احکام کو عملاً نہیں مانتا صرف زبانی مانتا ہوں افسوس کہ آج اکثریت اسی وبا میں مبتلا ہے۔ہمیں اس سے توبہ کرنی چاہیے اور خود کو اطاعتِ الٰہی کے اندر لانا چاہیے۔ہم سب کو اپنی اپنی اصلاح کی فکر کرنی چاہیے۔دوسروں کا محاسبہ کرنے کی بجائے اپنی اصلاح کرنی چاہیے ہر بندہ یہ سوچے کہ جب میں نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کا اقرار کرلیا ہے تو کیا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے احکامات پر عمل پیرا ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی شریعت پر کتنا کاربند ہوں؟ یہ زندگی چندروزہ ہے۔اللہ کریم توفیق عطا کریں کہ اسے ہم اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت میں گزاریں۔ یہ زندگی، کہنے کو بہت بڑا عرصہ لگتا ہے لیکن جن لوگوں کی عمر اسی یا سو سال بھی ہو اگر اُن سے پوچھا جائے تو وہ کہتے ہیں کہ ابھی کل ہی کی تو بات ہے کہ ہم لڑکے تھے، جوان تھے، یہ بالکل کل کی بات لگتی ہے۔

دراصل یہ زندگی محدود سی ہے اور آگے لامحدود حیات ہے کبھی نہ ختم ہونے والی ابدی زندگی ہے۔انسان کو یہ سوچنا چاہیے کہ اس چندروزہ زندگی میں وہ نافرمانی کر کے حاصل پھر بھی وہی کر سکتا ہے جو اللہ کریم اُسے دینا چاہتے ہیں ایسا کر کے البتہ وہ نافرمان کہلاتا ہے۔اُسے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ گناہ کر کے وہ گناہگار کہلائے گا، ملے گا وہی جو اس کی قسمت میں ہوگا۔اگر تو یہ ہوتا کہ انسان اللہ کی نافرمانی کرتا اور اس کی خواہش پوری ہو جاتی تو بھی کوئی بات بنتی لیکن ایسا نہیں ہے۔ ہر چیز اللہ کی طرف سے ملتی ہے۔انسان کا کردار تو اس کی عاقبت کے لیے ہے۔اس کا کردار اس کی عاقبت بنا رہا ہے یا بگاڑ رہا ہے۔اس انداز سے اپنی اپنی زندگیوں کے بارے میں سوچنا چاہیے۔

سورۃ الحج رکوع 10 آیات 73 تا 78

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ
شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ﴿٧٣﴾ مَا قَدَرُوا
اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِىٌّ عَزِيْزٌ ﴿٧٤﴾ اَللّٰهُ يَصْطَفِىْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ
رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿٧٥﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ
وَمَا خَلْفَهُمْ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿٧٦﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا
وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿٧٧﴾ ۩
وَجَاهِدُوْا فِى اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِى
الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ
مِنْ قَبْلُ وَفِىْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ
عَلَى النَّاسِ ۖۚ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ
هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿٧٨﴾

اے لوگو! ایک مثال بیان فرمائی جاتی ہے پس اس کو غور سے سنو کہ بے شک جن لوگوں کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی ہرگز پیدا نہیں کر سکتے (اور) گو سب کے سب اس کام کے لیے کیوں نہ جمع ہو جائیں اور (ایسے عاجز ہیں کہ) اگر ان سے مکھی کوئی چیز چھین لے جائے تو وہ اس کو تو اُس سے چھڑا نہیں سکتے۔ طالب اور

مطلوب (عابد اور معبود) دونوں گئے گزرے ہیں ﴿۷۳﴾ ان لوگوں نے اللہ کی قدر نہیں کی جیسا کہ اُس کا حق تھا بے شک اللہ بڑے زبردست (اور) غالب ہیں ﴿۷۴﴾ اللہ فرشتوں میں سے پیغام پہنچانے والے چُن لیتے ہیں اور انسانوں میں سے بھی۔ بے شک اللہ سننے والے، دیکھنے والے ہیں ﴿۷۵﴾ جو کچھ ان (فرشتوں اور انسانوں) کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے، سب جانتے ہیں اور سب کام اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں ﴿۷۶﴾ اے ایمان والو! رکوع کیا کرو اور سجدہ کیا کرو اور اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہو اور نیک کام کرو تا کہ تم کامیابی حاصل کرو ﴿۷۷﴾ اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ اس میں جہاد کرنے کا حق ہے اُس نے تم کو برگزیدہ فرمایا اور تم پر دین (کی کسی بات) میں تنگی نہیں فرمائی اور تمہارے باپ ابراہیم (علیہ السلام) کا اندازِ کار (ملت)، اُس (اللہ) نے تمہارا لقب مسلمان رکھا اس سے پہلے (پہلی کتابوں میں) بھی اور اس (قرآن) میں بھی (وہی نام رکھا) تا کہ پیغمبر تم پر گواہ ہوں اور تم لوگوں پر گواہ رہو۔ پس نماز ادا کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ (کے دین کی رسی) کو مضبوطی سے پکڑے رہو۔ وہی تمہارے دوست ہیں۔ پس خوب دوست اور خوب مددگار ہیں ﴿۷۸﴾

تفسیر و معارف

فرمایا: یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْـًٔا لَّا یَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ﴿۷۳﴾ اے لوگو! ایک مثال بیان فرمائی جاتی ہے پس اس کو غور سے سنو کہ بے شک جن لوگوں کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی ہرگز پیدا نہیں کر سکتے (اور) گو سب کے سب اس کام کے لیے کیوں نہ جمع ہو جائیں اور (ایسے عاجز ہیں کہ) اگر ان سے مکھی کوئی چیز چھین لے جائے تو وہ اس کو اس سے چھڑا نہیں سکتے۔ طالب اور مطلوب (عابد و معبود) دونوں گئے گزرے ہیں۔

اگر تم بتوں کی پوجا کرتے ہو، جنات کی پوجا کرتے ہو پتھروں اور درختوں کی پوجا کرتے ہو تو اگر یہ

تمام معبودانِ باطلہ جمع ہو جائیں تو یہ مل کر ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ ایک مکھی کتنی حقیر سی مخلوق ہے اُسے بھی اللہ ہی پیدا فرماتا ہے، کوئی بندہ کوئی بت یا کوئی اور مخلوق ایک مکھی بھی نہیں بنا سکتا۔ میاں محمد بخش صاحب اس بات کو یوں منظوم کرتے ہیں:

جے اک مچھر دا پَر بجھے سارا ای عالم لگے
فر نئیں اوہ ثابت ہوندا کیوں کر آہا اگے

میاں محمد صاحب فرماتے ہیں کہ ایک مچھر کا پَر ٹوٹ جائے اور ساری کائنات کے سارے ماہرین انجینئر اور تکنیکی ماہرین اس کی مرمت پر لگ جائیں تو بھی ویسا نہیں بنتا جیسا اللہ نے بنایا ہے۔ گھاس کا ایک تنکا، ایک پتا کوئی مصنوعی بھی بنا لے تو اللہ کے بنائے ہوئے تنکے اور پتے جیسا نہیں بنا سکتا۔ پھر انسان یا کسی دوسرے مخلوق جو خود محتاج ہے کی پوجا کرنے سے کیا ہوگا؟ اُس ہستی کی عبادت کیوں نہ کی جائے جو سب کا خالق ہے اُسے چھوڑ کر مخلوق کی پوجا کہاں کی عقلمندی ہے؟ ۔۔۔ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ۝ اور (ایسے عاجز ہیں کہ) اگر ان سے مکھی کوئی چیز چھین لے جاتے تو وہ اس کو تو اس سے چھڑا نہیں سکتے۔ طالب اور مطلوب (عابد اور معبود) دونوں گئے گزرے ہیں۔

بتوں کے سامنے لوگ چڑھاوے کے طور پر کھانے کی چیزیں رکھ دیتے اور پوجا پاٹ کر کے پھر خود اس کھانے کو تبرک سمجھ کر کھاتے تھے۔ فرمایا، اس کھانے پر جو مکھیاں آ جاتی ہیں وہ اس میں سے اپنا حصّہ لے جاتی ہیں لیکن تمہارے بت تو اُن مکھیوں کو بھی منع نہیں کر سکتے کہ ہمارے سامنے رکھے کھانے سے مت لو نہ ہی یہ بت مکھی سے کچھ واپس چھین سکتے ہیں۔ جب اُن کا اقتدار و اختیار ایک مکھی پر نہیں چلتا تو تم ان کی پوجا کس امید پر کرتے ہو؟ ایسے بے بس تمہارے معبود کیسے بن گئے؟ اگر کسی انسان کی پوجا کرتے ہو تو وہ انسان بھی اتنا ہی محتاج ہے کہ اگر اُس کے چہرے پر مکھی بیٹھے تو پکڑ بھی نہیں سکتا، زور لگائے تو اُڑ جاتی ہے۔ تھپڑ مارے تو اپنے ہی منہ پر پڑتا ہے جبکہ مکھی اُڑ جاتی ہے۔ ان بتوں سے کہو کہ اس مکھی سے ذرا وہ واپس لے کر دکھائیں جو وہ اُن کے سامنے رکھے چڑھاوں سے لے اڑی لیکن یہ کر نہیں سکتے۔ فرمایا: ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ۝ کیسے کمزور تمہارے بت ہیں اور تم بتوں سے بھی گئے گزرے ہو جو اُن کے سامنے سجدے کرتے ہو۔ وہ تو پتھر کے بت تھے جو تھے ہی کمزور، تم انسان ہو کر شرفِ انسانیت سے اتنے گر گئے کہ بت پرستی پر لگ گئے۔ جیسا کمزور چاہنے والا تھا ویسا ہی کمزور اس کا وہ بُت تھا۔ دونوں کی کوئی حیثیت، کوئی حقیقت نہیں تھی۔

غیر اللہ کی پوجا کیوں کی جاتی ہے؟

ایسی بے وقعت چیزوں کی پوجا کیوں کی جاتی ہے، ایسا کیوں ہوتا ہے، اصل بات کیا ہے؟ فرمایا: مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ۔۔۔ان لوگوں نے اللہ کی قدر نہیں کی جیسا کہ اس کا حق تھا۔ان لوگوں نے عظمتِ الٰہی کو پہچانا ہی نہیں اور جس شان اور تعظیم کا مستحق تھا، جو عظمت اس کی شان کے لائق تھی یہ اللہ کو وہ عظمت نہیں دے سکے۔

انسانیت کیا ہے، انسان اشرف المخلوقات کیوں ہے؟ انسان اس لیے اشرف المخلوقات ہے کہ اسے استعدادِ معرفتِ الٰہی دی گئی ہے اور یہ استعداد صرف انسان کو عطا ہوئی ہے۔فرشتہ نوری مخلوق ہے اور اللہ کریم نے فرشتوں کو نور سے پیدا فرمایا ہے۔فرشتہ جب سے پیدا ہوا ہے اور جب تک رہے گا ہمیشہ اطاعت کرے گا۔قرآن میں ارشاد ہوتا ہے: لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ (التحریم:6) فرشتے کبھی اللہ کریم کی نافرمانی نہیں کرتے جو حکم ملتا ہے، وہی کرتے ہیں۔جس کام پر اللہ کریم نے لگا دیا ہے وہی کام کرتے چلے جاتے ہیں۔فرشتے کے پاس گناہ کا تصور بھی نہیں ہے نہ بیوی بچوں کا جھنجھٹ ہے نہ کھانے پینے سونے جاگنے کی تکلیف ہے۔ یہ فرشتے جب سے بنے ہیں قائم ہیں اور جب دنیا فنا ہوگی تو فرشتے بھی فنا ہوں گے۔ ربّ جانے اُن کی عمریں کتنی ہیں تو اتنی لمبی اطاعت کے باوجود قرآنِ کریم فرشتوں کی زبانی اُن کا حال سناتا ہے: وَمَا مِنَّاۤ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ (الصّٰفّٰت:164) ہم میں سے ہر ایک کا مقام مقرر ہے، ہم وہیں رہتے ہیں اس مقام سے ترقی نہیں کرتے آگے نہیں جاتے نہ اس سے نیچے جاتے ہیں۔اتنی ہزار ہا برس کی عبادت لیکن مقام وہیں کا وہیں۔اس لیے کہ فرشتوں کو معرفتِ الٰہی کی استعداد ہی نہیں دی گئی۔فرشتہ حاکم کا مطیع ہے، حکم کا تابع ہے حاکم کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ صرف انسان کو یہ استعداد دی گئی کہ یہ حاکم کی طرف آنکھ اٹھاتا ہے اللہ کو پہچانتا ہے۔انسان کو یہ معرفتِ الٰہی عطا کر کے اس کے ساتھ نفس کی ضرورتیں لگائی گئیں اور یہ سارے بندھنوں کو توڑ کر اطاعتِ الٰہی کی طرف جب جاتا ہے تو وہ صرف اسی معرفتِ الٰہی کے ذریعے جاتا ہے۔ وہ اللہ کو پہچانتا ہے جانتا ہے لہٰذا ساری رکاوٹیں عبور کر کے اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔ جو لوگ اللہ کی عظمت کو ہی نہیں جانتے جو اللہ کی پہچان نہیں رکھتے وہ ان بندھنوں کو توڑ نہیں سکتے اور غیر اللہ کی مدد چاہتے ہیں۔ان لوگوں کا اصل مرض یہ ہے کہ انہوں نے اللہ کی عظمت کی قدر نہ کی، اُسے نہیں پہچانا اور یوں شرفِ انسانیت سے محروم ہو گئے۔

اللہ کی عظمت کسی کے ماننے کی محتاج نہیں:

کسی کے جاننے یا نہ جاننے سے اللہ کی عظمت اور اس کی شان میں کوئی فرق نہیں پڑتا اس لیے کہ: اِنَّ اللّٰهَ

لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ﴿٧٤﴾ بے شک اللہ بڑے زبردست (اور) غالب ہیں۔اس کی شان بہت بلند ہے۔ ماننے یا نا ماننے کا اثر، جاننے یا نا جاننے کا اثر خود انسان پر لوٹتا ہے۔ عظمتِ الٰہی پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ساری دنیا اگر کفر پر اتر آئے تو پھر بھی وہ واحد ہے لاشریک ہے۔ساری دنیا ولی اللہ ہو جائے تو اس کی شان میں کوئی فرق نہیں آتا نہ بڑھ جاتی ہے، نہ انکار سے گھٹ جاتی ہے۔اُس کی شان اُس کی شان کے مطابق ہے۔انسانوں کا کردار اُس کی ذات کو متاثر نہیں کرتا، پلٹ کر خود انسانوں پر آتا ہے۔

اللہ کریم کسی کے مشورے کے محتاج نہیں:

قرآن کریم میں جن انبیاؑ کا ذکرِ خیر ملتا ہے اُن کے ساتھ پیش آنے والے حالات میں یہ بات اکثر و بیشتر ملتی ہے کہ کفار نے اُن پر اعتراض کیے۔کسی نے کہا یہ تو ہمارے جیسے آدمی ہیں ہمارے ساتھ بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں پھر یہ رسولؑ کیسے ہو سکتے ہیں؟ کسی کو یہ اعتراض ہوتا ہے کہ رسولؑ کو تو کسی قبیلے کا سردار ہونا چاہیے۔کسی امیر آدمی کو ہی رسولؑ بنایا جانا چاہیے تھا تو یہ کیسے رسولؑ بن گئے؟

فرمایا: اَللّٰهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿٧٥﴾ اللہ فرشتوں میں سے پیغام پہنچانے والے چن لیتے ہیں اور انسانوں میں سے بھی۔بے شک اللہ سننے والے جاننے والے ہیں۔

اللہ کریم اپنا پیغام پہنچانے کے لیے جسے چاہتے ہیں سرفراز فرما دیتے ہیں اور اس معاملے میں وہ کسی کے مشورے کے محتاج نہیں ہیں۔یہ اللہ کریم کے اپنے فیصلے ہیں۔فرشتوں میں بھی جسے چاہا اُسے چن لیا، جیسے جبرائیل امینؑ کو وحی کا امین بنا دیا تو اس پر کوئی فرشتہ دم نہیں مار سکتا کہ اسے کیوں اپنا قاصد بنایا یا وحی لے جانے والا بنایا؟ اسی طرح اولادِ آدمؑ میں سے اپنے بندوں کو چُن لیتے ہیں، اپنی مرضی سے اپنا رسولؑ اور نبیؑ مبعوث فرماتے ہیں۔نبیؑ اور رسولؑ میں کیا خوبیاں ہونی چاہیں، کیسی استعداد کا حامل ہونا چاہیے اُسے کیسا بندہ ہونا چاہیے؟ یہ اللہ ہی بہتر جانتے ہیں اس لیے کہ: اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ﴿٧٥﴾ یقیناً اللہ ہر بات جاننے والے، سننے والے اور ہر شئے دیکھنے والے ہیں۔جس طرح سے اللہ کریم جانتے ہیں مخلوق اس طرح سے کسی بات کو نہیں جان سکتی۔لوگ اپنی رائے سے منتخب کرنا چاہتے ہیں لیکن انسانوں کی رائے کی کیا حیثیت ہے۔آج ہو سکتا ہے کسی کو وہ نیک سمجھیں ہو سکتا ہے وہ نیک نہ ہو اور یہ رائے بدل جائے۔اسی طرح کسی آدمی کو یہ نیک نہ سمجھیں لیکن عنداللہ وہ بہت نیک اور خوبیوں کا حامل ہو۔لوگوں کی رائے محض رائے ہوتی ہے جبکہ حقائق کا انہیں علم بھی نہیں ہوتا اور یہ رائے وہ اپنی پسند ناپسند، خوشی ناخوشی پر قائم کرتے ہیں۔جس سے خوش ہوتے ہیں اُسے بڑا نیک سمجھتے ہیں جس سے ناخوش ہوتے ہیں اُسے ناپسند کرتے ہیں۔یہ کوئی معیار نہیں

ہے۔ اللہ کا میعار حقائق پر مبنی ہے اور اللہ اپنے ان برگزیدہ اور منتخب بندوں کو نبیؐ مبعوث فرماتا ہے جنہیں ازل سے منتخب کر لیا ہوتا ہے۔ نبیؐ پیدا ہی نبیؐ ہوتا ہے گو مبعوث بعد میں ہو لیکن نبیؐ ازل سے نبیؐ ہوتا ہے۔ انبیاؑ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت کا جو عہد لیا گیا وہ ازل سے لیا گیا۔ نبیؐ ازل سے نبیؐ ہیں دنیا میں نبیؐ مبعوث ہوتے ہیں، برزخ میں نبیؐ ہیں، قیامت میں نبیؐ، نبیؐ ہوں گے۔ ان کی عظمت ہوگی اور جنت میں نبیؐ، نبیؐ ہوں گے اور ان کی اپنی عظمت ہوگی۔ اس میں اللہ کریم کو کسی کے مشورے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ کسے نبیؐ منتخب فرماتا ہے۔ اللہ کریم تخلیقی طور پر نبیؐ کو وہ استعداد عطا فرماتے ہیں اور وہ تمام کمالات جو نبوت کے لیے ضروری ہیں اس میں رکھ دیتے ہیں۔ اس لیے کہ اللہ سب کچھ دیکھتے سنتے ہیں۔ ہر بات سے آگاہ ہیں۔ انسان بھلا کیا مشورہ دے گا جو خود اپنے آپ سے بھی آگاہ نہیں ہے۔ انسان کو تو یہ علم نہیں ہے کہ جو چیز وہ بڑی لذیذ سمجھ کر کھا رہا ہے، بڑی مفید سمجھ کر کھا رہا ہے اس سے بیمار ہو سکتا ہے۔ ذرا سی تکلیف ہو جائے تو کسی معالج کے مشورے کا محتاج ہے اس سے علاج کروانے کا محتاج ہے۔ جو اپنی ذات کے بارے نہیں جانتا، اپنی خبر نہیں رکھتا وہ کیسے یہ جرأت کرسکتا ہے کہ یہ مشورہ دے کہ فلاں نبیؐ ہونا چاہیے یا نہیں۔ اس میں کسی کے دم مارنے کی گنجائش نہیں۔

اللہ کا علم حضوری ہے:

اللہ کریم کا علم حضوری ہے، اس میں ماضی اور مستقبل نہیں ہے۔ فرمایا: **يَعۡلَمُ مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ**۔۔۔ جو کچھ ان (فرشتوں اور انسانوں) کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے، سب جانتے ہیں۔

اللہ کریم کا علم ایسا ہے کہ جو گزر چکا ہے وہ بھی اس کے سامنے حاضر ہے، جو آئندہ ہونا ہے وہ بھی اس کے روبرو حاضر ہے۔ ہر چیز جو ازل سے آج تک ہو چکی اور جو آج سے ابد تک ہوگی اس کی بارگاہ میں حاضر ہے کہ اس کا علم حضوری ہے۔ بھلا ماضی کی حقیقتوں سے لوگ کیا واقف ہو سکتے ہیں۔ اگر آج ہمیں تاریخی طور پر کسی کی خبر ملتی بھی ہے تو وہ نہایت سرسری سی ملتی ہے۔ مثلاً فلاں نام کا ایک بادشاہ تھا، اس کے وزیر تھے اور رعیت اس سے بڑی خوش تھی۔ اب کیا ہم اس کی رعیت کے ایک ایک فرد کو اور اس کی کیفیت کو جانتے ہیں؟ یہ بھی کسی مؤرخ کی رائے ہے کہ رعیت خوش تھی ہم تو ذاتی طور پر واقف نہیں کہ وہ بادشاہ کون تھا کیسا تھا؟ اللہ کریم تو خالق ہیں اس کا ایک ایک ذرّہِ بدن بنایا ہے ایک ایک چیز کی استعداد اس میں رکھی ہے، اس کے سارے کردار سے واقف اور اس کی ساری خوبیوں اور کمزوریوں سے واقف ہے۔ اللہ کریم جو کچھ گزر چکا اُسے بھی خوب جانتا ہے اور جو پیچھے آرہا ہے، جو ابھی گزرنا ہے اُس سب سے بھی واقف ہے۔ انسان تو یہ تک نہیں جانتا کہ اگلے ہی لمحے اُسے بیماری لاحق ہو جائے گی یا کوئی حادثہ درپیش ہوگا یا پھر

اگلا لمحہ موت کا ہوگا، لیکن وہ سب کچھ جانتا ہے۔

تمام امور اللہ کی بارگاہ کی طرف رجوع کرتے ہیں:

فرمایا: وَإِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ۝ اور سب کام اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔ اللہ کی بارگاہ اتنی عالی ہے کہ سب کام اس کی بارگاہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ تمام امور کا فیصلہ اس کی اجازت سے ہوتا ہے۔ انسانی وجود میں چھوٹے چھوٹے سے خلیے (Cell) ہیں اب کون سا سیل کمزور کرنا ہے، کون سا طاقتور کرنا ہے، کس سیل کو جینا ہے کس سیل کو مرنا ہے یہ تمام کام اس کی اجازت اس کے حکم اور عطا سے ہوتے ہیں۔ کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام ہو یا بڑے سے بڑا، تمام امور اس کی بارگاہِ عالی کی طرف رجوع کرتے ہیں یہ لوگوں کا کام نہیں ہے کہ وہ اس کے کیے گئے فیصلوں میں مداخلت کریں۔ اگر کسی کو اس نے چھوٹا قد دیا تو تم کہو کہ اسے لمبا ہونا چاہیے تھا لیکن تم اُسے لمبا کر نہیں سکتے۔ ایسے ہی کسی کو اس نے دراز قد بنایا تم کہتے ہو اسے چھوٹا ہونا چاہیے تھا۔ تم صرف کہہ سکتے ہو، اسے چھوٹا کر نہیں کر سکتے۔ اسی طرح اگر کسی کی شکل تمہیں پسند نہ آئے تو تم اس کی بنائی ہوئی شکل تبدیل نہیں کر سکتے کہ اپنی پسند کی بنالو بلکہ تم خود اپنی شکل نہیں تبدیل کر سکتے۔ جیسی اللہ نے بنا دی ویسی ہی رہے گی چنانچہ یہ سمجھ لو کہ تمام فیصلے اس کی بارگاہِ عالی میں ہوتے ہیں تو جو کام اس قادرِ مطلق کے ہیں اُن میں مداخلت کی کوشش نہ کرو بلکہ تم اپنے کرنے کا کام کرو۔

کرنے کے کام:

فرمایا: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ اے ایمان والو! رکوع کیا کرو اور سجدہ کیا کرو اور اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہو اور نیک کام کرو تاکہ تم کامیابی حاصل کرو۔ ایمان اللہ کریم کی عطا ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان لانے والا بندہ اپنی حقیقی ضرورتوں سے آگاہ ہو رہا ہے۔ انسان کی زندگی کی ضرورتیں صرف کھانا، لباس، گھر ہی نہیں ہے کہ وہ زندگی میں کھائے پیے اور مر کر گزر جائے بلکہ یہ مختصر سا زندگی کا حصہ جو دارِ دنیا میں ملا یہ آخرت کی تعمیر کے لیے ملا تھا۔ دنیا میں جسے اپنی ضرورتوں کا احساس نہ رہے اُسے پاگل کہا جاتا ہے۔ اُسے لباس پہننے کا ہوش ہوتا ہے نہ کھانے پینے کا نہ ہی صفائی وغیرہ کا۔ جن لوگوں کو اللہ کی عطا سے ایمان نصیب ہوا ہے گویا اُسے احساسِ ضرورت عطا ہوا ہے اور یہ سمجھ آ رہی ہے کہ اس مختصر سی زندگی سے اس نے برزخ میدان حشر اور آخرت کی دائمی زندگی کے لیے سارا راشن جمع کرنا ہے۔ برزخ بھی گو صدیوں پر محیط ہو لیکن وہ بھی ایک محدود وقت تھا۔ قیامت کے دن جب لوگوں سے سوال ہوگا کہ دنیا میں کتنا عرصہ

رہے، پھر برزخ میں کتنا لمبا عرصہ گزر گیا؟ تو سب کہہ اٹھیں گے کہ ہم تو دنیا میں ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ہی رہے۔ اس وقت بتایا جائے گا کہ تم نے اسی سال، سو سال دنیا میں گزارے اور برزخ میں ہزاروں صدیاں بیت گئیں اور سب ایک محدود وقت تھا۔ آج انسانیت کو کتنا عرصہ بیت گیا حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے اس کی حتمی تاریخ اللہ کریم نے بتائی ہے نہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اور نہ اللہ کی کتاب نے لہٰذا کوئی نہیں جانتا۔ اندازے ہی لگائے جاتے ہیں کہ انسانی ہڈیاں دو کروڑ سال بعد Fossil بن جاتی ہے۔

آج انسانی ہڈیوں کے Fossil دریافت ہوئے ہیں۔ اللہ کریم نے زمین کے ہر چپے پر مختلف خصوصیات رکھی ہیں وہ مٹی ریت نما سی ہوتی ہے اور ہڈیوں کی تمام تراوت جذب کر لیتی ہے اور یوں ہڈیاں خشک ہو کر پتھر Fossil بن جاتی ہیں۔ یہ Fossil جانوروں کے بھی بن جاتے ہیں اور درختوں کے بھی بن جاتے ہیں۔ انسانی ہڈی دو، ڈھائی کروڑ سالوں کے بعد Fossil بنتی ہے، اس کا مطلب ہے کہ جو Fossil ملے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ کروڑوں سال پہلے زمین پر انسان آباد تھا پھر وہ مرا زمین میں دفن ہوا۔ چنانچہ اگر انسان کو برزخ میں اتنا لمبا عرصہ رہنا ہے اور میدانِ حشر کے بعد ابدالاباد رہنا ہے تو وہاں اس کے لیے لباس، خوراک اور رہائش کا اہتمام کیا ہوگا، کہاں سے لے گا؟ فرمایا، اس سب کا انتظام تمہیں ان چند سالوں میں کرنا ہے جو بلوغت سے لے کر مرنے تک تمہارے پاس ہے۔ جتنی مہلت یہاں ملی ہے، پانچ سال ہیں یا پچاس سال ہیں یا سو سال ہیں اسی مہلت میں ابدی زادِ راہ جمع کرنا ہے جتنا جمع کر سکو۔ یا اللہ! وہ زادِ راہ کہاں سے ملے گا؟ فرمایا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا ۔۔۔ اے ایمان والو! تمہیں سرِ تسلیم خم کرنا ہے رب العالمین کے سامنے اور یہ کام دل کی گہرائی سے کرنا ہے۔ گویا یہ اقرار کرنا ہے یا اللہ! میری کوئی مرضی ہے نہ مشورہ آپ مجھے بتائیں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ صرف جھکنا ہی نہیں بلکہ: وَاسْجُدُوْا ۔۔۔ سجدہ کرو یعنی انتہائی تذلّل کی حالت، اپنے نہ ہونے کا اقرار کرو۔

ماضی میں جب بادشاہتوں کا دور تھا تو شاہی دربار میں آنے والا ہمیشہ جھک کر بادشاہ کو سلام کرتا تھا۔ یہ سلام سیدھے کھڑے ہو کر بھی تو دیا جا سکتا تھا پھر جھکتے کیوں تھے؟ بادشاہ کو جھک کر سلام کرنے سے مراد ہوتی ہے کہ میں آپ کا فرمانبردار ہوں۔ یہ جھکنا اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ جھکنے والا بادشاہ کی بادشاہت کو تسلیم کرتا ہے اس کا اطاعت گزار ہے۔ مومن جب رکوع کرتا ہے تو اقرار کرتا ہے کہ یا اللہ میرا تو اختیار ختم ہو گیا میری رائے اور مرضی ختم ہو گئی اب جس چیز کی آپ اجازت دیں گے میں وہی کروں گا۔ جو کھانے کی اجازت دیں گے وہ میں کھاؤں گا جس سے آپ روک دیں گے، اُس سے رک جاؤں گا۔ جس طرح سے آپ کمانے کی اجازت دیں گے اسی طرح کماؤں گا اور جس سے روک دیں گے وہ طریقہ ہرگز اختیار نہیں کروں گا۔ جیسا لباس پہننے کی اجازت

دیں گے ویسا پہنوں گا اور جس طرح رشتے نبھانے کا حکم دے گا، والدین سے بزرگوں سے بہن بھائیوں، عزیزوں، دوستوں سے، ملک سے اسی طرح نبھاؤں گا۔ جس سے تو روک دے گا رک جاؤں گا۔ فرمایا، تمہارا کام یہ ہے کہ اس تھوڑی سی فرصت میں کمالِ اطاعت اختیار کرلو، سرِ تسلیم خم کردو، اللہ کی بارگاہ میں رکوع کرو۔ اللہ کی بارگاہ میں پھر سجدے کرو۔ سجدے سے مراد ہوتی ہے مطلقاً اپنا اختیار چھوڑ دینا۔ دونوں گھٹنے، دونوں پاؤں، دونوں ہاتھ زمین پر رکھ کر ناک اور پیشانی زمین پر رکھنا کہ میرا جو کچھ تھا وہ آپ کا ہے میرے پاس اب کچھ نہیں ہے۔ فرمایا، اگر تمہیں نورِ ایمان نصیب ہوا ہے تو تمہارا کام یہ ہے۔ یہاں مومنوں سے بات ہو رہی عام آدمیوں سے نہیں اور انہیں حقیقی ضرورتوں کا احساس دلایا جا رہا ہے کہ اے ایمان والو! تم کتنے خوش نصیب ہو کہ تم تک سچی خبر پہنچ گئی ہے۔ تمہیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دے دی ہے کہ برزخ میں کیا ہوگا؟ قیامت ہوگی اس روز کیا ہوگا اور یہ بھی کہ قیامت کے بعد ایک ابدی زندگی ہے۔ تم وہاں کا سامان جمع کرو، اپنا کام کرو۔ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ اگر کسی نے دس دن کے لیے ملک سے باہر جانا ہو تو جانے سے دو دن پہلے تو وہ سامان باندھنے میں مشغول ہو جاتا ہے حتیٰ کہ کسی سے بات بھی کرنے کو تیار نہیں ہوتا کہ کہیں اس کی تیاری میں خلل نہ آئے۔ ایسا نہ ہو کہ آگے پہنچ کر پتا چلے کہ کچھ سامان غلطی سے پیچھے رہ گیا ہے اور وہاں پریشانی کا سبب بن جائے۔ چنانچہ وہ سفر سے پہلے سامان باندھنے (Packing) میں اتنا مگن ہوتا ہے کہ کسی سے بات ہی نہیں کرتا۔ اللہ کریم فرما رہے ہیں کہ (Packing) کرو، کل نزع کے وقت تمہیں ضرورت پیش آئے گی، موت کے بعد قبر میں کیا کرو گے؟ برزخ میں میدانِ حشر میں کس کس چیز کی ضرورت پڑے گی۔ اس ابدی زندگی میں کیا پہنو گے کیا کھاؤ گے کہاں رہو گے؟ اُس کی فکر کرو اور اللہ کے سامنے رکوع کرو اور سجدے کرو۔ اللہ کے سامنے انتہائی عاجزی اور تذلل کرو، **وَاعۡبُدُوۡا رَبَّكُمۡ** ۔۔۔ اللہ کی عبادت کرو، وہ تمہارا ربّ ہے اس نے تمہیں ذرّہِ خاک سے انسان بنایا اور تمہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں داخلے کی توفیق بخشی۔ اس نے تمہیں صحت بخشی۔ اس نے تمہیں زندگی دی، فرصت دی اور بے شمار نعمتیں دیں۔ تمہارے وجود میں دماغ، بصارت، دل اور کتنی ہی نعمتیں عطا کیں لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اس کی عبادت کرو اور یہ بھی یاد رکھو کہ عبادت کرنا تمہاری ضرورت ہے۔ اللہ کو تمہاری عبادت کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ وہ تمہارا ربّ ہے، پروردگار ہے، ہر چیز دینے والا، تم سے اُس نے کچھ نہیں لینا۔ جو عبادت تم کرتے ہے وہ تمہاری ضرورت ہے کہ تمہیں فردائے (کل) قیامت ایک ایک چیز کی ضرورت پڑے گی، اس لیے **وَافۡعَلُوا الۡخَيۡرَ** ۔۔۔ نیکی کرو، بھلے کام کرو۔ سچ بولو، حلال کھاؤ اللہ کی عبادت کرو اور چونکہ عبادت اطاعت کو کہتے ہیں لہٰذا جب تمہاری زندگی اطاعتِ الٰہی میں ڈھل جائے گی تو تمہارا اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، ملنا

بچھڑنا، مزدوری کرنا روزگار کمانا بچے پالنا، سب عبادت بن جاتے ہیں۔ یہ تمام تمہاری آخرت کا سامان بن جاتے ہیں۔ تم دنیا سے بھی لطف اندوز ہوتے رہو اور اسی میں سامانِ آخرت بنتا رہے گا۔ تم یہ روش اپنا لو لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝ تا کہ تم فلاح پا جاؤ۔ اردو میں فلاح کا معنی کامیابی لکھا جاتا ہے اور اس آیہء مبارکہ کے ترجمے میں بھی یہی لکھا ہے کہ 'تا کہ تم کامیابی حاصل کرو' لیکن عربی میں فلاح کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ فلاح سے مراد وہ کامیابی ہے جو ہر حال میں کامیابی ہو۔ زندگی میں کامیابی، موت میں کامیابی، برزخ میں کامیابی، میدانِ حشر میں کامیابی، ابدالاباد میں ہر جگہ کی کامیابی یہی اطاعت کا راستہ ہے جس سے تمام مراحل میں کامیابی نصیب ہوتی ہے۔ فرمایا، اپنے پروردگار کے سامنے رکوع سجود کرو، اس کی عبادت کرو، اطاعت کرو اور بھلے کام کرو تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ جب کامیابی حاصل کر لو گے تو پھر تمہاری کمائی کی نہیں پھر اس کی عطا کو دیکھنا۔ تم نے جو کچھ کیا وہ اپنی حیثیت کے مطابق کیا لیکن وہ جب انعام دے گا تو اپنی شان کے مطابق دے گا۔

اللہ کی راہ میں مجاہدہ کرو:

فرمایا: وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ۔۔۔ اللہ کی راہ میں اس قدر محنت کرو کہ محنت کرنے کا حق ادا ہو جائے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ نماز روزہ عادت بن جائے تو پھر بات بن جاتی ہے۔ یاد رہے نماز روزہ عادت نہیں عبادت ہے اور ہر نماز کا اہتمام کرنا پڑتا ہے، یہ عادت نہیں بنتی۔ اگر عادت بن گئی تو پھر عبادت نہیں رہے گی۔ عبادت تب تک ہی ہے جب آپ اس کو ادا کرنے کے لیے جدوجہد کر رہے ہوں، خود کو بیدار کرتے ہیں، رات کو اٹھتے ہیں اور دن بھر کی مصروفیات میں سے اپنے کام کاج روک کر اس کا اہتمام کرتے ہیں۔ عبادت کے لیے یہ محنت اور کوشش کرنی پڑتی ہے۔ فرمایا، اللہ کی راہ میں ایسا جہاد کرو کہ محنت کرنے کا حق ادا ہو جائے۔

چند دن پہلے ایک کتاب پڑھنے کا اتفاق ہوا جس میں ایک صاحبِ حال، صاحبِ کشف بزرگ نے اپنے مشاہدات لکھے ہوئے ہیں۔ ایک واقعہ لکھتے ہیں کہ ایک روز وہ اثنائے سفر تھے، پیدل جا رہے تھے راستے میں قبرستان کے قریب سے گزر ہوا اور عموماً قبرستانوں میں درخت ہوتے ہیں تو وہاں چھاؤں تھی چنانچہ لکھتے ہیں کہ میں نے سوچا کیوں نہ یہاں تھوڑی دیر سستا لیا جائے۔ پھر کہتے ہیں کہ میں نے سوچا جب بیٹھنا ہی ہے تو کیوں نہ دو نفل ادا کر لوں پھر ذرا لیٹ جاؤں گا۔ چنانچہ میں نے دو نفل ادا کیے اور ذرا آرام کرنے کے لیے آنکھیں بند کیں تو مجھے صاحبِ قبر نظر آئے اور وہ بہت حسرت سے کہہ رہے تھے کہ یہ جو دو رکعت تم نے پڑھی ہیں، کاش ہمیں اب اس کی فرصت مل جائے تو دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے اس سب سے زیادہ یہ دو رکعت قیمتی ہیں

لیکن ہم تو اب یہاں آ چکے ہیں اور ہمیں یہاں آ کر یہ ادراک ہوا ہے۔ جن صاحبِ حال کا یہ مشاہدہ ہے ذرا اُن کی کیفیت دیکھیں کہ انہیں کتنی شدت سے احساسِ ضرورت ہے کہ کہیں ستانا بھی ہے تو پہلے دو نفل پڑھ لیے جائیں۔ کیسے عجیب لوگ ہوتے ہیں چلتے پھرتے بھی باوضو ہوتے ہیں۔

فرمایا، اللہ کی راہ میں ایسا جہاد کرو کہ محنت کا حق ادا ہو جائے اور اس لیے کہ: هُوَ اجۡتَبٰىكُمۡ ۔۔۔اللہ نے تمہیں برگزیدہ کیا ہے۔ تمہارا مسلمان ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اس نے باقی مخلوق میں سے تمہیں اپنے لیے چن لیا ہے۔ اُس کو تمہاری ضرورت نہیں ہے، اس نے تمہیں اپنے قرب سے نواز دیا ہے، نورِ ایمان عطا کر دیا ہے تمہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستہ کر دیا ہے۔ تم پر اللہ کے احسانات ہیں تو تم محنت کرو کہ اس نے تمہیں اپنے لیے، اپنی رضا کے لیے چُن لیا ہے۔

اسلام دینِ فطرت ہے لہٰذا آسان ہے:

فرمایا: وَمَا جَعَلَ عَلَيۡكُمۡ فِى الدِّيۡنِ مِنۡ حَرَجٍ ۔۔۔تم پر دین (کی کسی بات) میں تنگی نہیں فرمائی۔ اللہ کریم نے دین کے معاملے میں بندوں پر کچھ مشکل نہیں ڈالی۔ انسان کی ضرورت ہے کہ وہ روزی کمائے، اللہ نے کمانے سے نہیں روکا لیکن کہا کہ جائز طریقے سے کماؤ تو تمہارا کمانا بھی عبادت ہوگی۔ انسان کی ضرورت ہے کھانا پینا تو فرمایا کھاؤ پیو لیکن حلال اور پاکیزہ کھاؤ، حرام اور ناپاک کے قریب مت جاؤ، ہرگز نہ کھاؤ۔ انسانی مزاج سے سوال کیا جائے کہ اس کو کیا پسند ہے، کیا اُسے حلال پسند ہے، پاک پسند ہے یا ناپاک؟ اگر ایک مٹکا دودھ کا پڑا ہو، اس میں اگر ناپاکی کا ایک قطرہ ڈال دیا جائے اور پھر کسی انسان سے کہا جائے کہ اسے پیے تو وہ کراہت محسوس کرتا ہے اور پینا پسند نہیں کرتا حالانکہ ایک قطرے کی کیا حیثیت ہے۔ انسانی مزاج اگر درست ہو تو وہ حلال، پاکیزہ صاف ستھری چیزوں کو چاہتا ہے اللہ کریم نے وہی اس کا دین بنا دیا۔ انسانی مزاج نیک صالح اولاد، نیک صالح دوست نیک صالح مجلس چاہتا ہے اور اللہ نے تم پر یہ احسان کیا ہے کہ دین میں کوئی مشکل بات ہی نہیں رکھی بلکہ انسانی ضرورتوں کو ہی دین بنا دیا ہے بشرطیکہ تم اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق کرو۔ اطاعتِ الٰہی اختیار کر لو تمہارا سونا بھی دین ہے، جاگنا بھی دین ہے، بات کرنا بھی دین ہے، خاموشی بھی دین ہے۔ زندگی کے سارے کام کرو، شادیاں کرو، گھر بناؤ بچے پالو، سواریاں رکھو دولت کماؤ لیکن حلال رکھو دوسروں کا حق چھین کر نہیں۔ اپنے حق سے ہر سہولت حاصل کرو اور اسی پر آخرت کا انعام بھی ملے گا یعنی وہی توشہ ءآخرت بھی ہے۔ اس سے زیادہ بھی کوئی آسانی ہوگی کہ زندگی اچھے صالح انداز سے گزارو اور اسی پر آخرت کی تعمیر بھی ہو جائے گی۔

اللہ کریم کا احسان:

اللہ کریم نے تم پر احسان کیا کہ تمہارے لیے دین میں مشکل نہیں رکھی اور پھر تمہیں ایسی قوم بنایا کہ مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرٰهِيمَ ۔۔۔اپنے والد ابراہیم (علیہ السلام) کی قوم ہو۔ نبیؐ اُمّت کا والد ہوتا ہے اور ازواجِ مطہرات ساری اُمّت کی مائیں ہوتی ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے دادا ہیں تو اس واسطے سے ساری اُمّت کے باپ ہیں اور فرمایا: کامِلَّةَ أَبِيكُمْ ۔۔۔تمہارے باپ کا طریقہ یہ تھا کہ جب انہیں حکم ہوا تو انہوں نے عزیز ترین چیز بھی قربان کر دی، گھر چھوڑ دیا، جہاں حکم ہوا وہاں چلے گئے اور ابراہیم علیہ السلام ہی نے تمہارا نام 'مسلمان' رکھا تھا جو اللہ کو قبول ہوگیا۔ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۔۔۔اس (اللہ) نے تمہارا لقب مسلمان رکھا۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہی دعا تھی: رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۔۔۔(البقرہ:128) اے ہمارے پروردگار! ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنائیے اور ہماری اولاد میں ایسی جماعت بنائیے جو آپ کی فرمانبردار ہو۔ ایسی قوم پیدا فرمائیے جو مسلمان ہو یعنی ماننے والے، تسلیم کرنے والے ہوں۔ ابراہیم علیہ السلام نے تمہارا نام مسلمان رکھا تھا اور ہم نے تمہیں وہی لقب عطا کیا: مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا ۔۔۔اس سے پہلے (پہلی کتابوں میں) بھی اور اس (قرآن) میں بھی وہی نام رکھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی گواہی:

فرمایا: لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ ۔۔۔تاکہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلّم) تم پر گواہ ہوں۔

اللہ کریم فرماتے ہیں کہ تمہاری مسلمانی تب ثابت ہوگی جب میدانِ حشر میں میرا رسول صلی اللہ علیہ وسلّم تم پر گواہی دیں کہ یہ بندہ میرا اُمّتی ہے۔ مسلمانی تمہارے کہنے سے نہیں بلکہ میرے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی گواہی سے ثابت ہوگی۔ جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم فرمائیں گے کہ یہ بندہ میرا غلام ہے تو میں مانوں گا کہ یہ بندہ مسلمان ہے۔

اُمّتِ محمدی (صلی اللہ علیہ وسلّم) کی شان:

میدانِ حشر میں اُمّتیں پیش ہوں گی اور انبیاؑ بھی پیش ہوں گے۔ دنیا میں کتنی اُمّتوں نے اپنے نبیوں کی نافرمانی کی اور تباہ ہوگئیں۔ کوئی غرقِ آب ہوا، کوئی ویسے تباہ ہوئیں کچھ کفر پر مرگئیں تو میدانِ حشر میں بڑا تماشا بن جائے گا کہ وہ اُمّتیں کہیں گی کہ یا اللہ ہم بے قصور ہیں ہمیں تو آپ کے نبیوںؑ نے بتایا ہی نہیں۔ آپ کے رسولؑ نے ہم

تک آپ کا پیغام ہی صحیح طرح سے نہیں پہنچایا۔ جب میدانِ حشر میں کافر انبیاؑ پر یہ الزام لگائیں گے تو اللہ کریم مسلمانوں کو بطور گواہ بلائیں گے فرمایا: وَتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ۔۔۔اور تم لوگوں پر گواہ رہو۔

مسلمان جن کی مسلمانی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم سے ثابت ہوگی انہیں اللہ کریم یہ اعزاز بخشیں گے کہ اُن سے اپنے انبیاؑ کے حق میں گواہی طلب کریں گے۔ مسلمان عرض کریں گے کہ یا اللہ یہ کافر جھوٹ بولتے ہیں۔ ہمیں تیرے رسول (صلی اللہ علیہ وسلّم) نے، تیری کتاب نے بتایا تھا کہ ہر نبیؑ نے اپنی تبلیغ کا حق ادا کیا۔ یہ کافر جھوٹ بول رہے ہیں۔ تو اے مسلمانو! یاد رکھو تمہاری شہادت پر تم سے پہلے گزرنے والی اُمتوں کے فیصلے ہوں گے۔ اللہ نے تمہیں کن عظمتوں پر بٹھا دیا ہے! پہلے ہی تم پر کتنے احسان کیے تھے پھر تم پر کتنا عظیم احسان کیا کہ تمہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا اُمتی بنایا۔ اس بندے کی کیا شان ہوگی جسے میدانِ حشر میں اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلّم اپنا لے اور فرمائے کہ 'یہ میرا اُمتی ہے' ایسے بندے کو اور کیا چاہیے! امت کی شان یہ ہوگی کہ سابق انبیاؑ کو اس کی گواہی چاہیے ہوگی جب اُن کی اُمتیں اُن پر الزام تراشی کریں گی۔ اُمت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم گواہی دے گی کہ یا اللہ! ہم اس بات کے گواہ ہیں کہ تیرے ہر نبیؑ نے اپنی اپنی اُمت تک تیرا پیغام پہنچانے کا حق ادا کر دیا۔ ہم اس لیے گواہ ہیں کہ تیرے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم جو اصدق الصادقین ہیں انہوں نے ہمیں بتایا، تیرے قرآن نے بتایا لہٰذا ہم ان پیغمبروںؑ کے حق میں گواہ ہیں۔

اس نعمت کا حق کیسے ادا ہو؟

فرمایا: فَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ۔۔۔پس نماز ادا کرو اور زکوٰۃ دو، یعنی مسلمان کو اس کی ضرورت کا احساس دلایا جارہا ہے۔ بتایا جارہا ہے کہ تمہاری ضرورت یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور اس کے دیے ہوئے مال میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ زکوٰۃ فرض ہے اُسے ہر حال میں ادا کرو۔ اس کے علاوہ صدقہ جو نفلی ہے وہ بھی خرچ کرو اور اللہ کی عطا کردہ دولت سے دوسروں کا بھلا بھی کرو، دوسروں کے کام آؤ۔

فرمایا، ایک اور بات بھی سن لو: وَاعْتَصِمُوا بِاللّٰهِ۔۔۔اللہ (کے دین کی رسی) کو مضبوطی سے پکڑے رہو۔ اللہ سے چمٹے رہو کسی لمحے اللہ سے دور ہونے کا مت سوچنا، اللہ کو بھلانے کا مت سوچنا، اللہ سے چمٹے رہو۔ استاذی المکرم حضرت مولانا اللہ یار خانؒ فرمایا کرتے تھے کہ سورۃ الفاتحہ سارے قرآن کا خلاصہ ہے۔ تیس پاروں میں جتنی حکایت بیان ہوئی اس سارے کا خلاصہ سورۃ الفاتحہ میں موجود ہے۔ سورۃ الفاتحہ کا خلاصہ اس کی پہلی آیت بسم اللہ الرحمن الرحیم میں موجود ہے۔ بسم اللہ کا خلاصہ اس کی 'ب' میں موجود ہے کہ یہ 'ب' تلبس کی ب ہے، یہ جوڑ دیتی ہے۔

سارے دین کا حاصل یہ ہے کہ بندہ اللہ کی ذات سے جڑا رہے، کبھی دور نہ ہو۔ فرمایا وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰہِ۔۔۔ اللہ سے پیوستہ رہو، اللہ سے دور ہونے کا نہ سوچو۔ جھوٹ بولو گے اللہ سے دور ہو جاؤ گے، حرام کھاؤ گے ناپاک کھاؤ گے اللہ سے دور ہو جاؤ گے، کسی کی حق تلفی کرو گے اللہ سے دور ہو جاؤ گے۔ اگر یہ سوچ لیا جائے تو یہ احساس ہر موقع پر کام آئے گا۔ فرمایا سارا دین یہ ہے کہ ہمہ وقت، ہر حال میں اللہ کے ساتھ رہو۔

بہترین دوست اور مددگار:

فرمایا: هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿۷۸﴾ وہی تمہارے دوست ہیں پس خوب دوست اور خوب مددگار ہیں۔ وہی اللہ تمہارا ربّ ہے، وہی تمہارا نگہبان ہے تمہاری ہر ضرورت کو پورا کرنے والا ہے، وہی تمہارا ساتھی ہے تمہارا دوست ہے۔ وہی تمہارا خالق ہے وہی تمہارا مالک ہے۔ 'مولا' دوست کو بھی کہتے ہیں یہ ولایت سے ہے۔ فرمایا تمہارا حقیقی دوست تو اللہ ہے۔ دوست کسے کہتے ہیں؟ بہتری چاہنے والے کو دوست کہا جاتا ہے۔ بھلا نقصان پہنچانے والے کو کوئی دوست کہتا ہے؟ ہر گز نہیں۔ فرمایا، تمہاری بہتری چاہنے والا وہی واحد ولاشریک ہے جو تم سے ہر آن واقف ہے، جو تمہاری خوبیوں اور خامیوں سے واقف ہے اور کسی کا محتاج نہیں بلکہ اپنی بارگاہ سے جو چاہے تمہیں عطا کر سکتا ہے۔ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى۔۔۔ اور کیا خوبصورت دوست ہے۔ ولایت دوستی کو کہتے ہیں، فرمایا وہ سارے مسلمانوں کا دوست ہے۔ صرف تسبیح پڑھنے والوں کا یا زیادہ علم رکھنے والوں کا مولانا یا پیر صاحب یا صاحبزادہ صاحب کا نہیں بلکہ تمام مسلمانوں سے فرما رہا ہے: هُوَ مَوْلٰىكُمْ۔۔۔ اللہ تم سب کا دوست ہے۔ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى۔۔۔ اور کیا خوب دوست ہے!

اس کی کوئی مثال نہیں ملتی وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿۷۸﴾ اور سب سے بہتر مددگار ہے ہر حال میں ہر جگہ کام آتا ہے۔